آدھی کہانی
رضیہ بٹ

آدھی کہانی

رضیہ بٹ

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

فہرست

چشم دید گواہ

اس کے آخری سفر کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ گھر لوگوں سے بھرا تھا۔ گلی میں بھی لوگوں کا ہجوم تھا۔ عورتیں مرد بچے بوڑھے ٹوٹ پڑے تھے۔ ظہیر کی آخری جھلک دیکھنے کو بے تاب تھے۔ آنکھوں سے سیل اشک رواں تھا۔ ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان اس جواں مرگ کی باتیں ہو رہی تھیں۔

نہانے کے بعد لاش صحن میں رکھ دی گئی تھی۔ اماں میں تو اب رونے کی ہمت بھی نہ تھی۔ آواز بین کر کر کے بیٹھ گئی تھی۔ بال نوچ نوچ کر اور سینہ پیٹ پیٹ کر باؤلی ہو رہی تھی۔ بھابیوں کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ بہنوں کی آہ و فغاں سے آسمان کا سینہ بھی جیسے پھٹا جا رہا تھا۔ بھائی بچوں کی طرح پُھوٹ پُھوٹ کر رو رہے تھے۔ ہمسائے اور گلی محلے کے لوگ تو یوں آہ وزاری کر رہے تھے —— جیسے ظہیر ان کا اپنا ہو —— ظہیر کو کل شام کسی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ لاش پوسٹ مارٹم اور دیگر ضروری کارروائیوں کے بعد رات دو بجے کے قریب گھر آئی تھی۔ اکیس بائیس سالہ کڑیل جوان ایک فولادی گولی کے سامنے بے بس ہو گیا تھا۔ اور اب منوں مٹی تلے ہمیشہ کے لیے روپوش ہونے کو تیار تھا۔ اس کا جوان سرخ خون اب بھی رِس رہا تھا۔ سفید کفن پر کہیں کہیں سرخ نشان واضح تھے۔

ظہیر تو بڑا ہی بے ضرر نوجوان تھا۔ وہ تو سب کا پیارا —— سب کا لاڈلا سب کا دُلارا تھا —— بڑا صالح نوجوان تھا —— بڑا نیک حسن گو اور دکھیاروں کی مدد میں پیش

پیش رہنے والا تھا—— وہ تو دوستوں چھوڑ دشمنوں کا بھی دوست تھا—— پورے محلے اور بازار میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو ظہیر کی کوئی برائی بیان کر سکے۔ کوئی زیادتی بتا سکے۔

اپنے پرائے گھر والوں سے بار بار یہی سوال کر رہے تھے:

"کسی سے دشمنی تھی کیا؟"

سینہ پیٹ پیٹ کر اماں دہائی دے رہی تھی "کسی سے نہیں۔ میرے لال کی کسی سے دشمنی نہیں تھی۔"

بھائی کہہ رہے تھے "وہ تو سب کا سجن تھا——"

بھابیاں کہہ رہی تھیں "ظہیر کسی سے دشمنی کر ہی نہیں سکتا تھا۔"

بہنیں بین کر رہی تھیں "ظہیر کسی کا دشمن نہیں تو ظہیر کا کون دشمن ہو سکتا تھا——"

یہ باتیں صحیح تھیں۔ گھر والے' محلے والے' بازار والے سبھی لوگ ان باتوں کی تائید کر سکتے تھے کون تھا جس کے وہ کام نہ آیا ہو۔ جس کی اس نے امکان بھر مدد نہ کی ہو—— جسے سمجھا بجھا کر راہِ راست نہ دکھائی ہو۔

بڑی بھابی صبیحہ تو اس کی معتقد تھی—— وہ اس گھر میں بس رہی تھی تو یہ ساری کاوشیں ظہیر ہی کی تھیں——

صبیحہ اک غریب لیکن باعزت خاندان کی بیٹی تھی۔ نصیر بھیا نے اسے کسی شادی میں دیکھا تو دل آگیا۔ شکل و صورت کی اچھی سمارٹ سی تھی—— پانچ بہنوں میں تیسرے نمبر پر تھی—— غربت نے مارا تھا۔ ابھی تک صرف دو بہنوں کی شادیاں ہو سکی تھیں۔ وہ بھی معمولی سے گھروں میں—— دونوں زندگی کیا گزار رہی تھیں۔ بس زندگی انہیں گزار رہی تھی—— صبیحہ بی ایڈ کر رہی تھی۔ بہنوں کے حالات دیکھ کر اس نے نوکری کر کے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔

لیکن

نصیر بھیا نے اس من موہنی سی لڑکی کو پسند کر لیا—— وہ پچھلے سال ہی انجینئر بنے تھے—— ہینڈسم بھی تھے۔

ہر ماں کی طرح اماں نے بھی ان کے متعلق اونچے اونچے خواب دیکھ رکھے

تھے۔ بڑے بڑے لوگوں کی لڑکیاں نظر میں تھیں—— وہ تو جب فائنل میں تھے تب ہی اماں نے دو تین لڑکیاں دیکھ لی تھیں—— ایک تو ڈپٹی کمشنر سعد اللہ خان کی بہن تھی۔ دوسری شہر کے مشہور کارخانہ دار اسلم کی صاحبزادی اور تیسری کا تعلق بھی کسی ایسے ہی خاندان سے تھا۔

اور تو اور دونوں بڑی بہنوں نے بھی نصیر بھیا کے لیے خوب سے خوب تر کی تلاش شروع کر دی تھی۔ اپنے اپنے سسرالی خاندانوں اور ان کے ملنے جلنے والوں میں نصیر بھیا کے لیے لڑکی تلاش کرنا شروع کر دی تھی۔

کئی گھروں میں تو وہ اس نیت سے جا بھی چکی تھیں—— لڑکیوں والے بچھ بچھ جاتے تھے خوب آؤ بھگت ہوتی تھی—— اچھے رشتوں کا ملنا نعمت غیر مترقبہ کے مترادف تھا۔ انجینئر لڑکا اچھے خاندان کا ملنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

لیکن واپس آ کر اماں اور بہنیں ان گھرانوں میں کوئی نقص نکالتیں—— لڑکیوں کی شکل و صورت پر اعتراض کرتیں۔

"ہائے ہائے کتنا چھوٹا قد تھا۔"

"اس کی ماں کتنی موٹی تھی—— لڑکی بھی موٹی ہو جائے گی۔ بس گیند ہی بن جائے گی۔"

"وہ لڑکی تو اچھی شکل کی تھی۔ پیسہ بھی بہت ہوگا۔ لیکن طور طریقے—— آئے ہائے چائے کے ساتھ اکٹھی دس بارہ پلیٹیں بھر کر رکھ دیں۔ ہونہہ——"

"اور وہ جو دیکھنے گئے تھے—— سانولی سی لڑکی——"

"اے چھوڑو اسے' دھواں لکڑی لگتی تھی——"

"اور جو اس دن دیکھی تھی۔ قد کاٹھ کی اچھی تھی۔ آواز اچھی نہیں تھی—— پھٹا ڈھول ہو جیسے۔"

یہ پانچ چھ سال پہلے کی باتیں تھیں۔ ظہیر ان دنوں پندرہ سولہ سال ہی کا ہوگا لیکن وہ جب بھی ایسی باتیں سنتا ان لوگوں کو ٹوک دیتا۔

"اماں کیوں دوسرے لوگوں کی غیبت کرتی ہیں آپ——"

"یہ غیبت نہیں ظہیر میاں۔" بہن کہتی۔

"تو اور کیا ہے" ظہیر پوچھتا۔

"رواں تبصرہ ہے" دوسری بہن ہنس دیتی۔

"بری بات ہے باجی۔" وہ معصومیت سے کہتا "کسی کی بیٹی کو گھر بیٹھے اتنی باتیں کرنا کہاں زیب دیتا ہے۔ گناہ ملے گا آپ کو۔ مت کیا کریں ایسی باتیں۔"

"چل چل چپ رہ تو بڑا آیا نصیحتیں کرنے والا۔"

اماں ڈانٹ دیتیں۔ لیکن وہ حق کی بات کہنے میں کبھی نہ چوکتا۔

ان حالات میں جب نصیر بھیا نے اپنا انتخاب صبیحہ کو قرار دیا تو ظاہر ہے گھر میں ہنگامہ ہونا ہی تھا۔

اماں تو ششدر رہ گئیں۔ یوں نصیر کا منہ تکنے لگیں جیسے اس نے کوئی انتہائی نامعقول بات کہہ دی ہو۔

کس کی بات کر رہا ہے۔

"صبیحہ کی"

"کون صبیحہ ___"

"شاید دور سے ہماری رشتہ دار بھی ہیں ___ ممانی عاصمہ اس کی خالہ لگتی ہیں ___"

"وہ ___ وہ ___ رشید کی بیٹی۔ پانچ بیٹیاں ہیں جس کی ___ وہ ڈی سی کے دفتر میں ہیڈ کلرک ہے جو ___ عاصمہ کی سب سے غریب بہن فائزہ کی بیٹی۔"

"جی ہاں۔ آپ نے ٹھیک ٹریس کیا۔"

"تو پاگل ہو گیا ہے کیا۔"

"یہی سمجھ لیں ___ لیکن میں شادی کروں گا تو صبیحہ سے نہیں تو ___"

اماں بھڑک کر بولیں "پھنسالیا ہے اس چاتر لڑکی نے تجھے۔"

"اماں" نصیر چیخا "مت الزام دیں کسی شریف لڑکی کو۔ میں نے اسے سمیع بھائی کی شادی میں دیکھا۔ بس مجھے اچھی لگی۔ وہ ہے بھی اچھی۔ میں اس سے شادی کروں گا اماں۔ نہیں کی ناں تو ساری عمر آپ میرے سہرے کے پھولوں کے ارمان لیے رہیں گی۔"

بہنوں نے سنا تو وہ بھی چہک چہک کر اس غریب خاندان کا مذاق اڑانے لگیں۔

تب بھی ظہیر کو بہت برا لگا۔

"جب بھائی کو پسند ہے تو آپ کیوں مجبور کرتی ہیں انہیں۔ صبیحہ باجی کو میں

نے بھی دیکھا ہے۔ بہت اچھے کردار کی ہیں ___"

"اے چل بڑا آیا وکالت کرنے والا۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش اور لگا ہے زندگی کے اتنے سنجیدہ معاملوں میں دخل دینے۔"

"باجی دخل دینے کی بات نہیں میں تو نصیر بھیا کی پسند کی بات کر رہا ہوں۔ زندگی انہوں نے گزارنی ہے یا آپ نے۔ کیوں ان کی خوشی پوری نہیں ہونے دے رہیں آپ۔"

جواباً یہاں بھی ظہیر کو ڈانٹ ہی پڑی۔ لیکن وہ بھائی کا ساتھ دے ہی گیا۔

اور

بالآخر بہنوں کو نصیر کی ضد کے آگے جھکنا پڑا۔

یہ رشتہ تو انہوں نے مجبور ہو کر کر لیا۔ لیکن دل میں تہیہ کر لیا کہ اس غریب خاندان کی لڑکی کو ٹکنے نہیں دیں گی۔ ناک میں دم کر دیں گی۔ یہ لاشعوری طور پر اپنی من مانی نہ کر سکنے کا انتقام ہو گیا۔

صبیحہ غریب باپ کی بیٹی تھی۔ اماں اور بہنوں کی توقعات سے بھی کم جہیز لائی۔ چند جوڑے' معمولی سا فرنیچر۔ دو تولے سونا بھی نہیں تھا۔ ادھر اماں نے تو بڑے بیٹے کی شادی کی تھی۔ پیسہ تھا' جائیداد تھی' زیور تھا۔ لوگوں کو دکھانے کے لیے بہت اچھی بری لے گئیں۔ پچاس تولے تو سونا ہی تھا۔ صبیحہ کے گھر والے تو بیٹی کے نصیبے پر پھولے نہیں سما رہے تھے۔

صبیحہ دلہن بن کر اس آنگن میں اتریں تو نصیر بھیا کے چہرے پر چاند ستاروں کی چمک دیکھ کر سب سے زیادہ خوشی ظہیر ہی کو ہوئی ___ مومن دل کا بندہ تھا۔ دوسروں کی خوشیاں اس کی خوشیاں تھیں۔

اماں اور بہنوں نے صبیحہ کی جیت کو ہار میں بدلنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ ذہنی طور پر انہوں نے اسے بہو تسلیم ہی نہیں کیا تھا۔ چنانچہ پہلے دن ہی محاذ کھول دیا۔

شادی کا ہنگامہ زوروں پر تھا۔ لوگ دلہن کی شکل و صورت کی تعریفیں کر رہے تھے۔ ظہیر خوش ہو رہا تھا۔ لیکن اماں جہیز کے متعلق جز بز ہو رہی تھیں۔ ___ عورتیں پوچھ رہی تھیں "کیا ملا جہیز میں دکھاؤ تو سہی۔ لڑکی تو ہیرا چن لائیں۔ جہیز سے بھی گھر بھر گیا ہوگا ___"

اماں ہر ایک سے کہہ رہی تھیں "بھئی جلدی میں شادی ہوئی۔ دلہن جہیز تو معمولی لائی ہے پر ابا نے پچاس ہزار نقد دے دیا ہے۔"

صبیحہ نے سنا تو دنگ رہ گئی۔ ظہیر نے بھی اماں سے کہا۔

"آپ کیوں لوگوں سے جھوٹ کہہ رہی ہیں—— بھابی کو اس سے ذہنی تکلیف ہو گی۔ آپ ان کے معمولی جہیز پر پردہ نہیں ڈال رہیں۔ انہیں کمتری کا احساس دلا رہی ہیں۔

واقعی یہ صبیحہ کی کمتری کا احساس دلانے ہی کا طریقہ تھا۔ لیکن اماں نے احسان جتایا "کیا کہوں لوگوں سے یہ تو ڈھنگ کی چار چیزیں بھی نہیں لائی جہیز میں۔ گھر کی عزت تم لوگوں نے تو ڈبونے کی پوری کوشش کر ڈالی۔ اب میں بھی نہ بناؤں عزت——"

اماں نے ساس ہونے کے سارے ہی وار صبیحہ پر کرنے کی ٹھان لی تھی۔ لیکن ہر وار پر ظہیر ہی آڑے آیا۔ وہ اماں کو سمجھاتا۔ حالات سے سمجھوتہ کرنے کی بات کرتا۔ اللہ میاں سے ڈراتا۔ مال و دولت کی اہمیت اپنی جگہ لیکن جب اللہ نے اتنا کچھ دے رکھا ہے تو پھر بھابی کے جہیز پر امیدیں کیوں لگائی ہوئی تھیں۔ صبیحہ ظہیر کی ممنونِ احسان تھی۔ جب بھی وہ گھبرا کر رونے لگتی تو وہ اس کی ڈھارس بندھاتا۔ صبر اور حوصلے سے جینے کی باتیں کرتا۔

اور یہ ظہیر ہی کی نیک سوچوں اور کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ اب وہی صبیحہ گھر کی رانی تھی۔ اماں بھی اس سے راضی بہنیں بھی اس سے شاد۔

دوسری بھابی اسماء کی بربادی بھی اسی کے ہاتھوں آبادی میں تبدیل ہوئی۔ اس کی شادی کو دو سال ہو گئے تھے بچہ بھی نہیں ہوا تھا۔ اماں اپنے لاڈلے بیٹے کی من مانی پر شادی تو کر چکی تھیں۔ لیکن اولاد کی محرومی گوارا نہ تھی۔

اٹھتے بیٹھتے طعنے دیتیں "اس لاکھوں کے جہیز کے ساتھ بانجھ لڑکی تھما دی۔ کیا فائدہ اس کا۔"

وہ بیٹے سے بھی ہمدردی جتاتیں "نذیر دولت دینا کچھ نہیں بچے ہونے چاہئیں۔ سب سے بڑی دولت اولاد ہے۔ میں تیری سونی دنیا نہیں دیکھ سکتی۔"

نذیر کہتا "اماں بچے بھی ہو جائیں گے۔ ابھی شادی کو کون سے دس بیس سال گزر گئے ہیں۔ اسماء کا علاج کروائیں گے خدا دے ہی دے گا۔"

لیکن اماں تو کئی مہینے سے علاج معالجہ کروا کے مایوس ہو چکی تھی۔ ٹونے ٹوٹکے بھی کروا لیے تھے۔ دیسی علاج بھی دیکھ لیے تھے۔ اسماء بے چاری کو جہاں چاہتیں لے جاتیں۔ پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ پھر بھی تعویز گنڈوں کے چکر میں پڑ گئی تھی۔

ظہیر اب تو خاصا سمجھدار تھا—— اسماء بھابی کی پریشانی اس سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ اماں کے کہے میں آ کر اب نذیر بھی تلخ ترش باتیں کرنے لگا تھا۔ ظہیر ہمیشہ ہی بھائی کو سمجھاتا "بھیا اولاد خدا کی دین ہے۔ نہیں ہوئی تو اس میں بھابی کا کیا قصور——"

آپ سے زیادہ تو بھابی کو بچوں کی خواہش ہو گی۔ ان کی ممتا مضطرب ہو گی۔"

اس دن بھی بھیا سے ایسی ہی باتیں کر رہا تھا کہ نذیر نے مسکرا کر کہا "اسماء کی ممتا سکون پا سکتی ہے۔"

"جی"

"میں دوسری شادی کر لوں بچے ہو جائیں گے۔ انہیں اسماء اپنی——"

"بھیا"

کیا حرج ہے بھئی—— اماں نے تو میرے لیے لڑکی بھی ڈھونڈ لی۔"

"حد ہو گئی بھیا۔"

"کیوں"

"اسماء کو آپ کس قصور کی سزا دینا چاہتے ہیں۔"

"اس کے بچے نہیں ہو سکتے۔ آج نہیں تو کل یہ مسئلہ اٹھنا ہی ہے۔"

"ظہیر چپ ہو گیا۔" لیکن پریشان رہا۔

اس کے دوست کی بڑی بھابی گائناکالوجسٹ تھی۔ وہ دوست کی وساطت سے اس سے ملا۔

ڈاکٹر بڑی محبت سے پیش آئیں۔ بولیں آپ اپنے بھائی اور بھابی کو لے آئیے گا۔ میں ان کا مکمل چیک اپ کر لوں گی۔

دوسرے ہی دن اس نے نذیر سے بات کی۔ وہ تو کچھ نیم رضامند ہوا۔ لیکن اسماء جھٹ سے تیار ہو گئی۔ وہ کئی ڈاکٹروں کو دکھا چکی تھی۔ اس میں ماں بننے کی صلاحیت تھی۔

دونوں لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئے۔ واقفیت کے ناطے وہ اچھی طرح ملی۔ اسماء سے کچھ ضروری باتیں پوچھیں۔ اب تک وہ جہاں جہاں بھی دکھا چکی تھیں وہ رپورٹیں دیکھیں۔

پھر اسماء سے کہا "آپ کے میاں کا چیک اَپ ہوا؟"

"نہیں۔ نہیں تو۔۔۔"

"پہلے وہ اپنا چیک اَپ کروائیں۔ رپورٹ مجھے دیں پھر میں آپ کا علاج شروع کروں گی۔"

اس نے نذیر سے بھی کہا "بہتر ہے آپ پہلے اپنا چیک اپ کروالیں۔" دونوں واپس آگئے۔ نذیر کچھ بگڑا بگڑا سا تھا۔

اسماء نے اسے چیک اپ کروانے کے لیے کہا۔ کئی دن کہتی رہی۔ بضد ہوئی اصرار کیا تکرار کی تو اس نے اپنا چیک اَپ کروالیا۔

رپورٹ نفی میں تھی۔ نذیر کے بچے نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ سخت پریشان ہوا۔ لیکن ظہیر نے مسئلے کا حل ڈھونڈ لیا۔

اور پھر اسی نے صبیحہ بھابی کو بھی رضامند کیا کہ وہ اپنا ہونے والا بچہ اسماء کی گود میں ڈال دیں۔ صبیحہ کے تیسرا بچہ ہونے والا تھا۔

یوں اسماء کی گود بھر گئی۔۔۔

دونوں بھابیاں اپنے اپنے طور پر ظہیر ہی کی احسان مند تھیں۔ وہ ان کا لاڈلا دیور تھا۔ بہت دلارا' بڑا پیارا۔ بھائیوں سے بھی زیادہ عزیز تھا۔

اماں کا پیارا تو وہ تھا ہی۔ اسی نے تو اماں کی لعن طعن کرنے کی عادت گنوائی تھی۔ ٹوکتا رہتا تھا۔ سمجھاتا رہتا۔ خوفِ خدا سے ڈراتا رہتا تھا۔ اب اماں تھیں اور اس کا بھرا پرا گھر۔ صبیحہ اور اسماء کو تو وہ بیٹیوں کی طرح چاہتی تھیں۔

یہ تو گھر کے معاملے تھے۔ ظہیر کا رویہ اور وطیرہ محلے والوں سے بھی اتنا مخلص اور ہمدردانہ تھا کہ سب کو لگتا وہ ان کا اپنا ہی ہے۔ وہ امیر غریب کی کبھی تخصیص نہ کرتا۔

دو گھر چھوڑ کر اماں برکتے رہتی تھی۔ خاصی عمر کی تھی۔ ٹوٹا پھوٹا دو کمروں کا گھر تھا۔ جس میں اکیلی رہتی تھی۔ آٹھ بچوں کی ماں تھی۔ پانچ بیٹیاں تھیں تین بیٹے۔ بیٹیاں تو بیاہ کر اپنے جھنجھٹوں میں پڑی تھیں۔ بیٹے بھی خاصے کماتے تھے لیکن بوڑھی ماں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ ہر ماہ تھوڑی سی رقم گزارے کو دے دیتے۔ بہوئیں بھی کبھی کبھار ملنے آجاتیں۔۔۔ لیکن اپنے ساتھ رکھنے پر آمادہ نہ ہوئیں۔ کچھ تو اماں برکتے بھی کڑوی طبیعت کی تھی۔ کچھ وہ اپنا آبائی گھر چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتی۔

ظہیر ایک سعادت مند بیٹے کی طرح اماں برکتے کی خبر گیری کرتا تھا۔ صبح و شام اس کے گھر ضرور جاتا۔

"اماں ٹھیک ہونا۔۔۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔۔۔ چائے بنا دوں۔۔۔ کھانا کھالیا نا۔" وہ احوال پُرسی کرتا۔ اماں برکتے سو سو دعائیں دیتی۔

"ساجھاں وقت پر آجاتی ہے نا۔۔۔ کام وام ٹھیک کر دیتی ہے نا۔ کوئی تکلیف تو نہیں؟"

ظہیر ہی نے اماں کے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے ساجھاں کو راضی کیا تھا۔ وہ محلے کے اور گھروں میں بھی کام کرتی تھی۔ ظہیر نے اسے اماں کے کام کے لیے بھی آمادہ کر لیا تھا۔

اماں کے دل سے دعائیں نکلتیں "بیٹے ساجھاں کی وجہ سے بڑا آرام ہو گیا ہے۔ جگ جگ جیو میرے لعل۔۔۔ کتنا خیال ہے تمہیں میرا۔ تم نہ ہوتے تو جانے کہاں رُل جاتی۔"

"اللہ نہ کرے اماں۔"

"جیتے رہو۔"

ظہیر اماں کی دعائیں سمیٹتا۔۔۔ خوش ہوتا۔ اور اماں کی خدمت کی لگن اور بڑھ جاتی۔ اسی طرح وہ کونے کے مکان والی بیوہ عورت کی مدد اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس کے دونوں بیٹے آوارہ سے ہو گئے تھے۔ ایک نے ساتویں اور دوسرے نے نویں جماعت سے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ ظہیر نے ان دونوں لڑکوں کی نگہداشت کی۔ ان کو سمجھایا۔ راہ راست دکھائی۔ کچھ بن کر دکھانے کی آرزو کا بیج ان کے دل میں بویا۔ یہ اس کی محنت اور خلوص کا نتیجہ ہی تھا کہ بڑے نے دسویں جماعت فسٹ کلاس میں پاس کی اور چھوٹا بھی اچھے نمبر لے کر آگے بڑھا۔ بیوہ عورت جھولیاں پھیلا پھیلا کر اس نیک سیرت لڑکے کو دعائیں دیتی تھی۔

یہ ظہیر کا کردار تھا۔۔۔ صرف غریبوں ہی نہیں امیروں میں بھی ہر دلعزیز تھا۔ محلے کے سرے پر ملک صاحب کی جہازی سائز کوٹھی تھی۔ ان کے بھرے پرے کنبے میں سہیل بھی تھا جو بری صحبت میں پڑ کر نشہ کرنے لگا تھا۔ ظہیر ہی نے اس کی رہنمائی کی۔ اس کی عادت بد چھڑائی۔ ملک صاحب اس کے بے حد احسان مند تھے۔

محلے میں اس کی ذات اپنی صفات کی بنا پر محسن کی سی تھی۔ وہ اہم کام کر چکا تھا۔
ایک جاب بھی دو تین ماہ سے مل گئی تھی۔ لیکن اس میں نخوت و غرور تو تھا ہی نہیں۔ اس
کے امدادی کام جاری و ساری تھے۔ پہلی تنخواہ تو اس نے اماں کی جھولی میں ڈالی تھی۔۔۔
لیکن اب وہ کچھ پیسے اماں سے اپنے خرچ کے لیے بھی لے لیتا تھا۔ اس کا خرچہ تھا ہی کیا۔
پان نہ سگریٹ۔۔۔ ان پیسوں سے وہ چپکے چپکے کسی کی مدد کر دیتا تھا۔۔۔ محلے کے بچوں کو
ٹافیاں خرید کر کھلاتا تھا۔۔۔ بچے ظہیر بھائی پر جان دیتے تھے۔

وہ راست باز تھا۔

حق گو تھا۔

خدا سے ڈرنے والا تھا۔

وہ سب کا اپنا تھا۔ سب کا پیارا تھا۔

اس کی کسی سے دشمنی نہ تھی۔ پرخاش نہیں تھی۔

وہ تو سیدھا سادا سا بے ضرر اور مخلص انسان تھا۔

لیکن

اسے بھی کسی نے گولی مار دی۔

اس پیارے سے انسان کی جان لے لی۔

اسے اپنے پیاروں سے چھین لیا۔

اور

یہ

صرف

اس قصور کی بناء پر

کہ

وہ راست باز تھا

حق گو تھا

اور

خدا سے ڈرتا تھا۔

پچھلے ہی دنوں وہ سامنے والی لائن کے تیسرے مکان میں رہنے والی آپا سعیدہ

کے کہنے پر اس کی بیٹی اور بیٹے کو سٹیشن پر چھوڑنے گیا تھا۔ آپا نے کہا تھا "ظہیر بھائی ٹرین
رات گیارہ بجے چلتی ہے۔ یہاں سے فریدہ اور احمد کراچی جا رہے ہیں۔۔۔ تم انہیں سوار
کرا آؤ۔ تو مجھے تسلی ہو گی۔"

"بالکل آپا۔۔۔ چلا جاؤں گا۔۔۔"

"تمہیں تکلیف تو ہو گی بھیا۔۔۔ لیکن احمد ابھی اتنا سمجھدار نہیں۔ فریدہ بھی
چھوٹی ہے۔ اس لیے چاہتی ہوں حفاظت سے سوار ہو جائیں۔ دادی ماں کے پاس جا رہے
ہیں۔۔۔ بس تم انہیں سوار کرا دینا۔۔۔ ٹکٹ لے لیے ہیں۔ سیٹیں بھی بک ہیں۔۔۔"

ظہیر انہیں سوار کر کے واپس آ رہا تھا کہ پہلی گلی کے موڑ پر ایک سانحہ دیکھا۔
تین آدمی ایک جوان مرد پر چاقوؤں سے وار کر رہے تھے۔

وہ آدمی ظہیر کے دیکھتے ہی دیکھتے زمین پر تیورا کر گرا۔۔۔

ظہیر نہتا تھا۔ چند گز دور بھی تھا۔ سانحہ ایسا دل گداز تھا کہ چند لمحوں کو اس کے
حواس بھی قابو میں نہ رہے۔

جب وہ سنبھلا اور گرنے والے کے قریب پہنچا۔ تو تینوں حملہ آور چاقو لہراتے
ہوئے بھاگ رہے تھے۔

ظہیر نے انہیں دیکھا۔

مرنے والا کون تھا وہ جان نہ پایا۔

لیکن مارنے والوں میں سے دو کو اس نے پہچان لیا۔

وہ بشیر اور غفور تھے۔۔۔ ان کو دیکھتے ہی جلدی سے خون سے لت پت نوجوان پر
جھکا۔ اس کا خیال صحیح تھا۔

نوجوان شمس ہی تھا۔ اس کے محلے کے بہت بڑے اور اونچے خاندان کا چشم و
چراغ۔ اس خاندان کی اور بشیر اور غفور کے خاندان سے دشمنی تھی۔ قریبی رشتہ داری تھی۔
لیکن زمین اور جائیداد کے تنازعے نے ایک دوسرے کے خون کا پیاسا کر دیا تھا۔

ظہیر جلدی سے اٹھا۔

بھاگنے والوں کے پیچھے دوڑا۔

"بشیر۔۔۔ غفور۔۔۔ کیا ظلم کر دیا ہے تم نے۔ بھاگ کر کہاں جاؤ گے۔ میں
نے تمہیں پہچان لیا ہے۔۔۔"

گلی کی نکڑ پر تیزی سے روپوش ہونے سے پہلے غفور نے مڑ کر اسے دیکھا اور بولا ”اچھا تو ظہیر ہے——“

”ہاں میں ظہیر ہوں۔ تمھیں پہچان لیا ہے میں نے۔“

”پہچانا ہے تو آنکھیں بند کرلے۔ ہونٹ سی لے، سمجھا—— تیرا اس معاملے میں کوئی دخل نہیں۔“

گلی کے دوسرے سرے سے دو آدمی آرہے تھے۔ اس لیے بشیر اور غفور مع تیسرے آدمی کے چھپتے چھپاتے بھاگ گئے۔

آنے والوں سے ظہیر نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا:

”قتل ہوگیا—— قتل کر کے وہ لوگ بھاگ گئے۔“

پھر ظہیر نے زور زور سے آوازیں لگائیں ”بھئی قتل ہو گیا ہے محلے میں۔ باہر آؤ۔ دیکھو شمس مارا گیا——“

وہ آدمی آگے بڑھے۔ دو چار دروازے کھلے لوگ باہر آئے۔

ظہیر تھانے بھاگا۔ رپورٹ کی۔

پولیس آگئی۔ لاش کو اٹھا کر تھانے لے جایا گیا۔

جواں سال بیٹے کی موت اہل خانہ کے لیے قیامت کا سماں تھی۔ اک کہرام مچ گیا۔ محلے والے اکٹھے ہوگئے۔

ظہیر اس واقعے کا چشم دید گواہ تھا۔ اس نے من و عن جو دیکھا تھا بیان دے دیا۔ شمس کے گھر والوں کو بھی بتایا۔

”میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ میں ابھی کچھ فاصلے پر ہی تھا کہ شمس تیورا کر گر پڑا۔ میرے قریب پہنچنے تک وہ ظالم اس پر پے درپے چاقوؤں کے کئی وار کر چکے تھے۔ میں نے بھاگنے والوں میں سے دو کو تو پہچان لیا ہے۔ وہ بشیر اور غفور تھے۔“

”تم نے اپنے بیان میں یہی لکھوایا ہے نا۔“ کسی نے پوچھا۔

”ہاں—— میں چشم دید گواہ ہوں—— جو دیکھا وہی بیان لکھوایا——“

”اس بیان سے ہٹو گے تو نہیں۔“

”واہ کیوں ہٹوں گا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے سب کچھ۔ حق کی بات کہوں گا۔ مجھے حق سے کوئی نہیں روک سکتا۔“

بات ظہیر کے گھر والوں نے بھی سنی۔ سب ظہیر کے گرد ہوگئے۔ بھائیوں نے ڈانٹا۔ ”تجھے کیا ضرورت تھی رپورٹ کرنے کی۔“

بھابیوں نے کہا ”بھئی ان کی تو دشمنی ہے آپس میں۔ تم نے کوئی بیان دینا ہی نہیں تھا۔“

اماں تلخی سے بولیں ”ہر ایک کے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کی عادت ہے اس کی۔ خبردار جو اب تو نے اس بارے میں کسی سے کوئی بات کی——“

وہ سب کی باتیں سن کر مسکراتے ہوئے بولا ”ڈرنے کی کیا بات ہے۔ کوئی میں نے قتل کیا ہے؟“

”لوگ اس طرح ہی پھنسا دیتے ہیں بھائی۔“ نصیر نے کہا۔

حد ہوگئی نصیر بھائی—— میں تو اس واقعے کا گواہ ہوں۔ تھانے میں رپورٹ میں نے ہی لکھوائی ہے—— اب کون مجھے قاتل بنا دے گا۔“

”وہی جن کی رپورٹ لکھوائی ہے۔ یہ بھی کر سکتے ہیں۔“

”قانون نہ ہوا مذاق ہوگیا۔“

”تو مانے گا تھوڑا ہی۔“

”بالکل نہیں مانوں گا۔ حق کی بات کہوں گا۔ خدا سے ڈریں بھائی جان۔ قاتلوں کی نشاندہی نہ کرتا تو جانے کتنے بے گناہ لوگ اس قتل کے سلسلے میں گھسیٹ لیے جاتے۔“

سب نے ہی منع کیا۔

اپنوں نے پرائیوں نے

لیکن

راست باز انسان کو اس کی حق گوئی سے کوئی روک نہیں سکا۔

اس نے شمس کے والدین کو یقین دلایا—— ”میں اپنے بیان پر قائم ہوں۔ عدالت میں گواہی دوں گا۔ شمس کے قاتلوں کو دندناتے پھرتے چھوڑنا انصاف پر صریحاً ظلم ہے۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔“

کچھ ایسے ہی زوردار غیر متزلزل الفاظ میں اس نے گواہی دینے کی بات ان لوگوں کے سامنے بھی کی تھی۔ جو کل اسے دھوکے سے ایک غیر مانوس سی جگہ گھیر کر لے گئے تھے۔ اور بہت مجبور کیا کہ وہ گواہی نہ دے۔ بیان بدل لے ”تم اپنے ارادے سے باز آجاؤ۔

تمہیں اس معاملے میں دخل دینے کا حق ہے نہ ضرورت۔۔۔"

"حق بھی ہے اور ضرورت بھی۔۔۔" اس نے مستحکم آواز میں کہا تھا۔

"تم جانتے ہو تمہاری گواہی سے بشیر، غفور اور اصغر پر قتل ثابت ہو جائے گا۔"

"یہی تو ہوگا۔۔۔ ملزموں کو اپنے کیے کی سزا ملنا ہی چاہیے۔"

"تو تم گواہی ضرور دو گے؟"

"بالکل۔۔۔"

"تمہارے ساتھ اور بھی کوئی تیار ہوا ہے گواہی دینے کو۔۔۔ محلے والوں میں سے۔۔۔ راہگیروں میں سے۔"

"میں کسی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔۔۔ اپنا اپنا ایمان ہے۔ میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ تھانے میں بیان دے چکا ہوں۔ اس پر قائم رہوں گا۔۔۔"

"تمہارا ارادہ پکا ہے۔"

"بالکل"

"ٹھیک ہے۔"

"میں پوچھ سکتا ہوں۔ مجھے یہاں بلانے اور اس طرح گواہی دینے سے روکنے والے آپ کون لوگ ہیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ تم جا سکتے ہو۔۔۔"

اور

کل ظہیر نے گواہی دینا تھی۔۔۔ حق کی گواہی سچ کی گواہی۔۔۔ راستی کی گواہی۔

لیکن

وہ کل اسے دیکھنا نہ ملی۔۔۔ کسی نامعلوم شخص نے اسے گولی مار دی تھی۔۔۔

گولی جو سیدھی دل میں اتری تھی۔۔۔ اور اس مومن کا دل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا تھا۔ دھک دھک کرتی زندگی موت کی آغوش میں سو گئی تھی۔

اپنوں کے پیارے

غیروں کے دلارے

مخلص اور بے ضرر انسان کو ظلم کے لمبے ہاتھوں نے دبوچ لیا تھا۔

اُدھورے خواب

گورنمنٹ گرلز کالج کا ہال لڑکیوں اور عورتوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔

انٹر کالجز مباحثے کا آج تیسرا دن تھا۔ آج فائنل مباحثہ تھا۔ ٹرافی اور انعامات کی تقسیم ہونا تھی۔

"وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ" موضوع تھا اور اس کے حق اور مخالف لڑکیاں اپنی اپنی باری سے سٹیج پر آ کر تقاریر کر رہی تھیں۔ سٹیج خوبصورتی سے آراستہ کیا گیا تھا۔ مائیک لگائے گئے تھے۔ اور مدھم مدھم روشنیوں کا انعکاس خاص زاویوں سے ہو رہا تھا جو سٹیج کی خوبصورتی اور تمکنت میں اضافہ کر رہا تھا۔

جج صاحبان سامعین کی آگے والی قطار میں بیٹھی تھیں۔ ان کے سامنے میزیں رکھی تھیں۔ کاغذ اور قلم بھی مہیا کیے گئے تھے۔ ہر لڑکی کی تقریر وہ بغور سن رہی تھیں۔ فیصلہ انہوں نے دینا تھا۔ حق تلفی کی بات نہیں تھی۔ اپنے اپنے نظریئے کے مطابق وہ نمبر لگا رہی تھیں۔

اکثر لڑکیاں لکھی ہوئی تقریریں پڑھ رہی تھیں۔ کچھ نے تقریریں رٹ رکھی تھیں۔ جہاں کہیں کوئی لفظ بھولتا پوری کی پوری تقریر ذہن سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتی۔ ایسے سے جو ہوٹنگ ہوتی، وہ بیچاری لڑکی کو سٹیج سے بھاگ جانے پر مجبور کر دیتی۔

کالج کی نوعمر اور نوجوان لڑکیوں کو آج ہی تو من مانی کرنے کا موقع ملا تھا۔ پرنسپل اور سٹاف کی خاص ہدایت اور تنبیہ کے باوجود وہ ہوٹنگ سے باز نہیں آ رہی تھیں۔ دوسرے

کالجوں سے آئی طالبات ان کے رویے سے نالاں بھی تھیں لیکن انہیں یہ بھی پتہ تھا کہ جب ان کے کالج میں ایسے فنکشن ہوتے ہیں تو ان کا وطیرہ بھی یہی ہوتا ہے۔

بات بات پر شور شرابہ۔ بات بات پر آوازے۔ ہر دوسرے لمحے ہوٹنگ——

جو لڑکی بھی سٹیج پر آتی دل تھام کر آتی—— وہ تو اسی لڑکی کی ہمت پر منحصر ہوتا کہ اپنی پوری تقریر ختم کر کے سٹیج سے اترتی۔ فائزہ' آسیہ' نویدہ' شمیم' فرحت اور زیبا بڑی باہمت اور لائق لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے اپنی تقریر سے ایسی دھاک بٹھائی کہ شور شرابہ کرنے والی لڑکیوں کو جیسے منہ کی کھانا پڑی۔ اگر کسی نے آوازہ کسا بھی تو سامعین خواتین نے انہیں ڈانٹ دیا تھا۔ لوگوں نے ان کی تقاریر دلجمعی سے سنی تھیں۔

زیبا کے بعد سٹیج پر زرینہ ملک آئی۔ وہ اسلامیہ کالج کی طالبہ تھی۔ چوتھے سال میں تھی۔ قبول صورت اور بڑی سمارٹ لڑکی تھی۔ لائق بھی بہت تھی۔ تقریر کرنا اتنا مشکل کام نہیں۔ تقریر کے سحر میں سامعین کو مبتلا کرنا بڑا کام ہے۔ وہ اس فن سے آشنا تھی۔ کئی کپ اور ٹرافیاں حاصل کر چکی تھی۔ چہرے پر دھیمی دھیمی مسکراہٹ لیے جب وہ لفظوں کے جال بُنتی تو سننے والا یوں سمجھتا جیسے کانوں میں رس گھولا جا رہا ہے۔

یہ لڑکی ہر سال ٹرافی لے جاتی تھی۔ اس لیے آج گورنمنٹ گرلز کالج کی طالبات نے دوسرے کالجوں کی لڑکیوں سے مل کر منصوبہ بنایا تھا کہ اس کی ہوٹنگ کریں گے۔ ٹرافی اسے نہیں لینے دیں گے۔

زرینہ جسے سب پیار سے جینی کہتے تھے' سٹیج پر آئی۔ اس نے اپنے کالج کا یونیفارم پہنا ہوا تھا۔ بڑے پُر وقار طریق سے وہ سٹیج پر آئی۔ سر قدرے خم کیا۔ مسکرائی اور پھر مائیک کے سامنے آ گئی۔

کالج میں مدعو فوٹوگرافر نے اس کی تصویر لی۔

اس نے تقریر شروع ہی کی تھی کہ لڑکیوں نے آوازے کسنا شروع کر دیے۔ کچھ لڑکیوں نے "بند کرو' بند کرو" کے نعرے لگانا شروع کر دیے۔ بہت سی طالبات نے شور مچایا۔ سامعین اس لڑکی کو سننا چاہتے تھے۔ وہ اونچی آواز سے لڑکیوں کو شور مچانے سے روکنے لگے۔

جینی خاموش ہو گئی

لیکن

سٹیج سے بھاگی نہیں۔ وہیں کھڑی رہی۔ ہال پر مسکراتے ہوئے نگاہ ڈالی۔ جب شور کچھ کم ہوا تو وہ بڑے اعتماد سے مائیک کو اپنے سامنے کرتے ہوئے مخاطب ہوئی۔

"معزز سامعین! آپ میری تقریر سنیں یا نہ سنیں لیکن میں سٹیج سے اتروں گی نہیں۔ میں اپنی تقریر ضرور کروں گی—— اپنے خیالات آپ تک پہنچاؤں گی اور داد پاؤں گی۔ یہ میرا حق ہے۔ میں اپنے حق کے لیے پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ سینہ سپر ہو جاؤں گی۔"

پھر وہ ہنستے ہوئے بولی "اگر میں مخالفت سے گھبرا کر سٹیج سے بھاگ گئی تو پھر تصویر کائنات میں رنگ کیسے رہے گا——؟"

لوگ اس کی بات کو سن کر خوب ہنسے۔ وہ موضوع کے حق میں بولنے والی تھی۔ جملہ خوبصورت تھا—— لوگوں نے خوب داد دی۔

پھر وہ بڑی دلجمعی سے اس موضوع پر بولنے لگی—— خوبصورت الفاظ کی بندش' معقول دلائل اور پانی کے نشیب کی طرف جانے کا سا بہاؤ تھا لہجے میں—— مخالفوں کو منہ کی کھانا پڑی—— ہال پہ خاموشی چھائے چلی گئی—— جینی کی آواز کا زیر و بم بھی گونجنے لگا۔"

اس کی تقریر کا لبِ لباب یہ تھا کہ عورت سکون و خوشی کا منبع ہے۔ وہ زندگی کو حسن و تازگی بخش سکتی ہے۔ وہ اپنے ارادے کی پختگی اور استحکام سے ہر وہ کام کر سکتی ہے جس سے حیات فردوس رعناؤں کا دوسرا نام بن جائے۔ وہ بڑی روانی سے بول رہی تھی—— بڑے مثبت دلائل دے رہی تھی۔

ہال میں بیٹھی لڑکیاں مرعوب تھیں۔ خواتین اسے داد دیتے ہوئے سر ہلا رہی تھیں کہ واہ رہے کیا باتیں کہہ رہی ہے۔

انہی خواتین میں بیگم ریحانہ نجم بھی بیٹھی تھیں۔ وہ تو جیسے بُت بن گئی تھیں۔ نگاہیں جینی پر مرکوز تھیں۔ کان اس کی آواز پر لگے تھے۔ یہ لڑکی انہیں عزم و استقلال کی پیکر لگ رہی تھی۔ مخالفت کو اس نے جس طرح دبایا تھا اور پھر جس اعتماد سے تقریر کی تھی' وہ اس کے کردار کا حصہ ہی تو تھی۔

ٹرافی جینی نے ہی جیتی—— گورنمنٹ کالج کی پرنسپل نے اپنی تقریر میں اس لڑکی کی ہمت اور لیاقت کو خوب سراہا۔ جینی انکساری سے بچھ بچھ گئی۔

سٹیج سے اتر کر وہ نیچے آئی۔ تقریب ختم ہو چکی تھی۔ لڑکیوں نے اسے گھیر لیا۔ اپنی ہم جماعتوں نے تو اس پر پھول برسائے۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔

لڑکیوں کے غول جب قدرے منتشر ہوئے تو بیگم ریحانہ نجم بطورِ خاص اسے ملنے آئیں۔۔۔ خوبصورت اداس آنکھوں اور فربہ جسم والی گوری چٹی ریحانہ نجم نے بڑے پیار سے کہا:

"ٹرافی جیتنے کی مبارک ہو بیٹے۔"

"شکریہ آنٹی۔" وہ اس اجنبی خاتون کے شائستہ اور پیار بھرے لہجے سے بڑی مرعوب ہوئی۔

"کس سال میں ہو۔۔۔ ریحانہ نے پوچھا۔"

"فورتھ ایر میں۔"

"ابو کیا کرتے ہیں۔"

"ایس ڈی او ہیں۔"

"اچھا۔"

وہ جینی سے شاید اور بھی باتیں کرتیں کہ نوجوان لڑکیوں کا ریلا سا آ گیا۔ جینی کو مبارکبادیں دیتے ہوئے اسے گھیر لیا۔۔۔ ریحانہ اس کی مقبولیت دیکھ کر خوش ہوئیں۔۔۔ دل ہی دل میں انہوں نے کچھ ارادے مضبوط کر لیے۔

ان دنوں وہ اپنے بیٹے کے لیے لڑکی کی تلاش میں تھیں۔ آج اس تقریب میں شمولیت بھی اس لیے کی تھی کہ مختلف کالجوں کی ہونہار لڑکیاں اس تقریب میں شامل ہونے آ رہی تھیں۔

ڈھیر ساری لڑکیوں میں انہیں جینی ہی من بھائی تھی۔ جینی سے کہیں خوبصورت، سمارٹ اور پُرکشش لڑکیاں بھی تھیں، لیکن ریحانہ کو تو جیسے جینی ہی کی تلاش تھی۔ اس کی تقریر سے وہ بے حد مرعوب ہوئی تھیں۔۔۔ یہ لڑکی انہیں بلند حوصلہ، پُرعزم اور حالات کا رُخ موڑنے کی صلاحیت رکھنے والی لگی تھی۔

اور

انہیں ثمین کے لیے ایسی ہی لڑکی کی ضرورت تھی۔

جینی تو لڑکیوں کے غول میں گم ہو گئی تھی۔ ریحانہ نے اس کے متعلق رابعہ

سلیم سے بہت سی معلومات حاصل کیں۔ رابعہ سلیم اسلامیہ کالج کی لیکچرر تھیں۔۔۔ اور جینی کو وہ اچھی طرح سے جانتی تھیں۔ اس نے جو جینی کی تعریفیں کیں تو ریحانہ کا عزم اسے اپنے بیٹے کے لیے حاصل کرنے کا بہت پختہ ہو گیا۔ کئی دن گزر گئے۔

جینی ٹرافی جیتنے اور اس خاتون سے ملنے کے واقعہ کو شاید بھول بھی گئی تھی۔ اب پوری سنجیدگی سے پڑھائی کی طرف متوجہ تھی۔

اس دن وہ کالج سے لوٹی تو گھر کے دروازے کے سامنے نئی چمچماتی گاڑی دیکھی۔ پہلے تو یہ گاڑی یہاں کبھی نہیں آئی تھی۔ اس کے ذہن میں جتنے رشتہ داروں کی گاڑیاں تھیں گھوم گئیں۔

چند لمحے رک کر اس نے گاڑی کو بغور دیکھا۔ ڈرائیور سیٹ پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔

شاید ابو کے دوست آئے ہوں۔ اس نے سر جھٹکا اور پھر گھر کے دروازے میں داخل ہو گئی۔

گھر میں آتے ہی وہ بہت شور مچایا کرتی تھی۔ کتابیں اِدھر پھینکیں، جوتے اُدھر۔۔۔ بھابی نظر آئیں یا بہن بھائی وہ زوردار طریق سے سلام مارا کرتی تھی۔

آج بھابی نے اسے اندر آتے دیکھا تو جلدی سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

"کیوں؟" جینی نے سر کی جنبش سے سوال کیا۔

"ادھر آؤ۔" بھابی نے بھی ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنے کمرے کی طرف بلایا۔ جینی بیٹھک کی طرف دیکھتی صحن عبور کر کے بھابی کے کمرے میں آ گئی۔

"کیا بات ہے بھابی۔۔۔؟" اس نے کتابیں ڈریسنگ ٹیبل پر پھینک کر دھم سے بھابی کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"بتاتی ہوں پہلے کپڑے بدل لو۔" بھابی نے اس کے پھول دار کپڑے کرسی کی پشت پر ڈال رکھے تھے۔

"یہاں کیوں لائی ہیں، میرے کپڑے؟" اس نے پوچھا۔

"اس لیے کہ تو آتے ہی بدل لے۔ جلدی سے منہ ہاتھ دھو لو اور یہ کپڑے پہن لو۔"

اس نے سر جھٹکا— پھر بولی "کون آیا ہے؟"

"کوئی خاتون ہیں۔"

"باہر انہی کی گاڑی کھڑی ہے۔"

"ہاں—"

"ہیں کون—؟"

"پتہ نہیں—"

"عجیب بات ہے—!"

بھابی مسکرانے لگی تو جینی الجھ کر بولی "کون ہیں بتاتی کیوں نہیں؟"

"اللہ قسم مجھے خود پتہ نہیں' کوئی اجنبی خاتون ہیں—"

"کیوں آئی ہیں؟"

"بھابی مسکرائیں۔ پیار سے اس کے گال پر تھپکی دیتے ہوئے شوخی سے بولیں "اجنبی لوگ دوسروں کے ہاں بھلا اتنی اپنائیت سے کیوں آتے ہیں؟"

بھابی کی شوخی سے جینی ان کا عندیہ سمجھ گئی۔ لیکن لاپروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی "مجھے کیا پتہ۔"

"تجھے بھی پتہ چل جائے گا۔ میری تو دعا ہے کہ بات بن جائے۔"

"کیسی بات بھابی۔"

"اے پگلی تیرے رشتے کے لیے آئی ہوئی ہیں۔ بہت امیر کبیر ہیں۔ بڑی دھنی ہے تو— کالج میں کہیں دیکھا تھا تجھے۔ ڈیبیٹ والے دن—"

جینی کے ذہن میں ریحانہ نجم کا پیکر لہرا گیا— اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھلی— جلدی سے بولی "موٹی سی ہیں گوری چٹی—؟"

"ہاں۔"

"ہوں۔"

"جانتی ہو انہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر وہ بھابی کے باتھ روم میں گھس گئی۔ ہاتھ منہ دھویا۔ بال بنائے' کپڑے بدلے اور بھابی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

امی کے ساتھ بڑے صوفے پر وہی خاتون بیٹھی تھیں۔ جینی کے ہونٹوں پر

مسکراہٹ پھیل گئی— اس نے جھک کر انہیں سلام کیا۔ ریحانہ نے اسے اپنے قریب بٹھا کر پیار کیا۔

"آنٹی آپ کو ہمارے گھر کا کیسے پتہ چلا؟" جینی نے پوچھا۔

"بس ڈھونڈ لیا۔" ریحانہ متبسم تھی۔ بھابی نے شوخ نظروں سے جینی کو دیکھا۔

"چائے پیو گی؟" ریحانہ نے اپنے قریب رکھی ٹرالی کی طرف دیکھ کر اس سے پوچھا۔

"آپ پی چکیں۔" جینی نے امی وغیرہ سے پوچھا۔

"پتہ ہوتا تو تمہارا انتظار کر لیتے۔" بھابی نے شوخی سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد بھابی کے اشارے پر جینی وہاں سے اٹھ گئی۔ ریحانہ اس کی امی اور بھابی سے باتیں کرنے لگیں۔ اس نے اپنی آمد کا مدعا بیان کر دیا۔

اپنے خاندان' گھربار اور کاروبار کے متعلق بھی بتا دیا تھا۔ ثمین اس کا بڑا بیٹا تھا۔ اس کی تصویر بھی ساتھ لائی تھی۔ ہر لحاظ سے لڑکا اچھا تھا۔

بیٹیوں کے والدین خواہ کتنے ہی خوشحال اور آسودہ کیوں نہ ہوں' معقول رشتے کی تلاش ایک بوجھ بن کر ان کے اعصاب پر ضرور چھائی رہتی ہے۔ رشتہ ملنے میں جتنی دیر ہوتی جائے کوفت اور پریشانی بڑھتی جاتی ہے۔ اور جو توقع سے پہلے ہی قسمت اتنی یاور ہو کہ رشتہ گھر آ پہنچے تو والدین کی خوشی و مسرت دیدنی ہوتی ہے۔ اپنا آپ ایک دم سے ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ خوشیوں کی پھوار ان کے وجودوں میں ہولے ہولے دھنس کر انہیں اس طرح سیراب کر دیتی ہے جس طرح ساون کے پہلے چھینٹے گرمی کی حدت سے تپتی زمین کو— جینی کے گھر والوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ امی' بھابی' بہنیں' چھوٹے بھائی اور سبھی اتنے خوش تھے کہ زمین پر پاؤں نہ پڑتا تھا۔ جینی کا تو جیسے مذاق ہی بن گیا تھا۔ سب اسے چھیڑتے "تقریر کر کے میدان مار لیا۔" بھائی چھیڑتا۔

"اپنے اباجی سے میں نے ہی لکھوا کر دی تھی۔" بھابی مذاق کرتی "بتا دیتی نا بیگم ریحانہ صاحبہ کو اتنی مرعوب ہیں وہ اس تقریر سے۔"

"بھئی صرف تقریر کے لکھے ہوئے سے بات تو نہیں نہ بنی' اصل رویہ تو ہماری بہن کا تھا' بولنے کا انداز' لوگوں پر دھاک بٹھا دی تھی۔ اتنے جوش اور فراوانی سے بولی تھیں۔" چھوٹی بہن ہنستی۔

جینی کی کلاس فیلوز کو پتہ چلا۔ تو وہ بھی تقریر کے حوالے سے اسے چھیڑنے لگیں۔ بظاہر تو مذاق کرتی تھیں لیکن دل ہی دل میں رشک وحسد کے جذبے بھی سر اٹھا رہے تھے۔ سب کی نظروں میں آ گئی تھی وہ ——

بیگم ریحانہ نجم دوسری دفعہ نجم کو ساتھ لائیں۔ اس دفعہ انہوں نے اس وقت تک اٹھنے کا نام نہیں لیا جس وقت تک جینی کے لیے پھیلایا ہوا ہاتھ گوہرِ امید سے بھر نہ لیا۔

جینی کے ابو امی خوش تھے۔ ابو نے نجم کے خاندان اور کاروبار کے متعلق پوچھ گچھ کر لی تھی۔ شریف خاندان تھا۔ صاحب حیثیت لوگ تھے۔ لڑکا شکل وصورت کا اچھا تھا۔ یہی کچھ دیکھا جاتا ہے۔ اک تقدیر ہی ہوتی ہے جو ماں باپ نہیں دیکھ سکتے۔ مستقبل کے پردے میں چھپی۔ آنکھوں سے اوجھل تقدیر دیکھنا کسی کے بس میں بھی تو نہیں ہوتا۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ جینی کے ماں باپ نے بھی دل کھول کر پیسہ لگایا۔ پہلی بیٹی کی شادی تھی پھر امیر لوگوں سے واسطہ پڑا تھا۔ جینی کے نام پر خریدی زمین اس موقع پر کام آئی تھی۔ بہت اچھے داموں بک گئی تھی۔ جینی کی شادی والدین کے لیے کوئی مسئلہ نہ بنی تھی۔

بھاری عروسی جوڑا اور بیش قیمت زیور پہن کر جب وہ دلہن بنی تو پہچانی نہ جاتی تھی۔ اتنا روپ آیا تھا۔ اتنا نکھار آیا تھا کہ جو بھی دیکھتا تھا دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔

سسرال میں بھی جینی کا پرتپاک طریق سے خیر مقدم کیا گیا۔ گاڑی سے اتری تو ساس نے لال نوٹ قدموں تلے رکھ کر صدقے اتارے۔ چاندی کے پھول موسمی پھولوں کی پتیوں میں ملا کر نچھاور کیے۔ جینی کا من اس سواگت سے پھول گیا۔

رات حجلۂ عروسی پھولوں کی مہک اور روشنیوں کے غبار سے بھرا ہوا تھا۔ ہر شے خوبصورت اور قیمتی تھی۔ پھولوں کی لڑیوں میں سنہری اور پہلی تاریں چمک رہی تھیں۔ مسہری کے چاروں طرف ایسے ہی مہکتے مہکتے لڑیوں والے پردے تھے۔ بیڈ پر پھول اور کلیاں بکھیرے گئے تھے۔

رات گہری ہو گئی تو ایک ایک کر کے سب حجلۂ عروسی سے نکل گئیں۔ جینی ان کے جانے کے بعد سمٹ کر بیٹھ گئی۔ دل اچھل اچھل کر حلق میں آنے لگا۔ ثمین جسے اس نے تصویر کے علاوہ بھی ایک دو دفعہ دیکھا تھا اس کے حواس پر چھا رہا تھا۔ کوئی دم میں وہ آیا

چاہتا تھا' جینی ان آنے والے لمحوں کے انتظار میں سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔

لیکن

لمحوں کا انتظار گھنٹوں پر محیط ہو گیا۔ رات کا دل ڈوبنے لگا۔ فضائیں بوجھل ہونے لگیں اور جینی کے اندر ہی اندر مُردہ جسم ایسی ٹھنڈک کا احساس پھیلنے لگا۔ رات نصف سے زیادہ گزر گئی تھی لیکن ابھی تک ثمین نہیں آیا تھا۔ اس نے کئی بار گھبرا کر گھٹنوں سے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ کسی بدبخت کے نصیبوں کی طرح بند تھا—— دو ایک بار وہ بیڈ سے اتر کر کمرے کے وسط تک بھی آئی۔ کان ہر کھٹکے پر لگائے لیکن کوئی آہٹ نہ ہوئی۔ کوئی چاپ سنائی نہ دی۔ سنائی دیتی بھی کیسے۔ اس کے من کے آنگن میں تو بدنصیبیاں اتر رہی تھیں۔ بلا آہٹ۔ بنا چوں وچراں کے۔ بدنصیبی کی آہٹیں سنائی نہیں دیتیں۔ یہ سنائی دینے لگیں تو انسان پہلے ہی دن چوکنا نہ ہو بیٹھے۔

جینی گھبرا گئی۔ دل کی دھڑکنیں تھم تھم گئیں۔ آنکھوں کے دریچے کھلے رہے۔ لیکن کوئی نہیں آیا۔ وہ اس گھر میں آج ہی تو آئی تھی۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ اس گھر کے دروازے کدھر کھلتے ہیں۔ ریحانہ نجم کا کمرہ کدھر ہے اور ثمین کس کمرے میں بیٹھا اس کے صبر کو آزما رہا ہے۔

وہ پریشان ہو کر رونے لگی۔ جسم برف کی سِل بنتا جا رہا تھا۔ کچھ سمجھ نہ پا رہی تھی۔

کچھ کر نہیں سکتی تھی۔

عروسی جوڑا ابھی تک زیب تن تھا۔ زیورات سے ابھی تک لدی پھندی تھی—— نہ کپڑے بدل رہی تھی۔ نہ زیورات اتارنے کو جی چاہ رہا تھا۔ انتظار جو تھا۔ شاید اگلے لمحے چرچرائے اور بھاری قدموں کی چاپ اس کے کانوں میں رس گھول دے۔

تھک کر وہ بیڈ پر پھر آ بیٹھی۔ سکڑی سمٹی پریشان پریشان سی۔ ذہن سوچ سوچ کر جیسے مفلوج ہو چکا تھا۔ سر چکرانے لگا تھا۔ اس نے نرم نرم تکیوں کو اوپر تلے رکھا اور ان کے سہارے نیم دراز ہو گئی۔

نیند سُولی پر بھی آ جاتی ہے۔ اس حقیقت سے آج جینی دوچار ہوئی۔ خیالوں میں بھٹکے بھٹکے جانے کب اس کی آنکھیں بند ہوئیں اور وہ نیند کی آغوش میں سمٹ گئی۔

صبح ابھی پوری بیدار نہ ہوئی تھی۔ گھر مہمانوں سے بھرا تھا۔ رات سب دیر

سے سوئے تھے اس لیے ابھی گہری نیندوں کے مزے لُوٹ رہے تھے۔ ریحانہ کی آنکھ کھل گئی۔ تو وہ نجم کو سوتا چھوڑ کر چپکے سے بستر سے نکل آئی۔

وہ کچھ فکرمند سی نظر آرہی تھی۔ کچھ خدشے تھے جو ذہن میں منڈلا رہے تھے۔ چند لمحے وہ کھڑی کچھ سوچتی رہی۔ پھر دبے قدموں کمرے سے نکل آئی۔ لاؤنج سے ہوتی وہ جینی کے کمرے کی طرف بڑھی۔

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی کمرے میں آئی۔ ہر چیز ویسے ہی تھی جیسے رات کو چھوڑ کر گئی تھی۔

اب گہری سانس لے کر اس نے مسہری کی طرف دیکھا۔ جینی تکیے پر سر رکھے بے ترتیب سی پڑی تھی۔ عروسی لباس اس کے بدن پر سجا تھا۔ زیور بھی پہنے ہوئے تھی۔ ٹیکہ اُلٹ کر بالوں میں پھنس گیا تھا۔ لمبے لمبے آویزے گردن سے پیچھے کی طرف مڑ گئے تھے۔ چوڑا گلوبند بھی تقریباً الٹا ہوا تھا اور بڑے بڑے جڑاؤ ہار دائیں طرف لٹک رہے تھے۔ وہ چند لمحے غور سے اسے دیکھتی رہی۔ اسے اندازہ کرتے دیر نہ لگی کہ نشین کمرے میں نہیں آیا۔

لیکن شاید یہ بات اس کے لیے غیر متوقع نہ تھی۔

وہ بیڈ کے سرے پر بیٹھ گئی۔ اور ملائمت سے ہاتھ جینی کے سر پر پھیرنے لگی۔

وہ کئی لمحے ایسے ہی بالوں پر ہاتھ پھیرتی رہی۔

جینی نے کچھ بے چینی محسوس کی۔ سر سینے پر جھکا لیا۔ کندھے اچکائے اور سوئے سوئے مبہم سی آوازیں منہ سے نکالنے لگی۔

"جینی بیٹی۔" ریحانہ نے اسے پکارا۔

جینی نے ایک دم آنکھیں کھولیں۔ لیکن گردوپیش سے بالکل بے خبر تھی۔ آواز پر متوجہ نہ ہوئی۔ آنکھیں پھر بند کر لیں۔

ریحانہ نے پھر پیار سے پکارا۔

جینی کو ہوش میں آتے کئی لمحے لگے۔ اس نے ریحانہ کی طرف دیکھا۔ اور جب صورت حال سے پوری طرح باخبر ہوئی تو جلدی سے اٹھ بیٹھی۔

"بیٹی۔" ریحانہ نے کہا۔

"جی۔" اس نے پلکیں کئی بار جھپکانے کے بعد آہستگی سے کہا۔ پھر دوپٹہ تکیے

سے اٹھا کر سر پر ڈالنے لگی۔

"نشین نہیں آیا تھا۔" ریحانہ نے ہولے سے پوچھا۔

جینی نے گھٹنوں پر رکھا سر نفی میں ہلاتے ہوئے بے چینی سے گہری سانس اُگلی۔ "مجھے یہی دھڑکا تھا۔" ریحانہ بولی "اس لیے میں اتنی سویرے یہاں چلی آئی۔" جینی نے پریشان نظروں سے اسے دیکھا۔

ریحانہ نے پھر پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ چند لمحے چُپ رہی' پھر بولی "فکر کی بات نہیں جینی—— سب ٹھیک ہو جائے گا—— سب ٹھیک ہو جائے گا——"

جینی مضطرب ہو گئی۔ لیکن حیا نے زبان پر تالے ڈال دیئے تھے۔ وہ ریحانہ سے از خود کچھ نہ پوچھ سکی——

ریحانہ خود ہی بولی۔ "تم بڑی حوصلہ مند لڑکی ہو۔ پُرعزم دلیر—— اور حالات کا رُخ موڑنے کی صلاحیت رکھنے والی—— میں نے سینکڑوں لڑکیوں میں سے اس لیے تو تمہیں پسند کیا تھا!

وہ چُپ ہو گئی——

جینی سمجھ نہ پائی کہ یہ کس بات کی تمہید ہے۔ ریحانہ کی چُپ اسے کسی بڑے طوفان کی آمد سے پہلے چھا جانے والے سکوت کی طرح لگی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

ریحانہ چند لمحے اپنے دونوں ہاتھ ملتی رہی۔ پھر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "دراصل بات یہ ہے کہ——"

جینی بے چین ہو کر اسے تکنے لگی—— ریحانہ نے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

"دراصل بات یہ ہے کہ نشین شادی کرنا نہیں چاہتا تھا——"

"جی؟؟؟" جینی کے گلے میں چیخ گھٹ گئی۔ جسے ریحانہ نے محسوس کر لیا۔ اس لیے جلدی سے بولی۔ "میں تمہیں پوری بات بتا دیتی ہوں۔ گھبراؤ نہیں شادی نہ کرنے سے مراد یہ نہیں کہ وہ تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا یا اس نے کہیں اور دل لگا رکھا ہے——"

"تو—— تو پھر——؟" جینی کے لبوں سے سوال پھسل ہی گیا۔ بس سر پھرا سا ہے۔ جذباتی سا لڑکا ہے۔ شادی کرنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ بدکتا تھا شادی کے نام سے——"

"تو پھر آپ نے اس کی شادی کیوں کر دی——" جینی بے آواز چیخ اٹھی۔

ریحانہ نے اس کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "وہ شادی نہ کرنے کی کوئی معقول وجہ تو بتاتا نہیں تھا۔ کبھی کہتا جنجال میں پڑنا نہیں چاہتا۔ کبھی کہتا پابندیوں کا پابند نہیں ہونا چاہتا۔ میں کب تک اس کا منہ دیکھتی۔۔۔"

وہ چند لمحے چپ ہوئی۔۔۔ پھر بولی۔ "آخر میں نے اسے مجبور کر ہی لیا تم جیسی لڑکی مجھے نظر آ گئی تھی۔۔۔"

جینی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

وہ بڑے پیار سے بولی "پگلا ہے بالکل۔ انتہائی جذباتی۔ انکار کی وجہ ڈھنگ سے کبھی بتائی ہی نہ تھی۔۔۔ کب تک اس کی فضول باتوں کو برداشت کیا جاتا۔۔۔ میں نے زبردستی اس کی شادی کی ہے۔"

جینی پر جیسے غشی کا دورہ پڑنے والا تھا۔

ریحانہ نے اسے چمکارا اور ملائمت سے بولی۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا جینی بیٹی۔۔۔ تمہیں صبر اور حوصلے سے کام لینا ہوگا۔ یاد ہے نا وہ تقریر جو تم نے کالج میں کی تھی۔۔۔؟"

اسی وقت میں نے تمہیں ثمین کی دلہن بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تم حوصلہ مند ہو' دلیر ہو۔ حالات کا رُخ موڑ سکتی ہو۔ یہ کام وقت طلب ضرور ہے لیکن مشکل نہیں۔ تم جیسی ہونہار لڑکی حالات کو اپنے مفاد میں ڈھال لے گی۔۔۔"

جینی بُت بنی بیٹھی رہی۔۔۔

ریحانہ اسے تسلیاں دیتی رہی۔ خوشگوار مستقبل کی یقین دہانی کراتی رہی۔ "میں نے پورے اعتماد اور بھروسے سے تمہیں بہو بنایا ہے۔ تم ثمین کے خیالات کا رُخ موڑ دو گی۔ اس کے ذہن سے عورت کے متعلق جو بے بنیاد نفرتیں ہیں انہیں دُور کرو گی۔۔۔ اگر کوئی نفسیاتی وجہ بھی ہے تو اس خوف سے چھٹکارا دلانے میں تم اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ضرور کامیاب ہو جاؤ گی۔۔۔"

وہ بہت کچھ کہتی رہی۔

جینی دل تھامے سنتی رہی۔۔۔

پھر ریحانہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "صدمہ تمہیں یقیناً پہنچا ہے لیکن اسے ذہن سے جھٹک دو۔۔۔ آرام سے سو جاؤ۔۔۔ اسی طرح لیٹ جاؤ۔۔۔ کوئی بات نہیں۔" اس نے

زبردستی اسے لٹا دیا۔۔۔ پھر اس کی پیشانی چوم کر آہستگی سے بولی۔ "میں ابھی جا کر دیکھتی ہوں۔ وہ رات بھر کہاں پڑا رہا ہے۔ ہو سکا تو اسے یہاں بھیج دوں گی۔۔۔"

جینی گھبرا کر اٹھنے کو تھی کہ ریحانہ نے مسکرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے لٹا دیا۔۔۔ پھر کمبل اس کے اوپر ڈالتے ہوئے بولی:

"جینی میری بیٹی۔۔۔"

"جی۔" مریل سی آواز جینی کے منہ سے نکلی۔

"وعدہ کرو۔۔۔ حالات سے سمجھوتہ کر لو گی۔ پوری بہادری اور عزم کے ساتھ مقابلہ کرو گی۔"

فرطِ کرب سے جینی کی آنکھیں پھٹ جانے کو تھیں۔ اٹھارہ انیس سالہ ناتجربہ کار لڑکی کے سر پر ایکا ایکی اتنی کڑی اور بھاری ذمہ داری آن پڑی تھی۔ اسے کیا پتہ تھا کہ نبھا پائے گی یا نہیں۔ اس کی آنکھوں میں تو ہر جوان لڑکی کی طرح سنہرے روپہلے سپنے ہی سجے تھے۔ جن کی اتنی بھیانک تعبیر پہلی رات ہی دیکھ کر وہ بے طرح خوفزدہ ہو گئی تھی۔

ریحانہ نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے پھر اس کی پیشانی چومی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ "یہ گھر اب ہم سب کی چھوٹی سی کائنات ہے جینی۔ اس کائنات میں تمہارے وجود سے رنگ بھرے گا۔۔۔ کیوں؟"

جینی کچھ نہیں بولی۔

ریحانہ مڑتی ہوئی پھر کہنے لگی۔ "گھبرانا نہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ بہتر ہے تم سونے کی کوشش کرو۔ ثمین شاید نہ آئے۔ میں تھوڑی دیر تک اسے جگاؤں گی۔۔۔"

ریحانہ کمرے سے نکل گئی۔

جینی عجیب مخمصے میں پھنس گئی۔۔۔ ریحانہ پر بے طرح غصہ بھی آیا۔ اپنی غرض کے لیے اس نے کس بے دردی سے اس کی ذات کو کچل ڈالا تھا۔۔۔ اتنی بے رحم اور سفاک عورت اور کون ہو گی کہ جانتے بوجھتے ہوئے اک معصوم لڑکی کو ڈبو دیا۔

اسے ثمین پر بھی قہر کا غصہ آیا۔ ماں سے ڈر کر اس کی خوشی کی خاطر اس نے اک لڑکی کی زندگی تباہ کر دی تھی۔

کون جانتا تھا کہ حالات سازگار ہو جائیں گے۔ جینی جیسی کھلنڈری شوخ و شنگ لڑکی جس نے تجربوں کی بھٹی میں جلنا ابھی نہیں سیکھا تھا۔ کیا عجب پہلے ہی تجربے کی

بھینٹ چڑھ جائے۔

جینی کا دل ہول کھانے لگا۔ ڈوبتے ابھرتے وہ کبھی منفی کبھی مثبت انداز میں سوچنے لگی۔

انہیں سوچوں میں گم بیڈ پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔

وہ ذہنی اور جسمانی طور پر اس قدر تھک چکی تھی کہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیا ہوا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔

اپنا وجود اسے زندہ نعش کی طرح لگ رہا تھا۔

نعشوں کو تو قبروں میں پناہ مل جاتی ہے۔ سکون آجاتا ہے۔ آرام سے پڑی رہتی ہیں وہاں۔

لیکن

زندہ نعشیں

جو

قبروں میں نہیں اتاری جا سکتیں۔ سکون سے ہمیشہ نا آشنا رہتی ہیں۔

جینی سوچ سوچ کر بوکھلا رہی تھی۔ اور شاید بوکھلاہٹ کے انہی لمحوں میں نیند ایک بار پھر اس پر مہربان ہو گئی۔ وہ ویسے پڑے پڑے اونگھ گئی تھی شاید۔

ہاں اونگھ ہی گئی تھی۔

کیوں کہ جب چیخ و پکار سے اس کی آنکھ کھلی تو وہ مبہوت سی رہ گئی۔ گھر میں شاید کہرام مچا تھا۔ سینہ کوبی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ چیخ و پکار سے فضا تھرا رہی تھی۔ اونچی اونچی آوازوں میں بین دل ہلا رہے تھے۔

جینی گھبراہٹ میں بیڈ سے کود ی۔ دوپٹے کا ہوش رہا نہ جوتوں کا۔ جھٹ سے ادھ کھلا دروازہ کھولا اور باہر دوڑی۔

لاؤنج میں ڈھیر سارے لوگ تھے۔ شادی میں شریک ہونے والے مہمان اپنے اپنے کمروں سے دوڑے چلے آ رہے تھے۔ کوئی دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ کوئی سینہ پیٹ رہا تھا۔ لوگوں کے ہجوم میں ریحانہ اور نجم ماہی بے آب کی طرح لوٹتے ہوئے آہ و فریاد کر رہے تھے۔ ہائے ثمین' ہائے ثمین کہے جا رہے تھے۔

جینی کچھ نہ سمجھ پائی۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔ ہونٹ دھلے

ہوئے لٹھے کی طرح نظر آنے لگے۔

وہ لہرائی

تیورائی

کچھ عورتوں نے اسے تھامنے کی کوشش کرتے ہوئے صوفے پر لٹا دیا۔ وہ تو بُھر بھری مٹی کی طرح ہاتھوں سے پھسلی جا رہی تھی۔

وہ بیہوش ہو گئی۔

ثمین کی خودکشی کی خبر سن کر وہ ہوش میں رہ ہی کیسے سکتی تھی۔

اک اندوہناک

اور بھیانک ٹریجڈی وقوع پذیر ہو گئی تھی۔ کل جو گھر خوشی کے شادیانوں سے گونج رہا تھا آج چیخ و پکار' نالہ و شیون اور آہ و فغاں سے لرز رہا تھا۔

اہلِ خانہ کو تو ہوش نہیں تھا۔ ارد گرد کھڑے لوگ آنسو بہاتے ہوئے قیاس آرائیاں بھی کر رہے تھے۔

لیکن

کوئی بھی نہ جان سکا تھا کہ ثمین نے خودکشی کیوں کی ہے۔

کوئی جان بھی کیسے پاتا۔ اس نے کبھی کسی کو بتایا تھوڑا ہی تھا کہ وہ شادی کے جھنجھٹ میں کیوں نہیں پڑنا چاہتا۔

اس گھر میں بسنا ہے تو

نند کو بھابی بنالو......

وہ ہمیشہ طوفان میل کی طرح گھر میں داخل ہوتی تھی۔ کھٹاک سے ڈیوڑھی کا دروازہ کھلتا۔ دھم دھم قدموں کی آواز آتی۔ صحن میں آتے ہی کتابیں کونے میں پڑے تخت پر پھینک دی جاتیں۔ دوپٹہ رسی پر ڈال کر وہ کرسی پر گر جاتی اور پورے زور سے آواز لگاتی۔

"بھابی۔"

بھابی کو اس کی آمد کا پہلے ہی پتہ چل جاتا تھا۔ وہ چھت پر ہوتی یا اپنے کمرے میں' باورچی خانے میں ہوتی یا بیٹھک میں' مدیحہ کی آمد کی اطلاع اس کے طوفان میل کی طرح گھر میں داخل ہونے سے ہی ہو جاتی۔

بھابی اس کی آواز پر مسکراتی ہوئی جہاں کہیں بھی ہوتی بر آمد ہو جاتی۔

"آ گئی ہو۔" وہ پیار سے کہتی۔

"جی جناب آ گئی ہوں۔ کھانا مل جائے گا۔ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں بھابی۔" وہ اکثر یہی کہتی۔

بھابی بڑے لاڈ سے اسے چمکارتی۔ "مدیہ تو کپڑے بدل میں کھانا نکالتی ہوں۔"

مدیحہ جسے سب پیار سے مدیہ کہتے تھے جھک کر جوگرز کے تسمے کھولنے لگتی۔ پھر اسے دُنیا بھر کی باتیں یاد آ جاتیں۔ جوتے بے ترتیبی سے اتار کر پھینکتے ہوئے وہ بھابی کو کالج کے قصے سنانے لگتی۔

باتونی بہت تھی اور اس کی یہی عادت بھابی کو پسند تھی۔ بھابی بھی قصے مزے سے سنتی۔ اسے اپنے کالج کا زمانہ یاد آ جاتا۔ کبھی سہیلیوں کی باتیں۔ کبھی لیکچرز کے قصے۔ کبھی کینٹین کی باتیں۔ مدیحہ باتوں میں اس طرح محو ہو جاتی کہ بھابی کو کھانا نکالنا یاد رہتا نہ اسے کپڑے بدلنے۔ ایسے میں کہیں جو اماں آن ٹپکتیں تو ان کے سلسلہ کلام کو تلخ لہجے میں توڑ دیتیں۔

"کب سے آئی ہے تو۔ ابھی تک کپڑے نہیں بدلے اور بہو کھانا تو دے اسے' باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔ بچی صبح سے بھوکی ہے۔ کچھ تو خیال کیا کرو—"

ثمینہ کوئی جواب دیئے بغیر باورچی خانے میں چلی جاتی۔

اور مدیحہ ایک ہاتھ میں جوتے دوسرے میں دوپٹہ پکڑے سامنے والے کمرے میں گھس جاتی۔

تقریباً روز کا یہی معمول تھا۔

چار بھائیوں کی اکلوتی بہن مدیحہ فورتھ ایئر کی طالبہ تھی۔ تیکھے نقش و نگار اور متناسب جسم والی یہ لڑکی خاصی سمارٹ اور دلکش تھی۔ لاڈ پیار شروع سے ملا تھا۔ اس لیے طبیعت منچلی اور شوخ تھی۔ خود ہنستی تھی۔ دوسروں کو ہنساتی تھی۔ اماں کبھی کبھی اس کی شوخی پر الجھ جایا کرتیں۔ "اتنا نہ ہنسا کر—"

"کیوں۔" لاڈلی نند کی طرف داری کر کے بھابی بول اٹھتی—

"اوہو— یہی تو ہنسنے بولنے کے دن ہیں اماں۔" مدیحہ ماں کے گلے میں شوخی سے بازو ڈال کر گھوم جاتی۔

جنہیں ہنسنے کی عادت ہوتی ہے وہ ساری عمر ہی ہنستے رہتے ہیں— بھابی اس کے گال کو پیار سے چھو لیتی۔

"بالکل زندہ باد ثمینہ بھابی۔" وہ لڑکوں کی طرح مکے ہوا میں لہرا لہرا کر نعرے لگاتی۔

اماں دوپٹے کی بُکل میں منہ چھپا کر چپکے چپکے ہنس پڑتیں۔

مدیحہ چاروں بھائیوں سے چھوٹی تھی— ابو جب وہ چھوٹی تھی وفات پا گئے تھے۔ بھائیوں نے ابو کی کمی محسوس نہ ہونے دی تھی۔ باپ کی محبت انہوں نے ہی تو اس پر نچھاور کی تھی۔

بڑا بھائی بال بچوں سمیت سعودی عرب میں مقیم تھا لیکن وہ مدیحہ کے لیے ہر ماہ باقاعدگی سے رقم بھیجا کرتا تھا۔ جسے مدیحہ کھلے دل سے سہیلیوں پر خرچ کیا کرتی تھی۔ اماں تو نہیں چاہتی تھیں کہ وہ چند روپے بھی اس طرح خرچ کرے۔ وہ تو پیسہ پیسہ جوڑ کر اس کا جہیز تیار کر رہی تھیں —— جب وہ مدیحہ سے کہتیں وہ ہنس کر جواب دیتی۔ "یہ میرا جیب خرچ آتا ہے اماں۔ آپ کو زیادہ کی ضرورت ہے تو بھائی کو لکھ دیں۔"

لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آتی جبکہ بھائی خود ہی جہیز کے لیے چیزیں اور پیسے الگ بھیجا کرتا تھا۔ چھوٹا بھائی کراچی میں تھا۔ وہیں اس نے شادی کر لی تھی۔ لیکن مدیحہ اور ماں کو وہ نہیں بھولا تھا۔ اپنی تنخواہ میں سے جتنا پس انداز کر سکتا تھا وہ انہیں بھیج دیا کرتا تھا۔

تیسرا بھائی یہیں تھا۔ ثمینہ اماں کی بھانجی بھی تھی —— ساس بہو والی کوئی بات نہیں تھی۔ مدیحہ بھابی کی بھی لاڈلی تھی۔ نند بھاوج کم اور سہیلیاں زیادہ تھیں وہ ——

سب سے چھوٹا بھائی فاروق جو مدیحہ سے چار سال بڑا تھا' ان دنوں امریکہ میں مقیم تھا۔ وہاں ایم بی اے کر رہا تھا —— گھر والوں کو تو شاید امریکہ بھیجنے کی استطاعت نہ تھی۔ لیکن تھا بہت لائق —— کچھ بڑے بھائی نے مدد کی کچھ خود عارضی نوکری کر کے جمع کیا۔ یوں وہ امریکہ پہنچ گیا جہاں وہ کام بھی کرتا تھا اور تعلیمی مدارج بھی خوش اسلوبی سے طے کر رہا تھا ——

فاروق اور مدیحہ بہن بھائی ہی نہیں اچھے دوست بھی تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے۔ بچپن ہی سے گاڑھی چھنتی تھی۔ فاروق اس سے کوئی بات نہیں چھپاتا تھا۔ اس کے کتنے دوست تھے۔ اس کی کیا مصروفیات تھیں۔ اس کے کیا پلان تھے۔ مدیحہ سب کچھ جانتی تھی کہ ثمینہ بھابی کی چھوٹی بہن روبینہ اور فاروق میں چپکے چپکے محبت کی پینگیں بڑھ رہی ہیں۔ وہ اپنی خالہ زاد بھی تو تھی۔ ثمینہ بھابی نے سسرال والوں کے دل اپنے حسن اخلاق سے موہ لیے تھے۔ اس لیے فاروق کی پسند کسی طرح بھی ناپسند نہ ہو سکتی تھی۔

لیکن مدیحہ تو چپکے چپکے روبینہ اور فاروق کی رازدار بھی بن گئی تھی ——

کبھی کبھی وہ فاروق کی نظروں میں التجا محسوس کرتی تو خود ہی کہہ دیتی۔ "فاروق بھائی۔ چلو ذرا خالہ کے ہاں ہو آئیں۔"

فاروق کے من کی مراد مل جاتی۔ "چلو تیار ہو جاؤ —— اماں سے پوچھ لو ——"

"اماں کیا کہیں گی ——"

"ناراض نہ ہوں۔"

"کوئی بات نہیں ہے ناراضگی والی۔ وہ تو خوش ہوں گی۔"

مدیحہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔ فاروق پیار سے اس کی چٹیا پکڑ کر کھینچتا۔ "بہت باتیں آتی ہیں تجھے ——" وہ اپنی چٹیا چھڑاتے ہوئے شوخی سے کہتی —— "باتیں تو آتی ہیں۔ یہ کہیے جناب کے کام کی آتی ہیں نا۔"

"بہت شریر ہو۔"

"شکریہ۔"

فاروق جب امریکہ جا رہا تھا —— روبینہ اور فاروق کی رفاقت کچھ عرصہ کے لیے بچھڑ رہی تھی۔ بچھڑنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ یہ تکلیف اور اذیت فاروق اور ثمینہ کے چہروں پر بھی آ گئی تھی۔ تب ہی مدیحہ نے اماں کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ "اماں روبینہ کو خالہ سے فاروق کے لیے مانگ لو۔" اماں کی نیت بھی یہی تھی۔ ہنس کر جواب دیا۔ "نہ تو ہم بھاگے جا رہے ہیں نہ وہ لوگ —— خیر سے فاروق واپس آئے گا تو مانگ لیں گے۔"

"نہیں اماں۔" وہ بضد تھی۔ "آپ خالہ کے کانوں سے بات نکال دیں ضرور —— یہ نہ ہو انہیں کوئی اچھا رشتہ مل جائے اور وہ۔"

"فاروق سے اچھا رشتہ ملے گا۔" اماں اترائیں۔

"یہ بات تو جب ہو کہ آپ انہیں یقین دلا دیں —— وہ اس کے آنے کا انتظار اسی طور کر سکتے ہیں نا۔"

"بڑی اماں نہ بنو۔"

"بس میری بات مان لیں —— میں تو کہتی ہوں باقاعدہ منگنی یا نکاح کر دیں۔"

"کیوں فاروق پر اعتماد نہیں ——"

"ہے۔"

"پھر۔"

"اچھا رشتہ مانگ تو لیں۔"

مدیحہ کے اصرار پر ہی اماں نے بہن سے رشتے کی بات کی۔ جو قبول کر لی گئی۔

مدیحہ اس دن بہت خوش تھی۔اس نے فاروق اور روبینہ کے بندھن کو گرہ لگا دی تھی۔دو محبت کے متوالوں کا دامن خوشیوں سے بھر دیا تھا۔فاروق کے دل میں مدیحہ کی عزت اور پیار بہت بڑھ گیا تھا۔

امریکہ سے بھی وہ اسے باقاعدگی سے خط لکھتا تھا۔مدیحہ بھی تو بڑے اہتمام سے خط لکھا کرتی تھی۔سارا خط روبینہ ہی کی باتوں سے بھرا ہوتا تھا۔فاروق اس کا خط پا کر خوشی سے پھولا نہ سماتا۔روبینہ اور اس کے درمیان وہی تو رابطہ تھی۔پھر مدیحہ اسے پیاری کیوں نہ ہوتی— اس پیار کے اظہار کے طور پر اس نے مدیحہ کے لیے اپنے ایک جاننے والے کے ہاتھ اس کے لیے چھوٹی موٹی چیزیں بھیجی تھیں۔مصنوعی زیورات' البم' دو جرسیاں اور اونچی ایڑی کی خوبصورت سینڈل۔

جرسیاں اور سینڈل اماں نے زبردستی چھین لی تھیں۔

"کیا ضرورت ہے باہر کی اتنی خوبصورت چیزیں ابھی خراب کرنے کی۔"

مدیحہ نے ثمینہ بھابی سے شکایت کی تھی تو اس نے بھی یہی کہا تھا۔"جہیز میں قیمتی چیزیں ہوں تو لڑکی کا مان بڑھتا ہے۔بہت خوبصورت جرسیاں ہیں رہنے ہی دے اور سینڈل—؟"

وہ ابھی اتنی اونچی ایڑی پہن کر کیا کرے گی۔شادی کے بعد پہننا۔" ثمینہ نے اسے گدگدایا۔

"شادی تو جیسے تیار ہے نا۔" وہ بھابی سے روٹھ گئی۔

"ہم متوسط طبقے کے لوگ ہیں مدیحہ — برسوں شادی کے انتظار میں رہتے ہیں۔اور چیزیں جمع کرتے رہتے ہیں۔" بھابی نے اسے سمجھایا—

"آپ کو پتہ ہے فیشن کتنی تیزی سے بدل جاتے ہیں۔" وہ روٹھی رہی۔

"ٹھیک ہے۔" بھابی نے پیار کر لیا اور پھر اسے قائل کرنے کے لیے گھنٹہ بھر مغز کھپاتی رہی۔

یہی تو لاڈ تھے۔یہی تو چونچلے تھے۔

یہی تو پیار تھا جو مدیحہ کو مل رہا تھا۔طبیعت کی شوخی' تیزی اور چلبلاپن اسی کی بدولت تو تھا۔

گلی کی نکڑ پر اس نے شاندار سی چمچماتی گاڑی کھڑی تو دیکھی۔لیکن کچھ دھیان نہ

دیا۔اسے زوروں کی بھوک لگ رہی تھی۔بس سے اتر کر گھر تک آنا مشکل لگ رہا تھا۔طوفان میل کی سی تیزی سے تو روز ہی آنے کی عادی تھی لیکن آج بھوک کی وجہ سے قدم کچھ تیزی سے اُٹھ رہے تھے۔

وہ گلی کا فاصلہ سیکنڈوں میں طے کر کے گھر کے دروازے تک پہنچی۔حسب عادت دروازہ کھٹاک سے کھولنے والی تھی کہ بھابی نے آہستگی سے دروازہ کھول دیا۔

"بھابی—" اس نے بھابی کو دیکھا کچھ اور کہنے ہی کو تھی کہ بھابی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

جواباً اس نے بھی سر اور ہاتھ کے اشارے سے پوچھا کیوں۔

بھابی نے ہونٹوں پر انگلی رکھے رکھے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔وہ کچھ نہیں سمجھی۔سر کو جھٹکا دیا' ہونٹ سکیڑے اور بھابی کے پیچھے پیچھے خاموشی سے صحن عبور کر کے کمرے میں آ گئی۔صحن عبور کرتے وقت اس نے بیٹھک سے باتوں کی آوازیں سنیں جس سے اسے اندازہ ہو گیا کہ کوئی آیا ہوا ہے۔

کمرے میں آتے ہی بھابی نے اس سے کتابیں لے لیں۔اور آہستگی سے بولی۔

"جلدی سے یونیفارم اتار کر ہاتھ منہ دھو لے۔دوسرے کپڑے پہن۔میں نے تیرے کپڑے استری کر کے لٹکا دیے ہیں۔"

وہ دھم سے بھابی کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔"پہلے یہ بتائیے اتنی احتیاط کیوں برتی جا رہی ہے۔مجھے ڈیوڑھی سے یہاں تک جیسے پولیس کی حراست میں لایا گیا ہے۔"

بھابی ہنس پڑی بولی۔"تاکہ حسب عادت طوفان میل کھٹک پٹاک کرتی نہ چلی آئے۔"

"لیکن کیوں۔"

"بس باتیں ہی کیے جائے گی۔جلدی سے کپڑے بدل لے۔ہاتھ منہ دھو کر بال بنا لے۔"

"لگتا ہے—" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"لوگ آئے ہیں۔" بھابی نے اس کی بات کاٹ دی۔"تجھے دیکھنے۔"

اس نے سر ادھر اودھر جھٹکا۔یہ تیسرا یا چوتھا رشتہ تھا۔ہر دفعہ بھابی نے اسے سجا بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا۔لیکن تین رشتے تو ان کے معیار کے ہی نہ تھے۔

چوتھے کے معیار پر شاید یہ لوگ نہ اترے تھے۔ بات کہیں بنی نہ تھی۔ مدیحہ کو چڑ سی لگی۔ بھابی کو خوش دیکھ کر بولی "کیسے لوگ ہیں۔"

"بہت اچھے۔ بڑے امیر۔ گاڑی بھی ہے۔ حال ہی میں اپنی نئی کوٹھی میں شفٹ ہوئے ہیں۔"

"برخوردار کیا کرتے ہیں۔" مدیحہ نے جوتے اتارتے ہوئے تمسخر سے کہا۔

"اڑھائی ہزار روپے تنخواہ لے رہا ہے۔ کسی فرم میں ملازم ہے۔ ڈبل ایم اے ہے۔ باپ کا کاروبار خاصہ وسیع ہے۔ چھوٹا سا کنبہ ہے۔ ایک بیٹا ایک بیٹی۔ بس اور بڑی بات رشتے کے شدت سے خواہشمند۔"

"مجھے دیکھے بغیر ہی۔"

"تجھے دیکھا تھا اسی لیے تو آئے ہیں۔"

"کہاں دیکھا تھا؟"

"تیری دوست کی بہن کی شادی پر۔"

"نزہت باجی کی شادی پر۔"

"ہاں——"

"پھر——"

"تو انہیں پسند آگئی۔ رشتہ لے کر آگئے لیکن جس طرح آئے ہیں لگتا ہے تجھے پا کر ہی جائیں گے۔"

مدیحہ کے چہرے پر تفاخر کی چمک پیدا ہوئی۔ آنکھوں میں سجیلے رنگیلے خواب لہرا گئے۔ وہ کپڑے تبدیل کرنے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

جب لڑکی دلہن بنتی ہے تو اس کا وجود عروسی جوڑے اور روپہلی زیورات سے سج جاتا ہے اور اس کے اندر جذبات کی دھند پھیلی ہوتی ہے۔ یہ دھند قوس قزح کے رنگوں سے مزین ہوتی ہے۔ اس میں پھوٹتے شگوفوں کی مہک ہوتی ہے۔ بند کلیوں کی مسکان گھلی ہوتی ہے۔ ان چھوئے خوابوں کا حسن ملا ہوتا ہے۔

مدیحہ بھی جوان لڑکی تھی۔ کچھ ایسی ہی مسحور کن دھند اپنے اندر سمیٹے وہ دلہن بنی—— سسرال والے اس لیے بیش قیمت ملبوسات اور زیورات لائے تھے۔ عمران ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ شادی دھوم دھام سے کرنا ہی تھی۔

اماں نے بھی رکھی رکھائی کو ہوا لگائی تھی۔ مدیحہ کے لیے انہوں نے کافی جہیز جمع کر رکھا تھا۔ چار بھائیوں کی بہن تھی۔ سعودی عرب سے بڑا بھائی اس کے لیے تحائف کا انبار لے کر آیا تھا۔ کراچی والے بھائی نے بھی بہن کی شادی کے لیے کافی رقم دی تھی۔ اور تو اور فاروق نے بھی اس کے لیے ڈائمنڈ کا ننھا سا نفیس سیٹ بھیجا تھا۔

مدیحہ خوش تو بہت تھی۔ لیکن ایک خلش تھی۔ اس مسرور کن موقع پر اس کا سب سے پیارا دلارا بھائی موجود نہیں تھا۔

اس نے اماں سے کہا بھی تھا چند مہینے اور انتظار نہیں ہو سکتا تھا۔ فاروق بھیا آجائے تب کر لیتے شادی۔

لیکن یہ سسرال والوں پر منحصر تھا۔ اماں نے مہلت مانگی بھی تھی لیکن وہ چٹ منگنی پٹ بیاہ کرنا چاہتے تھے۔ اور پھر فاروق کی واپسی کا پتہ بھی کسے تھا۔ ابھی تو وہ فائنل ٹرم میں تھا۔ کبھی واپس آنے کا لکھتا اور کبھی لکھتا کہ وہاں ہی جاب ڈھونڈ لے گا۔ صرف شادی کرنے پاکستان آئے گا۔ بے یقینی کے لیے شادی التوا میں ڈالنا عقلمندی نہ تھی۔ پھر اتنا اچھا رشتہ ملا تھا۔ ہر لحاظ سے موزوں۔ التوا میں ڈالنے سے کوئی گڑبڑ ہو جاتی تو——

مدیحہ کی شادی پر دونوں طرف سے دل کے ارمان نکالے گئے۔ سسرال والوں کی حیثیت اور پوزیشن دیکھتے ہوئے گلیوں سڑکوں پر قناتیں لگا کر بارات کا استقبال کرنے کی بجائے ہوٹل میں بندوست کیا گیا۔ بڑے بھیا نے ہوٹل کے سارے اخراجات اپنے ذمہ لے لیے۔

یوں مدیحہ اک آن سے 'اک شان سے میکے سے رخصت ہوئی اور سسرال آگئی۔ یہاں اس کا استقبال شایانِ شان طریق سے کیا گیا۔ ساس سسر نے خندہ پیشانی سے بہو کی پذیرائی کی۔ نند تو بھابی پر نچھاور ہو گئی۔ مدیحہ کی ہم عمر ہی تھی۔ عمرانہ دیدہ و دل فرشِ راہ کئے بیٹھی تھی۔ بھابی کے لیے۔

یہی حال عمر کا تھا۔ مدیحہ اس کے جوان خوابوں کی تعبیر تھی۔

مدیحہ کو لاڈ پیار کی عادت تھی۔ سسرال میں آکر بھی اتنا لاڈ پیار ملا کہ ایک لمحہ کو بھی اسے میکے کی چاہتوں کی یاد نہ آئی۔

وقت شوخ و چنچل لہراتی بل کھاتی ندی کی سی روانی سے گزرنے لگا۔

مدیحہ نے اپنی خوش خلقی' شوخی اور کشادہ دلی سے گھر والوں کے دل میں گھر

کر لیا۔ ساس کا منہ تعریفیں کرتے نہ تھکتا۔ "مدیحہ جیسی بہو خدا ہر ایک کو دے۔ بہت ہی اچھی لڑکی ہے۔ خدمت گزار ہے۔ اتنا سکھ تو مجھے عمرانہ نے نہیں دیا جتنا یہ دے رہی ہے۔ سگھڑ اور سیانی ہے۔ ہر کام میری اجازت لے کر کرتی ہے۔"

ساس ہر رشتہ دار' ہر ملنے والے سے مدیحہ کی باتیں کرتی۔ سسر بھی پیار سے تعریفیں کرتے۔ عمرانہ کی بات ہی الگ تھی۔ لگتا تھا اسی کی ہو گئی ہے۔

عمر مدیحہ سے کہتا "پھول کر کُپا نہ ہو جانا مجھے موٹی عورت پسند نہیں ہے۔"

"پھولوں گی تو میں ضرور۔" وہ ہنس کر فخریہ انداز میں کہتی۔ "کُپا البتہ نہیں ہوں گی۔"

"امی کی باتوں پر نہ جانا۔" وہ چھیڑتا۔ "بڑی سخت طبیعت کی ہیں۔ ان کا پیار دیکھا ہے۔ مار کے لیے بھی ذہنی طور پر تیار رہنا۔"

وہ ہنستے ہنستے دوہری ہو کر کہتی۔ "میں بچی ہوں جو وہ مجھے ماریں گی۔"

وہ بھی ہنستا اور پھر کہتا "مار کے بھی انداز ہوتے ہیں مدیحہ رانی——"

"اُوں ہُوں" وہ اس کی بات پر قہقہہ لگاتی اور دونوں انجانی مسرتوں اور ان چھوٹی خوشیوں سے اپنا دامن بھر لیتے۔

مدیحہ خط پڑھ رہی تھی۔ اور اس کے چہرے پر خوشیوں کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔

"کس کا خط ہے؟" قریبی کرسی پر بیٹھی ساس نے پوچھا۔

"فاروق بھائی کا۔" وہ خوشی سے چہکی۔

"جو امریکہ میں ہے۔"

"جی۔ ایم اے کرنے گئے تھے۔"

"کر لیا؟"

"جی پاس ہو گئے ہیں۔ چند ماہ تک واپس آ رہے ہیں۔ بہت پیارے بھیا ہیں میرے۔"

"ہُوں۔"

مدیحہ لاؤنج میں ساس کے پاس بیٹھی تھی۔ اس نے خط ایک بار نہیں کئی بار پڑھا۔ خوشی کی پھوار سے اس کا چہرہ بھیگ گیا۔

"کب تک آ رہا ہے؟" ساس نے پوچھا۔

"یہ تو نہیں لکھا۔ شاید یورپ گھوم پھر کر آئیں گے۔"

مدیحہ فاروق کی باتیں بڑے پیار سے کرنے لگی۔ اس کے حسن اخلاق کی باتیں' اس کے کردار کی باتیں' اس کی رفاقت اور ذہانت کی باتیں——

اور یہ باتیں سن کر ہی ساس کے دل میں اس لڑکے کو دیکھنے کا خیال شدت سے آیا۔ اس نے خاص طور پر مدیحہ سے اس کی تصویر دکھانے کی فرمائش کی۔

مدیحہ کے البم میں اس کی کئی تصویریں تھیں۔ وہ اٹھ کر گئی اور الماری سے سارا البم ہی اٹھا لائی۔

"خوش پوش' خوش شکل اور اچھے قد و قامت کا لڑکا اسے بہت اچھا لگا۔ دل ہی دل میں اس نے اسے عمرانہ کے لیے منتخب کر لیا۔ اس وقت تو وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ لیکن ارادہ پکا تھا۔ عزم مستحکم۔ اس لیے اس کی نوازشات مدیحہ پر اور بھی بڑھ گئیں۔ صرف مدیحہ پر ہی نہیں مدیحہ کے میکے والوں پر بھی۔"

عمر دفتر سے جلدی آ گیا تھا۔ آج مدیحہ کے ساتھ اس نے پکچر دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ مدیحہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی اپنے ہلکے ہلکے میک اپ کو آخری ٹچ دے رہی تھی۔ کہ ملازم لڑکا اجازت لے کر اندر آ گیا۔

"کیا ہے بگو۔" عمر نے پوچھا۔

"صاحب۔ کوئی صاحب بی بی جی سے ملنے آئے ہیں۔"

وہ بولا۔

"مجھ سے؟" مدیحہ نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں لپ اسٹک تھی۔

"جی۔"

"کون ہیں؟"

"پتہ نہیں۔ کہتے ہیں مدیحہ بی بی سے ملنا ہے۔"

مدیحہ حیران ہوئی۔ عمر سے بولی۔ "جا کر دیکھئے کون ہے۔"

"ملنے تم سے آیا ہے دیکھوں میں!"

"اللہ——" وہ بولی۔ "حرج ہی کیا ہے۔ آپ دیکھیں میں بھی آتی ہوں۔"

عمر بگو کے ساتھ ہی باہر نکلا۔ مدیحہ ہونٹوں پر لپ اسٹک کا آخری کوٹ کرنے لگی۔

بگو نے مہمان کو ڈرائنگ روم میں بٹھادیا تھا۔ عمر اس کے بتانے پر ڈرائنگ روم میں آگیا۔ جہاں ایک خوبرو نوجوان صوفے پر براجمان تھا۔

اسے دیکھتے ہی وہ اٹھا۔ عمر نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔ جواباً نوجوان نے گرمجوشی سے ہاتھ دباتے ہوئے کہا "آپ غالباً مدیحہ کے شوہر ہیں۔"

"غالباً نہیں یقیناً۔" عمر نے زیادہ گرمجوشی نہیں دکھائی۔

"تشریف رکھیے۔"

"مجھے مدیحہ سے ملنا ہے۔" وہ نوجوان عمر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھوں میں شوخی ناچ رہی تھی۔

"آپ کا اسم شریف۔" عمر نے پوچھا۔

"بتانا ضروری نہیں——" وہ لاپرواہی سے کندھے اچکا کر بولا۔ عمر نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"آپ ہیں کون؟" عمر نے الجھاؤ پر قابو پاتے ہوئے شائستگی سے کہا۔

"مدیحہ کے انتہائی پیارے دوست۔" وہ سینہ قدرے تان کر بولا۔ عمر کو اس کی بات اچھی نہیں لگی۔ چہرے پر ناگواری کے تاثرات چھاگئے لیکن پھر بھی ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "مدیحہ کو بلاتا ہوں۔"

"جلدی بلائیے۔ میں اسے ملنے کے لیے بے چین ہوں۔" اس نے دیدہ دلیری سے کہا عمر کے چہرے کے ناگوار تاثرات اور گہرے ہوگئے۔

"آپ ——" وہ کچھ کہنے ہی کو تھا کہ مدیحہ کی آواز آئی۔

"کون آیا ہے۔"

"تمہارا کوئی دوست۔" عمر نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

جواب میں مدیحہ خود ہی کمرے میں آگئی۔

اس نے اک نگاہ عمر پر ڈالی پھر مڑ کر مہمان کو دیکھا۔ وفور مسرت سے اس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ نوجوان سے لپٹ گئی۔

یہ اس کا فاروق بھیا تھا جو اسے سرپرائز دینے کے لیے اچانک بنا اطلاع کیے آن پہنچا تھا۔

خوب مزہ رہا۔ عمر، فاروق اور مدیحہ دیر تک ہنستے رہے۔ سب نے خوب انجوائے کیا۔

فاروق عمر سے بھی لپٹ گیا۔ ہنستے ہوئے مدیحہ سے کہا۔ "اے تیرا میاں بڑا شکی مزاج لگتا ہے، تو ابھی نہ آتی تو میں نے انہیں اور بنانا تھا۔"

عمر کھسیانا ہو کر ہنسا۔ "نہیں جناب۔ میں جان گیا تھا کہ یہ ذات شریف مدیحہ کے بھائی ہی کی ہے۔"

"ایسے ہی نہ کہیں جناب عالی—— بہت ڈسٹرب ہوئے تھے آپ۔" فاروق نے مدیحہ کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

تینوں بڑے خوش تھے۔

مدیحہ کی ساس کو فاروق کا پتہ چلا تو وہ بھی آگئیں۔ شکیل وخوبرو سا نوجوان پہلی ہی نظر میں من کو بھا گیا۔ بہت پیار کیا اسے—— بڑے اصرار سے چائے اور رات کے کھانے پر روکا۔ عمرانہ نے چائے سرو کی اور کھانے کی میز پر بھی مدیحہ کی ساس نے اسے فاروق کے عین سامنے والی کرسی پر بٹھایا۔ عمرانہ خاصی خوبصورت اور سمارٹ لڑکی تھی۔ فاروق روبینہ سے دل ہار نہ چکا ہوتا تو اس لڑکی گرہ گیر کا اسیر ہو سکتا تھا۔ لیکن اس نے تو اس نظر سے عمرانہ کو دیکھا ہی نہیں۔ وہ تو مدیحہ کے سسرال والوں کے حسنِ سلوک اور خلوص سے ہی متاثر ہوتا رہا۔

رات جاتے وقت اس نے اسی لیے تو مدیحہ سے کہا۔ "مجھے تیرے گھر والوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے—— مدیحہ—— تم بہت لکی ہو۔ یہ بات میرے دل کو تسکین دے رہی ہے۔ بہت خوشی ہوئی ہے تجھے اس گھر میں دیکھ کر۔"

مدیحہ کی ساس نے ان باتوں سے جانے کیا اخذ کیا۔ ہاں امید کی کرن بہت روشن ہوگئی۔

یہ بات مدیحہ کے وہم و گمان میں بھی نہ آئی تھی۔

وہ تو اسے سسرال والوں کا حسن سلوک اور خلوص سمجھ رہی تھی۔

لیکن آج اس کی ساس نے اسے اپنے پاس بٹھا کر بڑی رازداری سے کہا تھا۔

"مدیحہ بیٹی عمرانہ کے متعلق کچھ سوچا تم نے۔"

"جی!" وہ حیرانگی سے ساس کو تکنے لگی۔

"میرا مطلب ہے اب اس کی شادی وادی کا بھی سلسلہ ہونا چاہیے۔"

"جی امی ضرور ہونا چاہیے۔"

"تمہیں کیسی لگتی ہے وہ۔"

"کون عمرانہ۔"

"ہاں۔"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے امی — مجھے تو دل و جان سے پیاری ہے وہ —"

ساس نے اک پُرسکون گہری سانس لی۔ کچھ جھجکی پھر مسکرائی اور بولی۔ "فاروق ہمیں بھی بہت پیارا لگا ہے۔ عمرانہ اور فاروق کی جوڑی لاکھوں میں ایک ہوگی —"

مدیحہ کے کچھ کہنے سے پہلے وہ وہاں سے اٹھ گئی۔

سارے گھر والوں کے صلاح مشورے کے بعد ہی ساس نے یہ بات کی تھی۔ اس لیے تو اس دن عمر نے بھی مدیحہ سے کہا۔

"فاروق بہت اچھا لڑکا ہے۔ میری دلی خواہش ہے یہ ہمارے خاندان میں شامل ہو جائے۔ عمرانہ تو تمہیں بھی بہت اچھی لگتی ہے۔"

مدیحہ نے کہنا چاہا۔ "فاروق منسوب ہے۔" لیکن عمر کسی کام سے اٹھ کر چلا گیا۔

کئی دن مدیحہ اُدھیڑ بُن میں رہی۔ ساس کی نوازشات اس کے ساتھ فاروق پر بھی بڑھ رہی تھیں۔ ہر تیسرے چوتھے اسے اصرار سے گھر بلایا جاتا۔ دعوتیں ہوتیں۔ ہنسی مذاق ہوتا اور عمرانہ کو اک لمحہ کے لیے بھی اس دوران اِدھر سے اُدھر نہ ہونے دیا جاتا —

جب معاملہ خاصہ سنجیدہ ہو گیا تو مدیحہ نے ساس سے کھل کر بات کرنے کا عزم کیا۔

اس دن ساس عمرانہ کی خوبیاں گنواتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "ہماری ایک ہی بیٹی ہے تم سوچ بھی نہیں سکتیں کتنا جہیز دیں گے ہم اسے — سسرال والوں کی ہر حسرت پوری ہوگی۔ اس کے نام کی زمین بھی لے رکھی ہے۔ خدا نے چاہا تو دو چار سال میں کوٹھی بھی بنوا دیں گے۔"

"امی —" مدیحہ نے جی کڑا کر کے کہا۔

"ہوں۔"

"عمرانہ بہت اچھی لڑکی ہے — آپ —"

"تم لوگ بھی تو بہت اچھے ہو۔ میں نے اس کے لیے جیسا رشتہ چاہا — وہ سب خوبیاں فاروق اور تم لوگوں میں موجود ہیں مدیحہ بیٹی۔ تم لوگوں سے زیادہ مجھے اور کون عزیز ہوگا......"

"لیکن امی۔"

"کیا۔"

"فاروق کا رشتہ پہلے سے طے ہو چکا ہے۔"

ساس کے سر پر جیسے بم گرا۔ اس کی شخصیت بکھر گئی۔ لیکن جلدی سے بولی کہاں؟

"ثمینہ بھابی کی بہن روبینہ کے ساتھ۔"

"منگنی کی ہوئی ہے —"

"نہیں! زبانی بات طے ہوئی ہے۔ گھر کا معاملہ جو تھا —"

ساس گنگ ہو گئی — مدیحہ نے دانستہ فاروق اور روبینہ کے رومان کی بات نہیں کی۔

رُت بدلنے کا خاص وقت ہوتا ہے۔ اپنا مخصوص عرصہ پورا کر کے ہولے ہولے تبدیلی آنا شروع ہوئی — بالکل غیر محسوس طریق سے۔ شدت ختم ہوتی ہے۔ اور پھر رُت بدل جاتی ہے۔

لیکن

کبھی کبھی ایکا ایکی رُت بدل جاتی ہے۔ اپنے معیّنہ عرصے سے ہٹ کر، اپنے خاص وقت کو چھوڑ کر رُت بدل جاتی ہے۔ مدیحہ کی ازدواجی زندگی کی رُت بھی ایسے ہی ایکا ایکی بدل گئی۔

▲▲▲▲▲▲▲

پاؤں کی جوتی

اس کی چٹیا کو مٹھی میں پکڑ کر اس نے زور سے جھٹکا دیا۔ کف آلود جبڑے کچکچاتے ہوئے ماں بہن کی گالیاں دیں۔ پھر اسے پوری قوت سے پرے دھکیل کر ٹھڈا مارا۔ وہ گیند کی طرح لڑھکتی ہوئی دروازے سے جا ٹکرائی۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی۔ درد سے بلبلاتے ہوئے اس نے اپنے ہی سر کو پیٹ ڈالا۔

جیرا پھر اس پر جھپٹا۔ دو تین تھپڑ مارے اور گالی گلوچ بکتے ہوئے اُلٹی ہتھیلی سے اپنے ہونٹوں سے کف صاف کرنے لگا۔

شور شرابے کی آواز سن کر برابر والے گھر کی منڈیر سے راجی چاچی نے جھانک کر دیکھا۔ چھیما پٹ رہی تھی۔ جیرا اس پر جھپٹ رہا تھا۔ اس نے کونے میں پڑی لکڑی کی بلی اٹھالی تھی۔

"ہائے ہائے جیرے تیرا ستیاناس۔ مار ڈالے گا جان سے بیچاری کو——"

دوسرے بنیرے سے سکینہ اور اس کا دس بارہ سالہ لڑکا سر نکالتے ہوئے چیخے۔ لڑکے نے جیرے کے صحن میں چھلانگ لگا دی۔ لکڑی کی بلی سے لپٹتے ہوئے بولا:

"جیرے چاچے مت مار۔"

سکینہ بھی چیخی: "لوگو پہنچو۔ مار ڈالے گا نگوڑی کو آج۔"

پھر اس نے دوسری طرف دیوار پر کھڑی راجی چاچی سے کہا:

"اے بہن خدا کا خوف کرو کچھ' بھائی کو بھیجو۔ یہ تو آج مار ڈالے گا کم بخت کو۔

چاچی جوش میں آ کر دیوار پر چڑھی پھر الٹی ہو کر صحن میں لٹکی۔ پاؤں دیوار کے ساتھ لگے کھوکھے پر ٹکائے۔ صحن میں کودتے ہوئے جیرے کی طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ "اے اب تو تکّے تھپڑ سے ان باتوں پر آ گیا ہے۔ ہاتھ لگا کے تو دیکھ بچی کو۔"

چھیما گول مول ہو کر سر دونوں ہاتھوں میں پکڑے نصیبوں کے ساتھ چوٹوں کو رو رہی تھی۔ چاچی کو دیکھ کر اور زور سے رونے لگی۔

چاچی نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ "جیرے تیری یہ مجال۔"

جیرا بپھرا ہوا گستاخی سے بولا۔ "تجھے کیا راجی چاچی۔ میرے گھر میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔"

اس نے چاچی کے ساتھ سکینہ کو بھی دیکھا۔ سکینہ کے لڑکے نے جیرے کے ہاتھ سے بلی لے کر پرے گرا دی تھی۔

"رے ہوا کیا ہے تجھے——" چاچی کب ڈرنے والی تھی۔ تڑخ کر بولی: توم کر رکھ دیا ہے لڑکی کو۔ ہتھ نہ توڑ دوں گی تیرے۔ بڑا آیا ہے کہیں سے—— تو کیا سمجھتا ہے۔ چھیما کا باپ بھائی نہیں تو کوئی بھی نہیں اس کا۔"

چاچی کڑک دار آواز میں بول رہی تھی۔ جیرا کچھ ڈھیلا پڑ گیا۔ چھیما اور زور سے رونے لگی۔

سکینہ ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔ "روئی کی طرح دھنک دیتا ہے نگوڑی کو——"

"اب تو اس نے عادت ہی بنالی ہے۔ اللہ مارے کو میں نے اس لیے رشتہ لے کر دیا تھا——" راجی چھیما کو بازوؤں میں بھر کر جھلنگا سی چارپائی پر لے کر آ بیٹھی۔ چھیما جس کا سارا وجود پھڑک رہا تھا جیسے عافیت کے بازوؤں میں آ گئی۔ وہ چاچی کے سینے میں منہ چھپا کر بے اختیارانہ بے بسی سے رونے لگی۔

"تو چاہتا کیا ہے آخر——" راجی نے غصے سے پھنکارتے ہوئے جیرے کو دیکھا۔ جو کالی جھلسی ہوئی برآمدے کی چھت تلے کھڑا ابھی تک غصے سے بل کھاتے ہوئے خونخوار نظروں سے چھیما کو دیکھ رہا تھا——

"چاچی تو نہ بول ہمارے معاملے میں۔" وہ بدتمیزی سے بولا۔

"اے کیسے نہ بولوں۔" چاچی نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔ "اس کا رشتہ میں نے

لے کر دیا تھا تجھے۔ اس کی ماں باز پرس تو مجھ سے ہی کرتی ہے۔ میرا ہی دامن پکڑتی ہے۔ تو بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ پہلے صرف گالیاں بکتا تھا۔ پھر گھونسے مکے پر آیا۔ اور آج——"

"آج تو مار ڈالنے لگا تھا بے چاری کو——" سکینہ نے جلدی سے کہا۔ "میرا شیدو چھلانگ لگا کر اس سے لکڑی نہ پکڑ لیتا تو مار ہی ڈالتا بیچاری کو۔"

"بات کیا ہوئی تھی؟" راجی نے چھیما سے پوچھا۔ چھیما روتی آنکھوں سے چاچی کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "بات وہی ہے چاچی—— کہتا ہے پیسے لا کر دے ماں سے——"

"بکواس بند کر۔" جیرا غرّایا—— "یہی عادت ہے اس کی پٹر پٹر جواب دیئے جاتی ہے۔ چپ رہنا تو سیکھا ہی نہیں۔ غصہ دلاتی ہے تو——" وہ بکتا جھکتا صحن میں آیا اور پھر ڈیوڑھی کی طرف چلا گیا۔

سکینہ جلدی سے بولی۔ "ہاں بھئی مرد کو غصہ آ جائے تو زبان بند ہی رکھنی چاہیے۔ ورنہ یہی کچھ ہوتا ہے۔"

چھیما جیسے پھٹ پڑی۔ "کب تک زبان بند رکھتی—— کب تک چپ رہتی—— اس کے نشے کے لیے میں پیسے کہاں سے لاؤں—— میری ماں کہاں سے لائے اس کے لیے پیسے؟"

"ہوں——" راجی چاچی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تو بات ٹھیک ہی ہے۔ نشہ کرنے لگا ہے یہ——"

"میری تو جب سے شادی ہوئی ہے نشہ کر رہا ہے چاچی۔" چھیما نے راجی چاچی کے ساتھ لگتے ہوئے کہا۔ "آٹھ نو مہینے ہو گئے ہیں۔ کوئی دن نہیں ہوتا جو گولی نہ کھاتا ہو——"

"ہائے میں مر گئی—— تو نے پہلے کیوں نہ بتایا——" سکینہ بولی۔

راجی چاچی نے کہا۔ "اس بے چاری نے دو تین دفعہ اشارے کنارے میں بتایا تو تھا۔ لیکن مجھے کیا پتہ کہ یہ نشے کا اتنا عادی ہے۔"

چھیما سسکیاں بھرتے اور آنکھیں اپنے میلے آنچل سے پونچھتے ہوئے بولی۔ "تین چار دفعہ اماں سے لا چکی ہوں سو سو روپیہ۔ بیچاری جانے کہاں کہاں سے اس کے لیے قرض مانگ کر لاتی ہے۔"

"ہائے ہائے۔" راجی نے گال پر انگلی رکھ کر متانت سے کہا۔ "وہ بیچاری کہاں

سے پورا کرے گی اسے۔"

سکینہ نے سر اِدھر اُدھر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نصیبہ پھوٹا ہے بیچاری کا۔ ماں کی ایک اکیلی بیٹی تھی۔ ایسا آدمی پلے پڑ گیا۔ کیا کرے گی بیچاری—— نشے کی عادت جاتی تھوڑا ہی ہے۔"

راجی چاچی کو سکینہ کی بات بُری لگی۔ جھٹ سے بولی۔ "پتہ تھوڑا ہی تھا کہ یہ مشٹنڈا ایسا نکلے گا۔ ساٹھ ستر روپے دہاڑی کا کام کرنے والا تھا۔ کچھ اچھا ہی سمجھ کر رشتہ کرلیا تھا نا میں نے۔ اکیلا گھر سوچا تھا۔ عیش کرے گی چھیما۔ "عیش" چھیما نے ہنکارا بھرا "چین سے جی بھی لوں تو بڑی بات ہے چاچی—— ساری کمائی نشے کی نذر کر دیتا ہے۔ پیسے ختم ہو جائیں تو کہتا ہے اماں سے لا کر دے۔" وہ پھر رونے لگی۔ "اماں کا کون کمائی کرنے والا بیٹھا ہے۔ آج بھی اسی بات پر لڑائی کی ہے۔ کہتا ہے پانچ سو روپے لا کر دے۔ میں کہاں سے لاؤں چاچی۔ کس سے مانگوں۔" "نہیں بھئی جو بات غلط ہے غلط ہی کہوں گی۔" راجی بولی۔ "ماں کہاں سے لائے گی اتنے روپے۔"

"سو نہ دو سو، پورے پانچ سو۔" سکینہ نے اس رقم کو اپنی حیثیت کی نظر سے دیکھتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "اور وہ بھی نشہ کرنے کے لیے۔ توبہ توبہ۔"

سکینہ اور راجی چاچی باتیں کرنے لگیں۔ چھیما میلے دوپٹے کے کونے سے اپنی سرخ متورم آنکھیں پونچھتے ہوئے سسکیاں بھرنے لگی۔

سال بھر پہلے چھیما الھڑ سی لڑکی تھی' بھرے بھرے بدن' ڈوبتی شام ایسی رنگت اور موٹے موٹے نقوش والی چھیما بڑی ہنسوڑ لڑکی تھی۔ وہ صرف بیوہ ماں ہی کی نہیں لاڈلی تھی' محلے بھر کی پسندیدہ لڑکی تھی۔ اپنی ہم عمر ہی نہیں بڑی بوڑھیوں سے بھی اس کی دوستی تھی۔ کوئی گھر ایسا نہیں تھا جس میں اس کا آنا جانا نہیں تھا۔ کسی بی اماں کی ٹانگیں دبا رہی ہے۔ کسی خالہ بی کے گھر کے کام میں مدد دے رہی ہے۔ کسی باجی کی مشین گھر رگھر ر چلا کر اس کے ننھے منے بچوں کے فراک جانگیے سی رہی ہے۔ ہم عمر لڑکیوں میں بیٹھی ہے تو قہقہوں پر قہقہے بکھر رہے ہیں۔ ان دنوں زندگی اس کے لیے بڑی سہل تھی۔

نچلے متوسط طبقے کی چھیما اپنے حال میں بہت خوش تھی۔ مست تھی۔ ابا چند سال پہلے دمے کے عارضے میں مبتلا رہ کر چل بسے تھے۔ زندگی بھر انہوں نے بڑی محنت کی تھی۔ چھیما کے بعد دو تین بچے ہوئے تھے جو بچپن کی حدیں پار نہ کر سکے تھے۔ اس لیے

چھیما پر ہی نظر رہتی تھی۔ بیٹا بھی وہی تھی بیٹی بھی وہی۔ ابا نے تو حیثیت سے بڑھ کر اسے آسائش مہیا کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ابا فلیٹ کریپ کا سوٹ لا دو۔"

"ابا مقیش کا دوپٹہ لوں گی۔"

"اونچی ایڑی کا جوتا دیکھا ہے میں نے دکان پر وہی پہنوں گی۔"

وہ ابا سے جو بھی فرمائش کرتی۔ شام ڈھلنے سے پہلے پوری ہو جاتی۔ ابا کو چاہے کام کا ایڈوانس لینا پڑتا لیکن چھیما کے منہ سے نکلی فرمائش پوری ہوتی۔

اماں کو برا بھی لگتا۔ ابا سے لڑ بھی پڑتی۔ "کیوں عادتیں خراب کر رہے ہو بیٹی کی جو کہتی ہے فوراً لا دیتے ہو۔"

"کیا ہوا بھلی لوک۔ اپنا اور ہے ہی کون۔ اسی کے لیے تو کما رہا ہوں۔ میری لاڈو خوش میں خوش۔" اماں جہاندیدہ عورت تھی۔ اپنے طبقے کی خصوصیات سے آگاہ تھی۔ اس طبقے کی لڑکیوں کو ایسی چیزیں کنوار پنے میں کیا بیاہ کر بھی نہیں ملتیں۔ پھر لوگ بھی تو باتیں کرتے ہیں۔ نئے ریشمی کپڑے تو صرف خوشی کی تقریبات میں پہنے جاتے ہیں۔

چھیما تو ادھر کپڑا آیا ادھر قینچی پھری اور مشین تلے رکھ کر گھنٹہ بھر میں جوڑا تیار کر کے پہنا۔ پھر ہر گھر میں دکھاتی پھری۔ ابا کی تعریفیں کرتی پھری۔

کپڑے جوتے تو ایک طرف چھیما کو تو ہاتھ بھر بھر کر چوڑیاں پہننے کا بھی شوق تھا۔ ناک کان بھی کبھی ننگا نہ رکھا تھا۔

پیتل اور سٹیل کے ٹاپس اور آویزے تو وہ گلی میں ریڑھی والے سے خریدتی ہی رہتی تھی۔

اس نے سرخی پاؤڈر بھی اس ریڑھی والے سے خریدا ہوا تھا۔ خوشبو اور تیل کی شیشی بھی لی ہوئی تھی اور گلابی اور لال رنگ کی نیل پالشیں بھی خریدی ہوئی تھیں۔

ان چیزوں کے علاوہ کھانے پینے کی بھی شوقین تھی۔ گلی میں پھیری والے آتے جاتے تھے۔ قلفے والا، سموسے والا، پکوڑے والا، پھل والا، جو بھی ادھر آتا۔ چھیما کے دروازے کے سامنے ضرور آواز لگاتا۔ وہ کچھ نہ کچھ خریدتی جو رہتی تھی۔ ابا کام پر جانے سے پہلے چوری چوری پیسے اس کی مٹھی میں دے کر جایا کرتا تھا—— وہ چسکارے لے لے کر کھٹی مٹھی چیزیں کھاتی رہتی تھی۔

اماں کوسے جاتی۔ وہ ہنس ہنس کر ہاتھ میں پکڑی قلفی یا کوئی اور چیز اسے دکھا دکھا کر کھاتی رہتی۔

ابا محنت مزدوری کی کمائی لا کر اماں کے ہاتھ میں رکھ دیا کرتا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ چھیما کا بجٹ وہ الگ ہی رکھتا۔ اماں سمجھدار تھی۔ پیسے پس انداز بھی ضرور کرتی۔ چھیما جوان ہو رہی تھی۔ اسے بیاہنا تھا۔ اماں نے اس کے بیاہ کے لیے ہی پیسے پس انداز کرنا شروع کر دیئے تھے۔

لیکن

ابا دمے کے مرض سے جان بچا نہ سکے۔ حیثیت سے بڑھ کر اماں نے ان کا علاج کیا۔ لیکن زیست موت سے ہار گئی۔

چھیما کو ابا کی جدائی کا بہت صدمہ تھا۔ کئی ماہ تو وہ بولائی بولائی پھری۔

لیکن

وقت کے ساتھ ساتھ وہ بھی نارمل ہو گئی۔ ہاں اب اس نے فرمائشوں کا سلسلہ بند کر دیا تھا اور گلی میں پھیری لگانے والوں سے بھی چیزیں خریدنا چھوڑ دی تھیں۔ اماں اپنی مرضی سے ہی کبھی کبھار کوئی نیا کپڑا بنا دیتیں تو وہ پہن لیتی—— اماں کو اس نے اس سلسلہ میں بالکل تنگ نہیں کیا۔ ویسے بھی اب سمجھدار ہو گئی تھی۔ احساس تھا کہ وقت کو دھکیلنے کا بوجھ اماں کے سر ہے۔ بغیر آمدنی کے اسے دھکیلا نہیں جا سکتا۔ دھری دھرائی جو پونجی تھی ابا کی بیماری پر خرچ ہو گئی تھی—— جہیز کی صورت میں کچھ چیزیں البتہ پڑی تھیں—— نقدی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اسی لیے تو اماں نے چھپ چھپ کر مزدوری شروع کر دی تھی۔ وہ دکانوں کے لیے کام کرتی تھی—— خاموشی سے کام لے آتی تھی—— کبھی لفافے بناتی—— کبھی کنگریوں پر ستارے ٹانکتی—— کبھی گوٹے کا گوکھرو بناتی—— یوں جو پیسے ملتے اپنا اور بیٹی کا پیٹ پالتی تھی—— ان کاموں میں چھیما بھی اماں کا ہاتھ بٹاتی——

اسے محنت مزدوری کرتے دیکھ کر اکثر اماں کی چندھائی آنکھیں گیلی ہو جاتیں۔ ٹھنڈی آہ بھر کر کہتی:

"چھیما! تیرے باپ نے تیرے کتنے لاڈ اٹھائے تھے۔ میں تو خواہ مخواہ باپ بیٹی کے پیچھے پڑی رہتی تھی—— کیا پتہ تھا وہ آنکھیں موند لے گا۔ تو اس کی لاڈو کو زندگی سے

نبھاہ کرنے کے لیے اس طرح محنت کرنا پڑے گی۔"

چھیما ماں کا دل رکھنے کو کہتی:

"محنت کی کیا بات ہے اماں سارا کام تو تُو خود کرتی ہے۔ میں ذرا ہاتھ بٹا لیتی ہوں تو کیا ہوا— گھس تو نہیں جاتے میرے ہاتھ— اچھا ہے کام آجائے گا مجھے بھی— کبھی کرنا ہی پڑ جائے گا—"

"اللہ نہ کرے جو تجھے یہ کام کرنا پڑیں— تجھے تو میں ایسے گھر میں بیاہوں گی جہاں تو راج کرے……"

چھیما کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔

"اماں مجھے رنگ رنگیلے کپڑوں کا بہت شوق ہے۔ کسی کپڑے والے کے ساتھ بیاہ دینا مجھے—"

اماں کے دل سے اس کے خوشگوار مستقبل کے لیے دعائیں نکلتیں— دعائیں تو ہر ماں کے دل سے بیٹیوں کے لیے ہمہ وقت نکلتی ہیں۔ لیکن دعائیں باریاب ہوں جب نا—

اماں کو چھیما کے رشتے کی دوہری فکر تھی— ایک تو یہ کہ اب وہ سترہ برس کی ہو رہی تھی۔ یہ شادی کی موزوں عمر تھی— رشتہ انہی دنوں کہیں نہ کہیں ہو جانا چاہیے تھا۔ دوسرا یہ کہ رشتہ ایسی جگہ ہو جہاں چھیما راج کرے۔ اچھا کھائے' اچھا پہنے اور شوہر کی منظورِ نظر بن کر رہے۔

اپنی ملنے جلنے والیوں سے وہ اپنی خواہش کا تذکرہ کرتی رہتی تھی۔ پرلے محلے کی راجی چاچی سے بھی اس کا ملنا جلنا تھا۔ ایک دن راجی ان کے ہاں آئی۔ چھیما کو دیکھا تو بولی:

"جوان ہو گئی ہے تیری بیٹی بھی۔"

"ہاں راجی—"

"کہیں رشتہ وشتہ دیکھا ہے۔"

"نہیں راجی— ڈھنگ کا رشتہ ملے گا تو کروں گی۔ پوچھنے کو تو کئی لوگ پوچھ رہے ہیں—"

"ہوں—"

"تیری نظر میں کوئی اچھا رشتہ ہو تو ضرور دھیان رکھنا چھیما کا—"

"ہے تو ایک—"

"کون ہے۔"

راجی کی بات چھیما کی اماں کے من میں تجسس کی لہریں دوڑا گئی۔ بے اختیارانہ پوچھا۔ راجی مسکرائی پھر بولی:

"ایک ہے رشتہ— پہلے اتہ پتہ معلوم کرلوں۔ یہ نہ ہو اس کی بات کہیں لگ گئی ہو—"

چھیما کی اماں کو کچھ مایوسی ہوئی' پھر وہ بولی۔

"راجی ضرور پتہ کرنا— میں چاہتی ہوں اپنی چھیما ایسے گھر جائے جہاں آرام اور سکون سے زندگی گزارے— جانتی ہو نا— باپ کی کتنی لاڈلی تھی— جب سے وہ فوت ہوا ہے— بیچاری—"

"ہاں بہن— باپ کے سر پر بہت عیش کیے ہیں چھیما نے۔ خدا کرے شوہر بھی ایسا ہی ملے اسے۔"

"تم ضرور دھیان رکھنا۔"

"اچھا۔"

راجی نے چھیما کی اماں سے وعدہ کر لیا۔ اس کی نظر پڑوس میں رہنے والے جیرے پر تھی۔ ساٹھ ستر روپے روز کی کمائی کرنے والا جیرا چھیما کے لیے نہایت موزوں سمجھا— ایک اکیلا لڑکا تھا— بوڑھی دادی نے ماں باپ کے مرنے کے بعد پالا پوسا تھا— پچھلے دنوں دادی بھی چل بسی تھی۔ اب اکیلا ہی رہتا تھا۔ صبح صبح گھر سے نکل جاتا۔ رات گئے واپس لوٹتا تھا۔ گھر میں تھا ہی کون جس کے پاس آنے کی جلدی ہوتی۔ جب تک دادی زندہ تھی معمولات عام لوگوں ہی کے سے تھے— دادی کے ہوتے تو دوپہر کا کھانا بھی گھر آکر کھاتا تھا۔ اور شام ڈھلنے کے بعد کسی دوست یار سے ملنے بھی نہ جاتا تھا کہ بوڑھی ماں اکیلی ہوتی ہے—

ان لوگوں کو راجی چھ سات سال سے جانتی تھی— انہوں نے یہ ٹوٹا پھوٹا گھر خریدا تھا— تھوڑی بہت مرمت کروالی تھی— رہنے کو ٹھکانہ بن گیا تھا— اپنے ہی طبقے کے لوگ تھے۔ چند صندوق' بستروں کی پیٹی' استعمال کے برتن' دو چار چارپائیاں— یہی اثاثہ تھا لیکن جیرے کی آمدنی سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ نقد مال بھی ان کے

پاس ہے— پھر دادی اٹھتے بیٹھتے راجی سے باتیں بھی کرتی رہتی تھی نا۔ جیرے کی دھوم دھام سے شادی کروں گی—"

"پانچ تولے سونا ڈالوں گی۔"

"کپڑے تو میں نے بہت خرید رکھے ہیں۔"

"بھئی اس کی دلہن آجائے تو گھر بھی سجا لے گی۔"

"جیرا ماشاء اللہ کماؤ ہے۔ ایک دہاڑی بھی ضائع نہیں کرتا۔"

راجی کے ذہن میں چھیما کے رشتے کی بات کبھی آئی ہی نہ تھی۔ ورنہ وہ پوری پوری جاسوسی کر لیتی۔ ساری باتیں معلوم کر لیتی— دادی سے معلومات حاصل کرنا کون سی بڑی بات تھی۔ اس نے تو اس انداز سے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ حق ہمسائیگی تھا— جو گھڑی دو گھڑی بنیرے پر چڑھ کر دادی کی احوال پرسی کر لیتی تھی— اسی شام راجی چاچی نے جیرے کو بلا بھیجا۔

وہ آیا تو چاچی بڑی محبت سے پیش آئی' حال احوال پوچھا— پھر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی— جیرا ہر بات کا جواب بڑی سعادت مندی سے دیتا رہا—

چاچی بولی"تو رات گئے گھر آتا ہے— پھر صبح ہی صبح نکل جاتا ہے۔ کہاں رہتا ہے سارا وقت—"

جیرا ہولے سے مسکرایا پھر بولا"بس چاچی وقت ہی گزارنا ہوتا ہے۔ گھر پہ کون میرا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔ دادی جب سے مری ہے۔ مجھے تو اکیلا گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔"

چاچی لاڈ سے بولی۔"اے ہے گھر بسا کیوں نہیں لیتا اپنا—"

جیرا سر جھکا کر مسکرایا پھر بولا۔"اپنے آپ کیسے بسالوں چاچی— چھوٹا بڑا تو اپنا کوئی ہے نہیں۔ دادی تھی' اسے بھی موت نے مہلت نہ دی ورنہ—"

وہ جلدی سے بولی۔"کہیں رشتہ وشتہ طے ہوا ہے۔"اس نے نفی میں سر ہلایا—

راجی چاچی نے اطمینان کا سانس لیا پھر خوش ہوتے ہوئے اس کا کندھا تھپتھپایا۔"میں کوشش کروں تیرا گھر بسانے کی—"

جیرے کے لیے شاید یہ بات غیر متوقع تھی۔ بے یقینی سے چاچی کو دیکھا۔

چاچی گہری سانس چھوڑتی ہوئی بولی۔"تو میرا ہمسایہ ہے۔ مجھے تو بچوں کی طرح ہی لگتا ہے۔ جی جلتا ہے تجھے اکیلا دیکھ کر— گھر بھی تو نہیں آتا نا تو—"

"بس چاچی اکیلا ہوتا ہوں نا— یار دوستوں میں وقت گزار لیتا ہوں—"

"لے دیکھ میں بہت جلد تیری تنہائی دور کرنے کا بندوبست کرتی ہوں۔"

"سچ چاچی—"

"ہاں— بالکل سچ— نیک شریف لڑکی لا کر دوں گی تجھے۔ یاد کرے گا چاچی کو—"

"بڑی مہربانی چاچی—"

راجی چاچی اس سے پوچھ گچھ کرنے لگی۔"کتنی دہاڑی لیتا ہے— کیا کیا کام کر لیتا ہے— پاس کیا کچھ ہے— زیور کپڑا بھی ہے دادی کا بنایا ہوا؟—"

جیرے نے ساری باتیں تفصیل سے بتا دیں— راجی بہت خوش ہوئی— چھیما کے لیے اس سے اچھا بر شاید مل ہی نہ سکتا تھا۔

چاچی کی وساطت سے رشتہ طے ہو گیا تھا۔ چھیما اور اس کی ماں کی خوشیوں کا ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ چھیما کی ماں کو اپنی بیٹی کے لیے ایسا ہی لڑکا چاہیے تھا۔ ساٹھ ستر روپے روز کمانے والا لڑکا اس کے طبقے کی لڑکیوں کو آسانی سے کہاں مل سکتا تھا۔

چھیما کی خوشی تو دیدنی تھی۔ اپنی خوش بختی پر نازاں تھی— لہراتی پھرتی تھی— اپنی سکھیوں سہیلیوں کو بڑے فخر سے بتاتی پھرتی تھی۔ ہر جوان لڑکی کی طرح اس کی آنکھوں میں بھی رنگین سپنے لہرانے لگے تھے۔

جیرے نے اس کے لیے زیور بنوایا۔ جوڑے جھلمل کرتے ریشمی کپڑوں کے خریدے۔ ہار سنگھار کی چیزیں لیں۔ اماں نے بھی جو کچھ پڑا جہیز کی صورت میں تیار کیا۔ چھیما نے عروسی جوڑا خود اپنے ہاتھوں سے بنایا۔ سرخ ساٹن کے جوڑے اور لال جارجٹ کے دوپٹے پر گوٹا ہی گوٹا جڑ دیا۔

جیرا بارات لے کر آیا۔ چھیما دلہن بنی۔ اسے تو اس بات سے کوئی سروکار ہی نہ تھا کہ اماں کو باراتیوں کو دیکھ کا مایوسی ہوئی ہے۔ ڈھنگ کا ایک آدمی بھی تو ساتھ نہیں آیا تھا۔ صورتوں سے سب ہی واہیات سے لگتے تھے— اسے تو اس وقت کچھ سوجھ ہی نہ رہا تھا۔ نئے سرخ گوٹے سے بھرے جوڑے میں گٹھڑی سی بنی بیٹھی تھی۔ کانوں میں سوا تولے کے کانٹے تھے۔ ہاتھوں میں تین تولے کی چوڑیاں' ماتھے پہ سونے کا ٹیکا تھا۔ اور دو انگوٹھیاں بھی سانولی سلونی انگلیوں میں سجی تھیں۔ اس کی سہیلیوں نے ہاتھ بھر بھر کر اسے

مہندی بھی لگائی تھی۔ اور دلہن بنانے کے لیے شوخ شوخ سرخی پاؤڈر بھی لگایا تھا۔

چھیما دلہن بن کر جیرے کے ہاں آ گئی تھی۔ یہاں راجی چاچی نے ہی اس کا استقبال کیا۔۔۔ گلی محلے کی اور عورتیں اور بچے بھی جمع ہو گئے تھے۔۔۔ دلہن سب کو پسند آئی تھی۔ اور وہ جیرے کو مبارکبادیں دے رہے تھے۔

جیرے کی تنہا دنیا چھیما کے وجود سے آباد ہو گئی۔ وہ بہت خوش تھا۔۔۔ چھیما اسے ساری دنیا کی عورتوں سے زیادہ حسین لگتی تھی۔ چھیما بھی جیرے کو پا کر بہت خوش تھی۔۔۔ دونوں ایک دوسرے میں کھو سے گئے۔ کئی دن جیرا کام پر بھی نہیں گیا۔۔۔ یہ تو راجی چاچی تھی جس نے احساس دلایا۔۔۔ وہ ایک دن بڑے پیار سے جیرے کو سمجھانے لگی۔

"بیٹے کام پر بھی جایا کر۔۔۔ کمائے گا نہیں تو گھر گرہستی کا خرچہ کیسے چلے گا۔ جو کچھ پاس تھا وہ تو شادی پہ لگا دیا۔ اب کام پر جایا کر۔ پیسے چھیما کی ہتھیلی پر لا کر رکھا کر۔ اسے بھی تو پتہ چلے کتنے کماؤ مرد سے بیاہی گئی ہے۔۔۔"

یار دوست بھی کام کے لیے بلانے آنے لگے تھے۔ چھیما کا جی تو نہیں چاہتا تھا کہ جیرا ایک پل کو بھی اسے چھوڑ کر جائے۔ لیکن سب کے کہنے پر وہ بھی جیرے کو کام پر جانے کا کہنے لگی۔

جیرا کام پر جانے لگا۔ چھیما بڑے اہتمام سے اس کے جانے کی تیاری کرتی۔ اس کے کام والے کپڑے روز دھوتی۔ دوپہر کو کھانے کے لیے پراٹھا بنا کر دیتی۔ کبھی سبزی بھون کر ساتھ دیتی، کبھی دال پکا لیتی، قیمہ پیاز بنا دیتی، لال پھول دار رومال میں روٹی لپیٹ کر وہ اسے پکڑاتے ہوئے تاکیداً کہا کرتی۔ وقت پر کھا لینا روٹی۔ یہ نہ ہو کہ کام میں لگے رہو۔ اور روٹی کھانا یاد ہی نہ آئے۔

جیرا مسکرا کر کہتا۔ "روٹی کھانا میں نہیں بھولتا چھیما۔ تیرے ہاتھ کی پکی روٹی کھا کر تو نشہ آ جاتا ہے۔ جتنی دیر نوالے نگلتا رہتا ہوں تیرے ہاتھ کی خوشبو آتی رہتی ہے۔ چھیما اِترا کر اسے ادائے ناز سے دیکھتی۔ دونوں مسکرا دیتے۔"

یہ مسکراہٹیں دونوں کی ازدواجی زندگی میں پھول بن کر بکھر رہی تھیں۔

یہ واقعی پھول ہی تھیں۔

اور پھول باسی ہو جاتے ہیں نا مرجھا جاتے ہیں۔ سکڑ سکڑ جاتے ہیں۔ اپنی رنگت

کھو دیتے ہیں۔ ایسے کہ ان کے وجود اپنے نام پر دھبہ سا لگنے لگتے ہیں۔

چھیما کی زندگی مسکراہٹوں کے یہ پھول بھی جلد ہی باسی ہو گئے۔ جیرے کی دوستی جن لوگوں سے تھی وہ اس کی طرح محنت مزدوری کرتے تھے لیکن کمائی کا زیادہ حصہ دارو، ہیروئن اور راکٹ خریدنے پر صرف کرتے۔ دادی کے مرنے کے بعد جیرا ان لوگوں ہی میں وقت کا بیشتر حصہ گزارتا تھا۔ کبھی کبھی دنیا و مافیہا سے بے خبر کرنے والی ان چیزوں کو چکھ لیا کرتا تھا۔ یہ لوگ اب بھی اس کے ساتھی تھے۔ جیرا ان سے کنی کترانے کی کوشش بھی کرتا تو وہ گلے کا ہار ہو جاتے۔

"تھوڑی دیر بیٹھ یار۔ تمہارے بغیر تو اپنی محفل سونی ہے۔۔۔" وہ اسے اکثر شام کو گھر سے بلا کر لے جاتے اور جب وہ کچھ ہی دیر بعد اٹھنے لگتا تو اصرار سے کہتے:

کوئی آوازہ کستا۔ "شادی کر لی ہے۔ ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن رن مریدی ٹھیک نہیں۔۔۔"

دوسرا نشے سے ڈولتا ہوا کہتا۔ "تو کیا مرد ہے بے، جورو کا غلام بنے گا۔ تف ہے۔۔۔"

کوئی تیسرا بہک کر بول اٹھتا:

"بیوی پاؤں کی جُوتی ہوتی ہے۔ اسے پاؤں کے نیچے ہی رکھنا۔۔۔ اس کی غلامی کرنے لگا تو گیا دین دنیا سے۔"

جیرے کی بیوی کو غلامی کا طعنہ تیر کی طرح لگتا۔۔۔ وہ دل ہی دل میں کہتا۔ "واقعی میں تو چھیما کے حکم کا بندہ ہی بنتا جا رہا ہوں۔ کس مزے سے حکم چلاتی ہے اور میں بدھو ہوں کہ مانتا ہی جاتا ہوں۔۔۔"

دوستوں کی باتوں کا اثر تھا۔ یا جیرے کی سمجھ کا الٹ پھیر۔۔۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت دوستوں میں گزارنے لگا۔ جہاں دارو پیا جاتا۔ ہیروئن کھائی جاتی۔ مارفیا کے ٹیکوں کے رسیا ملتے۔ راکٹ کھانے والے ہوتے۔

"چھیما اس کے روز روز دیر سے گھر آنے پر پریشان ہونے لگی تھی۔۔۔"

"کہاں ہوتے ہو؟"

"گھر کیوں نہیں آتے؟ کام کے بعد کہاں جاتے ہو۔"

"دہاڑی کے پیسے اتنے کم کیوں ہو گئے ہیں۔۔۔ کہاں رکھتے ہو پیسے۔۔۔"

"تم پہلے سے نہیں رہے۔ کسی وقت تو لگتا ہے ہوش میں بھی نہیں ہوتے۔۔۔"

جیرا پہلے پہلے تو یہ باتیں' یہ استفسار خاموشی سے سن لیتا لیکن آہستہ آہستہ وہ اپنے آپ سے باہر آنے لگا۔

چھیما انتظار کی صبر آزما کیفیت سے دوچار ہوتی۔ اس کے دیر سے آنے پر باز پرس کرتی۔ تو وہ ماں بہن کی موٹی موٹی گالیاں جھاڑ دیتا۔ چھیما کا دل ٹوٹ جاتا۔ آنکھوں میں جلن ہونے لگتی۔۔۔ حلق میں کانٹے چبھتے۔۔۔ "جیرے۔۔۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔۔۔" وہ بے بسی سے پوچھتی۔

جیرا کوئی جواب دینے کی بجائے جھاڑ پلا دیتا۔ گالیاں بکنے لگتا۔ اب تو کبھی کبھی وہ چھیما کے تھپڑ لگانے سے بھی نہ چوکتا۔ تُو تُو مَیں مَیں ہونے لگتی تو وہ بے اختیار ہو جاتا۔ غصے سے لال پیلا ہو جاتا تھا۔

وہ نشہ کرنے کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ کیف و سرور کی جنت میں کھوئے رہنے کی خواہش میں گھر کی اصلی جنت کو جہنم بنا رہا تھا۔ چھیما روتی دھوتی اداس رہتی۔ ٹھنڈی آہیں بھرتی۔ جیرے کو کوئی فرق نہ پڑتا۔ وہ ڈھلانی راستے پر چل نکلا تھا۔ پاؤں ایک بار پھسل جائیں تو ڈھلانیں انہیں رکنے میں کبھی مدد نہیں دیتیں۔

جیرا پہلے تو دہاڑی کے پیسوں سے نشہ کرتا تھا۔ اب عادت پختہ ہوئی تو پیسوں کی ضرورت بھی بڑھی۔ اس نے چھیما سے حیلے بہانے پیسے بٹورنے شروع کیے۔ بہانے پہ بہانہ بناتا چلا گیا۔

"چھیما میں ایک دوست کے ساتھ مل کر کاروبار شروع کر رہا ہوں۔ پیسوں کی ضرورت ہے۔" اس نے چھیما سے کہا۔۔۔ کاروبار چمک گیا تو رانی بنا دوں گا تجھے۔۔۔"

"لیکن میں پیسے کہاں سے لاؤں جیرے۔۔۔ شروع شروع میں جو پیسے جمع کیے تھے وہ اب خرچ ہو گئے۔ تیری دہاڑیاں جو پوری نہیں ملتیں۔۔۔"

جیرے کی نظر چھیما کے زیور پر تھی۔ جانتا تھا مانگنے سے تو دے گی نہیں۔ کاروبار اور اس کے منافعے کا جادو ایسا تھا جس سے چھیما کو رام کیا جا سکتا تھا۔ وہ روز ہی چھیما کو کاروبار کے بارے میں بتاتے ہوئے سبز باغ دکھاتا۔۔۔ چھیما مرتی کیا نہ کرتی۔ جیرے کی رضا پر جھکنا ہی تھا اسے۔

پہلے چھیما کے کانٹے بکے۔۔۔ پھر چوڑیاں۔۔۔ انگوٹھیاں بھی بک گئیں۔ کاروبار کی چمک تو چھیما کو نظر نہ آئی۔۔۔ ہاں خوشبوں کے چہرے دھندلکوں میں ضرور ڈوب

گئے۔ اسے پتہ چل گیا کہ جیرے نے کاروبار کا بہانہ بنا کر نشے کی خاطر اس سے روپیہ اور زیور بٹورا ہے۔

چھیما ٹوٹ پھوٹ گئی۔ اعتبار اور اعتماد کو ٹھیس لگ جائے تو یقین کی دنیا تہہ و بالا ہو جاتی ہے۔ جیرے نے اس کے بھروسے کو توڑا تھا۔۔۔ وہ ٹوٹتی کیسے نہیں۔

جیرے کی طلب ختم نہیں ہو سکتی۔ اسے پیسوں کی ضرورت رہتی ہے۔ وہ چھیما کو مجبور کر کے اماں کے پاس بھیجتا ہے۔ پیسوں کے لیے کبھی طلاق دینے کی دھمکی دیتا ہے۔ کبھی مار ڈالنے کی۔۔۔ چھیما اماں کی حالت سے بے خبر تو نہیں۔ جیرے کے سامنے انکار کرتی ہے تو وہ پاگل ہو جاتا ہے۔ لاتوں' مکوں' گھونسوں سے چھیما کو دھنک کر رکھ دیتا ہے۔

چھیما جو ابو کی اتنی لاڈلی تھی۔۔۔ کہ پھول تک نہ مارا تھا اس نے کبھی۔۔۔ جو اماں کی دلاری تھی کہ محنت کرنے میں جب اس کا ہاتھ بٹاتی تھی تو اماں کو دکھ ہوتا تھا۔

جس کے راج کرنے کے خواب اماں شروع سے دیکھا کرتی تھی۔۔۔ اور جیرے کی دلہن بن کر یوں لگا تھا کہ جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ گئی ہے۔

سوکھی شاخوں پر بے موسمی پھول کھل اٹھے ہیں اور زندگی خوشبو بھری بہاروں کا روپ دھار گئی ہے۔

وہی چھیما

اسی زندگی سے

بیزار ہے۔

جائیداد

وہ دونوں ہاتھ سر تلے باندھے پلنگ پر چت پڑا چھت کو گھور رہا تھا۔ پاؤں پر پاؤں چڑھا رکھا تھا— اوپر والا پاؤں اضطراری کیفیت کے عالم میں ہلائے جا رہا تھا۔ شمسہ اس کے لیے چائے لینے گئی تھی۔ اور وہ اس کی بتائی ہوئی ترکیب اور سمجھائے ہوئے راستے پر چلنے کے لیے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شمسہ چائے کی دو پیالیاں چھوٹی سی ٹرے میں رکھ کر لے آئی۔ اس کے پیچھے پیچھے تین سالہ پنکی بھی اپنی گڑیا سینے سے لگائے چلی آئی۔

"پاپا۔" وہ ماں سے پہلے دوڑ کر پلنگ پر چڑھ گئی۔ وہ چونک گیا۔ پھر پنکی کو دیکھا۔ جو اس کے سینے پر چڑھی آ رہی تھی۔

"اوہ میری گڈو رانی—" اس نے بچی کو سینے سے لگا کر پیار کرتے ہوئے کہا۔

شمسہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھی— چائے کی پیالی بیڈ کے ساتھ رکھی ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی "لیجیے جناب— گرما گرم چائے پیجیے۔" اس نے سر گھما کر بیوی کو دیکھا— وہ مسکرا رہی تھی۔ وہ اسے تکتا رہا۔

"کیا بات ہے؟" شمسہ اس کے چہرے سے اس کی ذہنی الجھن کا اندازہ کرتے ہوئے مسکرا کر بولی:

"اٹھو چائے پیو— ذہن سے بار چھٹ جائے گا—"

وہ بچی کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے اپنا وجود کھینچ کر اونچا کرتے ہوئے اور بیڈ کے

تکیئے سے کمر لگاتے ہوئے بولا "شمسہ— تم نے جو ترکیب بتائی ہے—"

"وہ قابلِ عمل نہیں—" شمسہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے بات پوری کر دی۔

"دل نہیں مانتا—" وہ رُخ پھیر کر سائیڈ ٹیبل سے پیالی اٹھاتے ہوئے بولا:

"بزدل کہیں کے،" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "دل کے ماننے نہ ماننے کے چکروں میں پڑے تو کر چکے سب کچھ—" وہ چپ چاپ چائے گھونٹ گھونٹ حلق سے اتارنے لگا— بچی اپنی گڑیا لیے کمرے سے اچھلتی کودتی باہر چلی گئی— شمسہ پٹی پر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بڑے پیار سے بولی۔ "میری جان یہی موقع ہے— ہاتھ سے نکل گیا تو بس گیا— ذرا سوچو تو اتنی بڑی جائیداد ہمارے ہاتھ میں آ جائے گی— فیکٹری تو پہلے ہی ہمارے پاس ہے۔"

"لیکن—"

"پھر لیکن—"

"لیکن ماں اور ربیعہ صبیحہ کا حصہ۔"

"اے ہے۔" شمسہ نے چائے ختم کر کے پیالی ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھ دی— "ان کا فکر کیوں کھائے جا رہا ہے تمہیں— کون سا ہم انہیں بھوکا ماریں گے— انہیں ہر ماہ باقاعدگی سے خرچہ دیا کریں گے—"

"دونوں کی شادیاں—"

"وہ بھی اگر قسمت سے کوئی بَر مل گیا تو ہم ہی کر دیں گے— اور کیا چاہیے انہیں، جائیداد کا بٹوارہ خواہ مخواہ ہی کر دیں—"

"ہوں۔"

"ہمیں آدھا حصہ بھی نہیں ملے گا اگر بٹوارہ کیا تو— دو بیٹیاں اور ایک ماں— ہم سے زیادہ انہیں ملے گی جائیداد—"

"ہاں ماں کا حصہ بھی نکلے گا—"

"کوئی ضرورت نہیں— جیسے میں نے کہا ہے ویسے کرو— کون سا وہ تمہاری سگی ماں اور بہنیں ہیں— سوتیلے رشتوں کے لیے اتنے جذباتی انداز میں سوچنے کی ضرورت نہیں—"

"ہوں۔"

"میں تو کہتی ہوں کل ہی ماں سے مختار کُل بننے کے لیے کاغذ پر دستخط کروالو——"

"جو انہوں نے اعتراض کیا تو——"

"نہیں کریں گی—— ابا کے مرنے کے بعد سے ہم ان کے ساتھ کس طرح گھل مل کر رہ رہے ہیں۔ میں بھی ان سے اچھا سلوک کرتی ہوں، تم نے بھی ماں اور بہنوں کا سرپرست بننے کی حامی بھر کر ان کے دل جیت لیے ہیں——"

"یہ تو ہے۔"

"اسی لیے تو کہتی ہوں—— اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ—— ایک بار تم مختار کُل بن جاؤ پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں، ہم ابا کی ساری جائیداد اپنے نام منتقل کروا کے رجسٹری کروالیں گے——"

"اگر ماں کو پتہ چل گیا تو——"

"پتہ چلے گا کیسے—— کیا تم اتنی سی بات بھی دل میں نہیں رکھ سکتے۔ ذرا سوچو تو کتنی بڑی جائیداد ہاتھ آئے گی—— یہ کوٹھی—— سات دکانیں—— دو کنال زمین—— فیکٹری—— سب کچھ ہمارا ہوگا—— ہمارے بچوں کا ہوگا، پنکی اور منوں کے لیے ہوگا——" شمسہ کی آنکھوں میں چمک آگئی——

دو ہفتے پہلے جب ابا کی حالت بگڑ رہی تھی انہوں نے شاہد کو بلایا تھا۔ شاہد ایک ہی بیٹا تھا—— اکیس برس پہلے جب وہ چھ سات سال کا تھا اس کی ماں دوسرے مردہ بچے کو جنم دیتے وقت فوت ہو گئی تھی۔ زاہد احمد کا ہنستا بستا گھر اجڑ گیا تھا۔ اپنی ماں تھی نہ کوئی بہن جو گھر اور بچے کی دیکھ بھال کرتی—— اس لیے انہوں نے شاہد کو ننھیال بھیج دیا تھا—— سارا خرچہ وہ دیتے تھے—— صرف دیکھ بھال کے لیے وہاں بھیجا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب شاہد کا ننھا سا ذہن نانی اور خاص کر ممانی نے مسموم کر دیا تھا۔ دوسرے سال جب زاہد احمد نے دوبارہ گھر بسایا—— صابرہ سے شادی کی تو وہ صابرہ کی رضامندی سے شاہد کو واپس لے آئے۔ شاہد آ تو گیا لیکن اس کے ذہن میں سوتیلے پن کا زہر بھر دیا گیا تھا۔ صابرہ نرم خو تھی۔ خود یتیمی کی چوٹ کھائی ہوئی تھی۔ اس لیے شاہد کو اس نے کھلے دل سے خوش آمدید کہا—— زاہد کو خلوص نیت سے یقین دلایا کہ وہ شاہد کی دیکھ بھال اپنے بچوں سے بھی بڑھ کر کرے گی۔ لیکن شاہد کی اس سے بن نہ آئی—— وہ اپنے گھر میں آ تو گیا تھا

لیکن نانی اور ممانی اب بھی اس پر اثر انداز تھیں۔ اسی لیے وہ صابرہ کے قریب آنے کی بجائے اس سے دُور بھاگتا تھا۔ اس کا کہنا نہیں مانتا تھا—— جا و بے جا ضدیں کرتا—— جان بوجھ کر تنگ کرتا——

ربیعہ اور صبیحہ کی پیدائش نے تو شاہد کو صابرہ سے اور دُور کر دیا۔ صابرہ نے بخل سے کام نہیں لیا—— اس نے ہر ممکن کوشش کی کہ شاہد کے ساتھ اس کے تعلقات بہتر ہوں—— لیکن ایسا ہو نہیں سکا—— شاہد کو ایف اے کے بعد زاہد احمد نے اپنے ساتھ کام پر لگا لیا—— ان کی ربڑ کی فیکٹری شاہد ہی نے تو سنبھالنا تھی—— ابھی سے بار اس کے کندھوں پر ڈالتے تو اس نے کچھ سیکھنا تھا نا—— شاہد بھی پڑھنے لکھنے کا کوئی خاص شوقین نہ تھا—— اس لیے پڑھائی ادھوری چھوڑنا اسے برا بھی نہیں لگا—— نانی اور ممانی نے بھی یہی سمجھایا کہ وہ کاروبار میں حصہ لے—— وہی تو اس کاروبار کا وارث تھا—— شاہد کی شادی بھی اپنی ماموں زاد شمسہ سے ہو گئی—— زاہد احمد تو نہیں چاہتے تھے لیکن شاہد ننھیالی عزیزوں پر مفتوں تھا—— ممانی کے ہاتھوں میں تو وہ کھلونا بنا ہوا تھا—— اس کی بات ٹال کہاں سکتا تھا—— شادی کے بعد تو ممانی کے لیے شاہد کو نت نئی پٹیاں پڑھانا سہل ہو گیا تھا—— اب تو وہ ہر بات شمسہ سے کہہ دیتی—— شمسہ شاہد کے کانوں میں انڈیل دیتی۔ یہ جائیداد کا مسئلہ اور اسے اپنے نام کروانے کی ترکیب بھی ممانی ہی نے سوچی تھی—— شمسہ نے اسے شاہد تک پہنچا دیا تھا۔

شاہد اتنا بڑا قدم ایک دم ہی نہیں اٹھا سکتا تھا—— سوچ میں پڑ گیا تھا۔ ابا نے مرنے سے پہلے جو اسے بلا کر نصیحت و وصیت کی تھی—— اس کا اثر ابھی اس کے دل و دماغ پر تھا۔ ابا نے کمزور اور نحیف آواز میں اس سے کہا تھا:

"بیٹے—— میں جانتا ہوں—— میں بچ نہیں پاؤں گا—— میں اپنی ذمہ داریاں تمہیں سونپتا ہوں—— ربیعہ اور صبیحہ تمہاری بہنیں ہیں۔ سوتیلی ہی سہی لیکن تم تینوں میری اولاد ہو—— بدقسمتی ہے کہ میں دو جوان بیٹیوں کا بوجھ تمہارے کندھوں پر ڈال رہا ہوں۔ رشتے مل جاتے تو—— میں ان کے بار سے سبکدوش ہو جاتا—— اب—— اب تم نے ہی سب کچھ کرنا ہے۔ روپے پیسے کی کمی نہیں—— میں تم سب کے لیے اتنا چھوڑ جاؤں گا کہ تمہیں کسی قسم کی مالی پریشانی نہیں ہو گی—— بس وعدہ کرو کہ تم ماں اور بہنوں کا پوری طرح خیال رکھو گے——"

شاہد نے سر جھکا لیا۔ باپ کی حالت دیکھ کر اس کا دل دکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو امنڈ امنڈ آ رہے تھے۔ اس نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔۔۔ "ابا۔۔۔ آپ کو کچھ نہیں ہوگا آپ اچھے ہو جائیں گے۔ مایوسی کی کوئی بات نہیں۔۔۔ آپ کا علاج تسلی بخش طریق سے ہو رہا ہے۔" زاہد احمد نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے ڈوبتی آواز میں کہا۔ "شاہد۔۔۔ جو اللہ کو منظور ہو گا وہی ہو گا۔۔۔ تم دل تھوڑا نہ کرو بیٹے۔ ہمت سے کام لو۔۔۔ اب تم نے میری جگہ لینی ہے۔ میری ذمہ داریاں سنبھالنی ہیں۔۔۔ کوشش کر کے ربیعہ اور صبیحہ کی شادیاں کر دینا۔۔۔ صابرہ کو ماں سمجھنا بیٹے۔۔۔ وہ اچھے دل کی عورت ہے۔ بہت صابر اور شاکر بھی ہے تمہیں کوئی تکلیف نہ دے گی۔۔۔ مجھے دکھ ہے کہ تمہارے دل میں اس کے لیے پیار کی کوئی رمق نہیں۔۔۔ پھر بھی باپ کی بیوہ سمجھ کر ہی اس کا خیال رکھنا۔۔۔ احترام کرنا۔۔۔"

زاہد احمد نے اسے نصیحتیں کیں پھر جائیداد کی تفصیل بتائی۔۔۔ سارے کاغذات اس کے سپرد کیے۔۔۔ کوٹھی، دکانوں، زمین اور فیکٹری کی رجسٹریاں سیف سے نکلوا کر اس کے حوالے کیں۔۔۔ صابرہ اور ربیعہ صبیحہ کے حصے انہیں دینے کی تاکید کی۔۔۔ ان پر اچانک ہی نقاہت ٹوٹ پڑی تھی۔۔۔ بیماری نے غلبہ پالیا تھا اس لیے وہ خواہش کے باوجود اپنی زندگی میں سب کے حصے تقسیم نہ کر سکے تھے۔ انہیں زندگی مہلت دیتی تو شاید وہ سب کے حصے بخرے الگ الگ کر کے باقاعدہ رجسٹریاں بھی کروا دیتے۔۔۔ لیکن اب مجبوری تھی۔۔۔ شاہد پر ہی انحصار کر سکتے تھے۔

مرنے سے پہلے انہوں نے صابرہ، ربیعہ اور صبیحہ سے بھی جائیداد کے بٹوارے کی بات کی تھی۔ "شاہد سے میں نے کہہ دیا ہے وہ سب میں منصفانہ فیصلہ کرے گا۔۔۔ تم سب کو حصے مل جائیں گے۔۔۔ اور صابرہ۔۔۔ بچیوں کی شادیوں کے بعد شاہد نے تمہیں اپنے پاس نہ بھی رکھا تو بھی تمہارے حصے میں اتنی رقم اور جائیداد ضرور آ جائے گی کہ تم باقی زندگی آرام سے گزار سکو۔۔۔"

صابرہ اور بیٹیاں رو رو کے بے حال ہو گئی تھیں۔ اس وقت یہ باتیں انہیں گراں گزر رہی تھیں۔ وہ ان کی زندگی کی دعائیں کر رہی تھیں۔ موت سر پر کھڑی تھی لیکن وہ ان کی سلامتی کی تمنا کر رہی تھیں۔۔۔ زاہد احمد فوت ہو گئے۔ غم کا بار گراں صابرہ اور اس کی بیٹیوں پر ٹوٹ پڑا۔ صدمہ شاہد کو بھی ہوا۔ چند دن اس مشترکہ دکھ نے شاہد کو ماں اور بہنوں

کے قریب رکھا۔۔۔ وہ کبھی ماں کو اور کبھی بہنوں کو تسلی دیتا۔ بہنوں کے سروں پر ہاتھ رکھ کر کہتا۔ "اباجی ہم سب کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں، ہم ان کی محبت اور شفقت سے محروم ہو گئے ہیں لیکن تم فکر نہ کرو۔ میں زندہ ہوں تمہارا بھائی ہوں۔۔۔ تمہارا سرپرست ہوں۔ تم اب میری ذمہ داری ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔"

صابرہ کے سامنے بھی اس نے سر جھکا کر کہا تھا "مجھ پر بھروسہ کریں ماں۔۔۔ میں آپ کا سوتیلا بیٹا سہی لیکن اب میں اپنا فرض نبھاؤں گا۔۔۔ آپ کسی قسم کی فکر نہ کریں، ربیعہ اور صبیحہ میرا اپنا خون ہیں۔۔۔"

شمسہ نے بھی اپنا رویہ بدل لیا۔۔۔ وہ صابرہ کی اچھی اور فرمانبردار بہو بننے کی جھوٹی کوشش کر رہی تھی۔۔۔ ربیعہ اور صبیحہ کا اعتماد جیتنے میں لگی ہوئی تھی۔۔۔ یہ تبدیلی تھی تو خوشگوار لیکن بات اچنبھے کی تھی۔ اسی لیے اس دن ربیعہ نے امی سے کہا۔ "بھابی بہت مہربان ہوتی جا رہی ہیں۔ مجھے تو ان کی کوئی چال ہی لگتی ہے۔۔۔"

صابرہ نے بیٹی کو ٹوکا۔ "ایسے نہیں کہتے بیٹی۔۔۔ شک نہیں کرتے کسی کے خلوص پر۔۔۔ شاہد بھی تو بدل گیا ہے۔۔۔ شوہر کی وجہ سے شمسہ کو بھی رویہ بدلنا پڑا ہے۔۔۔"

"مجھے تو شاہد بھائی پر بھی اعتماد نہیں۔۔۔ اتنے التفات۔۔۔ ایسی مہربانیاں!"

صبیحہ بھی ماں کی ہم خیال تھی۔ اس نے بھی کہا۔ "ربیعہ اباجی کی موت نے شاہد بھائی کی طبیعت میں یہ تبدیلی پیدا کی ہے۔۔۔ ہم شک کیوں کریں۔۔۔ بھائی ہیں ہمارے۔ خون کا رشتہ ہے۔ اباجی سے بچھڑنا ہمارا مشترکہ دکھ ہے۔۔۔ اباجی کے بعد ہماری سرپرستی ان کا فرض ہے۔"

"بالکل۔۔۔" صابرہ بولی۔ "ان لوگوں کا یوں بدل جانا قدرتی ہے۔ آخر دنیا والوں کا بھی تو انہوں نے سامنا کرنا ہے۔ ہماری طرف سے آنکھیں موند لیتے تو لوگ لعن طعن نہ کرتے۔۔۔" ربیعہ کی تسلی تو نہ ہوئی لیکن اس نے امی کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار مناسب نہیں سمجھا۔ اس لیے خاموش ہو گئی۔ اسی شام جب سب اکٹھے بیٹھے تو صابرہ نے ہی شاہد سے کہا۔

"بیٹے! اللہ کو یہی منظور تھا۔ وہ انسان کو جس حال میں رکھے راضی رہنا چاہیے۔ یہ تو اللہ کا فضل و کرم ہے کہ تمہارے والد مرحوم نے تم سب کے لیے خاصہ ترکہ چھوڑا ہے۔ جائیداد بھی ہے۔ روپیہ پیسہ بھی۔ کسی کی محتاجی نہیں۔۔۔ یہ سب کچھ تمہارے والد

کا ہے۔ انہوں نے اپنی محنت سے کمایا اور بنایا۔ انہیں یہی فکر رہتی تھی کہ میرے بعد بچے محتاج نہ ہوں۔ انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچے۔"

شمسہ سوگوار صورت بنائے بولی۔ "سچی بات ہے انہوں نے زندگی میں بھی ہمیں عیش و آرام دیئے۔ کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔۔۔"

"ہاں۔" صابرہ بڑے گمبھیر لہجے میں بولی۔ "ان کی حتی الامکان کوشش ہوتی تھی کہ سب کو سکھ دیں۔ چین دیں۔ اسی لیے وہ سب کی ضرورتیں' سہولت سے پوری کرتے تھے۔ وہ چاہتے تو اپنی زندگی ٹھاٹھ سے گزارتے لیکن اپنے اوپر تو خرچ کرنے کو ان کا جی کرتا ہی نہیں تھا۔۔۔ ایک دفعہ میں نے کہا آپ اتنا کماتے ہیں اپنے لیے گاڑی خرید لیں۔۔۔ پتہ ہے کیا جواب دیا۔۔۔"

"کیا۔۔۔"

"کہنے لگے گاڑی کی قیمت میں زمین کیوں نہ خرید لوں' میرے بعد تم لوگوں کے کام آئے گی۔"

"اتنی جائیداد اسی طرح ہی تو بنائی ہے انہوں نے۔" شمسہ بولی۔

"ہاں۔۔۔ اب" صابرہ نے شاہد کی طرف دیکھا۔ "اب وہ جا چکے ہیں' جائیداد اور روپے پیسے کے متعلق بھی تمہیں سب کچھ بتا کر نصیحت کر گئے ہیں۔ بہتر ہے تم ان کی نصیحت اور وصیت پوری کرو۔"

"جی؟" شاہد نے استفہامیہ لہجے میں کہا۔

صابرہ نے اسے سمجھایا۔۔۔ بتایا۔۔۔ سب کے حصے بخرے الگ الگ کر دینے کی بات کی۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" شاہد بولا۔

"یہ بہت ضروری ہے بیٹے۔۔۔ ہر ایک کو اس کا حق مل جانا چاہیے۔ کسی کا کسی پر بار نہ رہے۔ ہم سر جوڑ کر بیٹھے ہیں افہام و تفہیم ہو سکتی ہے۔ تم سب سے پہلے اپنے پسند کی جائیداد لے لو۔ باقی بہنوں اور میرے لیے رہنے دو۔۔۔ مجھے اور میری بیٹیوں کو کوئی اعتراض نہیں۔۔۔ تم بیٹے ہو۔۔۔ ہمارے سروں پر اب تمہارے سائے کی ضرورت ہو گی۔ اس لیے تمہاری خوشی مقدم ہے۔"

"شرمندہ نہ کریں ناں۔" شاہد نے کہا۔

"میں اپنی خوشی سے کہہ رہی ہوں بیٹے۔۔۔" صابرہ نے کہا۔۔۔ پھر وہ اٹھ کر گئی اور سیف میں سے رجسٹریاں اور بینک کی اکاؤنٹ بکس اور دوسرے ضروری کاغذات لے آئیں۔ حساب کتاب ہوا۔۔۔ جائیداد کی اندازاً قیمت لگائی گئی۔ ماں کا حصہ نکال کر باقی آدھا دونوں بہنوں کے لیے تھا۔ شمسہ کی تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔۔۔ اس کا اندازہ اس سے کہیں کم تھا۔ لیکن لالچ بُری بلا ہے۔ اسی وقت اس کے ذہن میں یہ شیطانی خیال آیا کہ کیوں نہ ساری جائیداد ہتھیالی جائے۔

صابرہ نے شاہد سے کہا۔ "کل ہی کچہری جا کر کاغذات بنوالو۔۔۔ ہم ماں بیٹیاں دستخط کر دیں گی۔ تمہاری حیثیت مختار کُل کی ہو گی۔۔۔ بینک کا پیسہ بھی اسی صورت نکلوایا جاسکتا ہے۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ بھی بنوالینا۔ اور دوسری ضروری کارروائیاں بھی کر لینا۔"

ربیعہ اور صبیحہ رونے لگیں۔ شمسہ نے انہیں گلے لگالیا اور پھپک پھپک رونے لگی۔ لیکن دوسرے ہی دن اس نے ساری روئیداد ماں کو سنائی۔ ماں بھی لالچ کی لپیٹ میں آگئی۔ بیٹی کو خوب پڑھایا سکھایا۔ سوتیلے رشتوں کو کاٹ پھینکنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"شاہد مختار کُل ہو جائے تو جو جی چاہے کر سکتا ہے۔۔۔ ساری جائیداد اپنے نام کروا سکتا ہے۔"

"لیکن۔۔۔" شمسہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔۔۔ "وہ لوگ ایسا ہونے دیں گے۔"

"انہیں بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ انہیں تسلی دے دے کہ سب کے نام الگ الگ رجسٹریاں ہوں گی۔ لیکن کروالے اپنے نام۔۔۔ اور ایک بار رجسٹری اس کے نام ہو جائے تو پھر پوچھنے والا کون۔۔۔ شاہد کو اس راہ پر لگاؤ۔۔۔"

"ٹھیک ہے۔" شمسہ نے کہا۔۔۔ اور اب وہ شاہد کو یہ راہ دکھانے کے بعد ایسا کر گزرنے کی ہمت دلا رہی تھی۔۔۔ شاہد تذبذب کے عالم میں تھا۔ ایک طرف دولت کی کشش تھی۔ لیکن دوسری طرف دل میں تھوڑا سا خوفِ خدا ضرور تھا۔۔۔ بیوہ اور یتیموں کا مال یوں ہڑپ کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ رشتے سوتیلے تھے لیکن حقدار تو تھے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" شمسہ نے اس کی طرف جھکتے ہوئے اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ انڈیلی۔۔۔

"بس۔۔۔ یہی سوچ رہا ہوں کہ ایسا کروں یا نہ کروں۔"

"سوچتے ہی رہو گے۔۔۔ کوئی فیصلہ کر ہی ڈالو۔۔۔ تقسیم کا خاکہ تو بنا ہی لیا ہے تم سب نے۔۔۔" شمسہ نے پینترا بدلا۔۔۔ چہرے پر ناخوشگواری کے تاثرات تھے۔۔۔

لہجے میں طنز تھی۔ شاہد بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"سوتیلی ماں اور بہنوں کے لیے اس طرح سوچ رہے ہو—" شمسہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "سگی ہوتیں تو شاید اپنا حصہ بھی انہیں کو دے دیتے—" شاہد نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"سچ کہہ رہی ہوں۔" وہ روٹھنے کے انداز میں بولی۔

"اچھا بھائی جیسے تم کہو گی کر لیتے ہیں—" شاہد نے فیصلہ کر ہی لیا— دونوں کی آنکھوں میں شیطانی چمک بھر گئی— شمسہ دلفریب انداز میں مسکرا دی— شاہد بھی اس مسکراہٹ میں شریک ہو گیا— پھر دونوں سر جوڑ کر پلان بنانے لگے۔

"اس سارے معاملے میں احتیاط بہت ضروری ہے۔ ہم دونوں کے علاوہ کسی کو اس منصوبے کی خبر نہ ہو—"

"میری اماں تو جانتی ہیں—"

"انہوں نے تو تجویز کیا ہے نا—"

"ہاں۔"

"بس اس سے آگے ان سے کوئی بات نہ کرنا— جب تک ساری جائیداد میں اپنے نام منتقل نہ کروا لوں— یعنی رجسٹریاں نہ ہو جائیں' ان کو بھی خبر نہیں ہونا چاہیے—"

"نہیں ہو گی— رجسٹریاں ہو جانے کے بعد بھی کسی کو بتانے کی کیا ضرورت ہے—"

"بالکل—"

"ایک بات ہے۔"

"تمہاری اماں رجسٹریاں دیکھیں گی تو ضرور— بار بار تاکید ایسے ہی تو نہیں کر رہیں کہ ہر ایک کے نام الگ الگ رجسٹریاں ہو جائیں—"

"یہ فکر تو اس وقت تک ہے جب تک ساری رجسٹریاں میرے نام نہیں ہو جاتیں— ایک بار ہو جائیں تو پھر—"

"پھر۔"

دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

اگلے دن شاہد نے مختار نامے کے کاغذات بنوانے کی دوڑ دھوپ شروع

کر دی— صابرہ' ربیعہ اور صبیحہ نے اسے اپنا مختارِ کُل بنانے کے لیے اختیار دے دیا۔ کاغذات پر دستخط کر دیے— شاہد اور شمسہ کے چہرے چمک اٹھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو جس انداز میں دیکھا— وہ بڑا معنی خیز تھا— صابرہ اور صبیحہ نے تو دھیان نہیں دیا لیکن ربیعہ کو یہ بات کھلنے لگی— ان کے اٹھ کر جانے کے بعد اس نے امی سے کہا:

"بھائی جان اور بھابی کے تیور ٹھیک نہیں لگتے—"

صبیحہ صابرہ سے پہلے ہی بول اٹھی۔ "تم کتنی وہمی اور شکی مزاج ہو گئی ہو۔"

"میری چھٹی حس کہتی ہے کہ یہ لوگ مخلص نہیں ہم سے— کچھ نہ کچھ فتور ڈالیں گے۔"

"بیٹی!" صابرہ نے کہا۔ "ہماری نیت صاف ہے ہم نے اللہ پر بھروسہ کر کے شاہد کو مختار نامہ دیا ہے۔ اگر وہ بدنیت ہو جائے تو—"

"نہیں امی— اب بھائی جان اتنے بھی کٹھور نہیں ہیں۔" صبیحہ نے جھٹ سے کہا۔

ربیعہ نے کندھے اُچکائے اور بولی۔ "پتہ نہیں کیوں مجھے ان پر اعتماد نہیں—"

"یہ بکھیڑے بھی تو سمیٹنے تھے نا— کسی کو تو مختار بننا ہی تھا۔ پھر بیٹی ایسی بھی اندھیر نگری نہیں۔

"ہم نے جائیداد کی تقسیم شاہد کی مرضی اور خوشی سے کی ہے— زیادہ قیمتی جائیداد اسے دے دی۔"

"ہوں۔" ربیعہ خاموش ہو گئی۔

"اللہ مالک ہے امی' وہموں اور وسوسوں میں نہ پڑو۔ ہم بے سہارا نہیں ہیں۔ یتیموں اور بیواؤں کا سہارا اللہ تعالیٰ خود ہے—"

صابرہ کو اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے ناامیدی نہیں تھی۔ شاہد کو مختار نامہ مل گیا تھا— اب جائیداد اور فیکٹری کی رجسٹریاں جو زاہد احمد کے نام تھیں اس نے اپنے نام منتقل کروانا تھیں— بینک سے پیسہ نکلوانا تھا— جو لگ بھگ سینتیس ہزار تھا۔ سب سے پہلے اس نے بینک سے پیسہ نکلوایا۔

"یہ پیسہ سب میں تقسیم کر دو—" شمسہ نے تجویز پیش کی۔ شاہد نے اس کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ ادائے دلربائی سے مسکراتے ہوئے بولی۔ "جناب اس میں سے امی' ربیعہ اور صبیحہ کا جتنا حصہ بنتا ہے پورا پورا دے دو۔ بلکہ میری مانو تو سارا

پیسہ امی کے سامنے رکھ کر نیاز مندی اور فرمانبرداری سے کہا امی آپ خود اپنے ہاتھ سے سب کے حصے الگ الگ کر دیں۔

"ٹھیک ہے—"

"امی ربیعہ اور صبیحہ پر تمہاری دیانت داری اور نیک نیتی کا اچھا اثر پڑے گا—" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"واقعی—" شاہد بھی ہنس پڑا۔

"اصل چیز تو جائیداد ہے۔ جائیداد جو ساری کی ساری ہماری ہو جائے گی—" وہ فرطِ مسرت سے جھوم گئی۔ شاہد نے ایسا ہی کیا۔ بڑی سعادت مندی سے ماں کو رقم دیتے ہوئے کہا۔ "آپ خود ہی اسے تقسیم کر دیں—"

صبیحہ اور صابرہ نے ربیعہ کی طرف دیکھا' نظروں ہی نظروں میں سرزنش کی— بیکار میں وہ شک کر رہی تھی شاہد پر— اپنا حصہ لے کر شاہد اور شمسہ اپنے بیڈروم میں آئے تو شمسہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔ "دیکھا کتنا اچھا اثر پڑا ان پر—"

"ہاں—"

"دل جیت لیے ان کے—"

"واقعی—"

"داد دو ہمیں—"

شاہد نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ "واقعی داد کے قابل ہیں تمہارے پلان— اب تو باقی کام سہل ہو گئے ساری جائیداد اپنی— کیوں؟ سب سے پہلے گاڑی خریدوں گا اپنی میم صاحبہ کے لیے— ایک کنال زمین فوری طور پر بیچ دیں گے— کافی قیمت ملے گی اس کی—"

"اچھا— اچھا— خرید لیں گے گاڑی بھی— پہلے جائیداد اپنے نام کروا لو تو لو—"

"وہ تو سمجھو ہو گئی— کل ہی کاغذات خریدنے کے لیے پیسے جمع کروا دوں گا— اور ایک دن میں رجسٹریاں لکھی جائیں گی— بس— پھر ایک دن کا کام ہے رجسٹری کروانا— سب کام پکا—"

دوسرے ہی دن شاہد کچہری گیا۔ کاغذات کے لیے خزانے میں پیسے جمع کرائے۔ منشی رحمت دین عرضی نویس سے رجسٹریاں لکھوانا تھیں۔ دوسرے دن

کاغذات مل گئے۔ شاہد نے اپنی مرضی کے مطابق کوٹھی' دکانوں' زمین اور فیکٹری کی رجسٹریاں اپنے نام لکھوائیں۔

"یہ مرحلہ تو طے ہو گیا۔" اس نے گھر آتے ہی شمسہ کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا— "بس اب رجسٹریاں کروانی ہیں—"

"کس دن ہوں گی—"

"پرسوں۔"

شمسہ خوشی سے چہکتے ہوئے بولی "آہا— لاکھوں کے مالک ہو جائیں گے ہم— ساری کی ساری جائیداد ہماری ہو جائے گی۔"

"ہماری اور ہمارے بچوں کی۔" شاہد نے کہا۔

"بالکل— بچوں ہی کے لیے تو کر رہے ہیں سب کچھ—" وہ اس کے ہاتھوں میں ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"رازداری سے کام لینا۔ بھولنا نہیں۔ کسی کے کانوں میں بھنک بھی نہ پڑے سمجھیں— کہیں خوشی سے بہک کر اُگل ہی ڈالو ساری بات۔"

"جی میں اتنی پاگل بھی نہیں—"

"تھوڑی سی ہو—" شاہد ہنس پڑا— شمسہ بھی مسکرا دی۔

"امی نے کچھ پوچھا تو نہیں—" قدرے توقف کے بعد شمسہ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے سرگوشی کے سے انداز میں پوچھا۔

"نہیں کوئی خاص نہیں— صرف اتنا ہی پوچھا تھا— رجسٹریاں لکھی جا چکیں یا نہیں—"

"ٹھیک ہے انہیں گول مول سا جواب دے دینا تھا—"

"دے دیا— وہ مطمئن ہیں—"

وہ ہنس پڑی— شیطان پوری قوت سے ان دونوں پر مسلّط ہو چکا تھا۔ حقداروں کا حق چھین لینے اور غاصب بن کر یتیموں اور بیوہ کا مال ہڑپ کرنے کی خوشی سے دونوں بہک رہے تھے۔ ضمیر نامی کوئی شے ان کے اندر نہ رہی تھی— اسے تو موت کی نیند سلا دیا تھا۔ اعمال کے محاسبے کا ڈر ہی نہ تھا۔ لیکن محاسبہ کرنے والا تو اوپر بیٹھا تھا— سب کچھ دیکھ رہا تھا— یتیم بچیوں اور بیوہ ماں کی حفاظت اسی نے کرنا تھی۔ اپنی عظمت اور بڑائی

اور اپنی سچائی اور حقیقت کا احساس دلانا تھا اس نے ۔۔۔ وہ ہر چیز کو دیکھتا اور جانتا ہے ۔۔۔ اس کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔ بعض اوقات تو دیر بھی نہیں ہوتی ۔۔۔ وہ حق و انصاف کے تقاضے پورے کرنے میں تاخیر نہیں کرتا۔

شاہد اس دن گھر سے شاداں و فرحاں نکلا۔ پنکی اور منوں کو پیار کیا۔

وہ ان کا مستقبل تابناک بنانے جا رہا تھا۔ وہ منشی رحمت دین سے لکھی ہوئی رجسٹریاں لے کر رجسٹرار کے دفتر چل دیا۔ لیکن وہاں پہنچ نہیں پایا۔ سڑک عبور کرتے ہوئے ایک تیز رفتار گاڑی سے ٹکرا کر دور جا گرا۔ لوگ اکٹھے ہوگئے ۔۔۔ وہ بری طرح زخمی تھا ۔۔۔ سر سے خون بہہ رہا تھا ۔۔۔ اسے فوری طور پر ہسپتال پہنچایا گیا ۔۔۔ جہاں اس نے بے ہوشی ہی کے عالم میں دم توڑ دیا۔ لاش کے ساتھ اس کا اعمال نامہ' وہ رجسٹریوں والا بیگ بھی گھر پہنچا دیا گیا ۔۔۔ شمسہ تو صدمے سے نڈھال تھی۔ بیگ ربیعہ نے لے کر سیف میں رکھ دیا ۔۔۔ اس وقت تو قیامت بپا تھی ۔۔۔ طوفان ٹوٹ پڑے تھے ۔۔۔ شاہد بیوی اور بچوں کا مستقبل تابناک بنانے کے لیے گھر سے نکلا تھا لیکن اس اندوہناک انجام سے دوچار ہو گیا۔ مصلحتوں کو جاننے والی تو باری تعالیٰ کی ذات ہی ہے لیکن اس معاملے میں لالچ کی جو سزا ملی تھی وہ عبرت ناک تھی۔

کئی دنوں بعد جب صابرہ نے رجسٹریاں اس غرض سے نکالیں کہ حق حقداروں کو مل جائے اور شاہد کا ترکہ اس کے بیوی بچوں کے کام آئے جو قانونی کارروائی کرنی ہو کر لیں۔ اسی لیے انہوں نے وکیل کی خدمات حاصل کیں ۔۔۔ سارا معاملہ اسے سمجھایا ۔۔۔ شاہد کا حصہ اس کے بیوی بچوں کے نام کرنے کی بات کی۔ لیکن جب وکیل نے رجسٹریاں دیکھیں تو ششدر رہ گیا۔ اس نے صابرہ کو بتایا کہ شاہد نے ساری جائیداد اپنے نام منتقل کروانا تھی ۔۔۔ رجسٹریاں لکھی تو گئی تھیں لیکن رجسٹر ہو کر داخل دفتر نہ ہو سکی تھیں ۔۔۔ دھوکے اور فریب کا پول کھل چکا تھا۔ یتیموں اور بیوہ کا حق قدرت نے بچا لیا تھا۔ اس انکشاف نے دل دہلا دیے تھے۔ ہر کوئی ششدر تھا۔ شاہد کی خود غرضی اور عبرتناک انجام سے متاثر تھا۔

یہ تو صابرہ کی شرافت تھی' خداخوفی تھی' نرم دلی تھی کہ اس نے شاہد کا پورا حصہ اس کے بیوی بچوں کے نام کر دیا۔ چھوٹے چھوٹے یتیم بچوں اور جوان بیوہ کا مستقبل کم از کم مالی لحاظ سے اس نے محفوظ کر دیا تھا۔

تلاش

میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ میرے چہرے پر بڑی ٹھہری ہوئی سنجیدگی تھی ۔۔۔ کنپٹیوں کے سفید بالوں میں چند سفید بالوں کا اور اضافہ ہو گیا تھا ۔۔۔

"اب بھی وقت ہے شادی کر لو ۔۔۔" میرے دوستوں کی آوازیں کانوں میں اتر رہی تھیں ۔۔۔ "کیا بوڑھے ہو کر گھر بسانے کی نیت ہے یہاں کی عورت پر اعتماد نہیں تو وطن چلے جاؤ ۔۔۔ دیس کی کسی وفاشعار لڑکی کا ہاتھ تھام لو ۔۔۔"

میں اپنے خوش سلیقگی سے آراستہ اپارٹمنٹ میں قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا تھا ۔۔۔ جسمانی لحاظ سے میں ٹھیک ٹھاک تھا ۔۔۔ دراز قد تھا جسم سمارٹ تھا ۔۔۔ اڑتیس سال کی عمر میں بھی جوان دکھائی دیتا تھا ۔۔۔ چہرے کی سنجیدگی اور کنپٹیوں میں بالوں کی اترتی سفیدی نے میری شخصیت کو نکھار دیا تھا ۔۔۔ خاصہ مدبّر اور باوقار لگتا تھا۔

میں نے اب تک شادی نہیں کی تھی یہ بات نہیں کہ میں عورتوں کے لیے درخوراعتنا نہیں تھا۔ عورتیں تو میری جاذبِ نظر شخصیت پر مرتی تھیں اور میں رہ بھی ایسے ملک میں رہا تھا جہاں آمادگی ہو تو عورت مرد کے تعلقات پر کوئی قدغن نہیں ہوتی ۔۔۔ پھر میرے پاس دولت بھی تھی ۔۔۔ یہ میری دلفریب شخصیت کا روپہلی منظر تھا ۔۔۔ اس لیے عورتوں اور لڑکیوں کا جھکاؤ میری طرف قدرتی تھا۔

لیکن

میں نے ان لڑکیوں اور عورتوں کو اگر کبھی لفٹ دی بھی تو صرف دوستی کی حد

تک — اس سے آگے نہ کبھی خود بڑھا نہ انہیں بڑھنے دیا — شادی کا میرا اپنا ہی تصو
تھا — اور اس تصور پر یہ سنہری سنہری پھسلی مچھلیاں کبھی پورا نہ اتر پاتی تھیں۔

ان میں سے بہت سی لڑکیاں مجھ سے شادی کرنے کے لیے اپنی مسحور کن شخصیات کا جادو بھی ڈال چکی تھیں۔

وہ سیاہ آنکھوں والی لڑکی ماریہ تو میرے بہت قریب آگئی تھی۔ اس لڑکی میں کچھ کچھ مشرقیت کی بھی جھلک تھی۔ اس کے آباؤ اجداد عرب تھے — لیکن یورپی تہذیب اس پر پوری طرح اثر انداز تھی — اس کی ماں اپنے شوہر سے ایک معمولی سے تنازعے پر طلاق لے چکی تھی۔ ماریہ انگلینڈ میں زیر تعلیم تھی — فاضل وقت میں نوکری کر کے اپنا بار اٹھائے تھی — اس نے ایک دن مجھ سے کہا تھا —

"جیفر تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے —"

میں نے ہنس کر اس کی بات ٹال دی تھی اور ذو معنی انداز میں بولا تھا:

"اس لیے کہ تم میرا نام بھی ٹھیک طرح سے نہیں بلا سکتیں۔ میرا نام جیفر نہیں جعفر ہے۔"

اس نے اپنی طرف سے پوری کوشش کرتے ہوئے کہا:

"جافر —"

میں نے ہنس کر نفی میں سر ہلایا — "جافر — نہیں — جعفر اور میں جانتا ہوں کہ تمہارا تلفظ کبھی بھی صحیح نہیں ہوگا۔"

"اس سے کیا فرق پڑے گا۔"

"دو تہذیبیں ٹکرا جائیں گی — اور ٹکرانا ہمیشہ ہی خطرناک ہوتا ہے — مجھے ٹکراؤ پسند نہیں —"

وہ حیرانگی سے میرا منہ تکنے لگی۔

میں نے مسکرا کر کہا:

"کیا یہ کافی نہیں کہ ہم اچھے دوست ہیں۔"

"وہ چپ ہو گئی —"

اس طرح اس طلاق یافتہ حسین و جمیل آئرش عورت نے بھی مجھے شادی کی پیشکش کی — اس نے میری بے حد تعریف کرنے کے بعد کہا۔ "مجھے مشرقی لوگ بہت پسند ہیں —"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ شادی کو ایک مقدس بندھن سمجھتے ہیں —"

"کیا تم اس بات کی قدر کرتی ہو۔"

"ہاں"

"تو پھر تم نے جیمز کو کیوں چھوڑ دیا۔ اس مقدس بندھن کی تم نے کیوں قدر نہ کی —"

وہ ٹپٹائی لیکن اپنی صفائی میں بہت کچھ کہہ گئی۔

اینگلو پاکستانی شالی نے بھی مجھ سے شادی کی درخواست کی — اس کی انگریز ماں اور پاکستانی باپ کی خوب نبھ رہی تھی لیکن شالی اس مقام پر کھڑی تھی کہ نہ وہ مشرق کی رہی تھی نہ مغرب کی — اور یہ بین بین لٹکتی لڑکیاں ہمیشہ بٹی بٹی رہتی ہیں — بٹی بٹی — بکھری بکھری — میں نے اس کا پیغام بھی شانت سے لیکن خوشگوار موڈ میں لوٹا دیا تھا۔

میرے پاکستانی اور ہندوستانی دوست مجھ سے نالاں تھے۔ کئی جگہ انہوں نے میرے لیے کوشش کی تھی۔ یہاں بہت سے ہندوستانی اور پاکستانی خاندان آباد تھے — اور میرے دوست چاہتے تھے۔ کم از کم ایک خاندان کا تو میں یوں بوجھ ہلکا کر دوں۔ لیکن میں کسی کی نہ سن سکا — یہ خاندان بھی آدھے تیتر آدھے بٹیر تھے۔ ان کی لڑکیاں اس حد تک کنفیوز تھیں کہ بعض تو ابنارمل لگتی تھیں۔ گویا والدین کا المیہ تھا وہ گھر میں انہیں اپنی تہذیب کا ورثہ دیتے تھے۔ ان خطوط پر چلانے کی کوشش کرتے تھے جو ان کا اپنا تشخص ابھار سکتے تھے۔ لیکن ان کی تعلیم' ان کا ماحول اور گھر سے باہر کی دنیا ان خطوط اور تہذیبی ورثے سے ٹکراتی تھیں جس سے یہ لڑکیاں ادھر کی تھیں نہ اُدھر کی۔

میں مین میخ نکالتا تو دوست جھلا کر کہتے۔ "تو پھر وطن چلے جاؤ کسی گاؤں کی سیدھی سادی لڑکی اٹھا لاؤ یہاں —"

"یہاں کیوں اٹھا لاؤں؟"

"تو پھر۔"

"میں شادی وطن جا کر ہی کروں گا اور شادی کر لی تو پھر یہاں نہیں آؤں گا — آیا بھی تو صرف بیوی کو گھمانے پھرانے کے لیے آؤں گا۔"

"تم اپنے آپ کو اب وہاں ایڈجسٹ کر لو گے۔"

"کیوں نہیں — جس مٹی سے میرا خمیر اٹھا ہے اس میں مل جانے میں کیا

پرابلم ہو سکتی ہے۔"

"تم تقریباً اٹھارہ سال سے یورپی ملکوں میں گھوم رہے ہو۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔" یہاں گھومنے کا ایک مقصد تھا— پیسہ کمانا— وہ کما لیا—"

یہ تمہارا خیال ہی ہے تم زندگی کی جس ڈگر پہ یہاں چلنے لگے ہو— وہاں نہیں ہوگی بالکل متضاد ہے۔ تم چند ماہ تو وہاں گزار سکتے ہو لیکن ساری عمر نہیں—"

میں نہیں مانتا— میرے اندر کا انسان ان اٹھارہ سالوں میں کہاں بدلا تھا۔

اور

اسی نہ بدلنے والے انسان ہی سے تو میں خائف تھا جو یہاں شادی نہیں کرپا رہا تھا— کوئی لڑکی میرے معیار پر پوری نہیں اتر رہی تھی— غیر ملکی لڑکیوں سے میں لاشعوری طور پر خوفزدہ تھا۔ ان لڑکیوں کی وفاشعاری میری نظر میں مشتبہ تھی— حالانکہ میرے سامنے کئی مثالیں تھیں۔ میرے دوست ناصر نے جس جرمن عورت سے شادی کی تھی— تیرہ سالوں میں اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ اک شوہر پرست باوفا بیوی ہے۔ ایک ہندو دوست شرما نے بھی اک سوِز لڑکی سے شادی کی تھی— وہ تو بالکل ہندوستانی بن گئی تھی۔

لیکن

اس جذبۂ وفا سے چند عورتیں ہی سرشار دیکھی تھیں۔ ان گنت مثالیں سامنے تھیں۔ طلاق یافتہ عورتوں اور مردوں کی کمی نہ تھی— بالکل معمولی باتوں پہ طلاق کا مطالبہ ہو جاتا تھا— عورت کو مرد کی بالادستی پسند نہ تھی۔ مرد عورت کو اپنے سے بڑھ کر نہیں سمجھتا تھا— پھر— صرف یہی المیہ نہیں تھا— عادات کا معمولی سا اختلاف بعض اوقات طلاق کا موجب بن جاتا—

میرے اندر خوف تھا—

میں اس ماحول اور معاشرے میں شادی کر کے کبھی فِٹ نہیں ہو سکتا تھا۔
میرے ذہن میں تو عورت کا تصور اور امیج ہی اور تھا۔

اس تصور اور امیج پر اترنے والی بے شمار عورتیں مَیں نے اپنے دیس میں دیکھی تھیں۔

بڑی مثال تو میری اپنی ماں تھی—

میں صرف ایک برس کا تھا اور میری ماں صرف انیس برس کی۔ جب میرا باپ

فوت ہو گیا تھا۔ شادی کے دو برس بعد ہی میری ماں نے بیوگی کی سفید چادر اوڑھ لی تھی—

پھر

اس سفید چادر کو بے داغ رکھے میری ماں نے اپنی پوری زندگی میرے باپ کے نام پر زندہ رہ کر گزار دی تھی۔ اس کو جانے کن کن مشکلوں سے گزرنا پڑا تھا۔

مجھے پال پوس کر جوان کیا تھا۔ اعلیٰ تعلیم دلائی تھی۔ یہ وہی جانتی تھی۔ کسی تکلیف، کسی اذیت، کسی کرب کا ذکر کر دینا آسان ہے۔

لیکن

ان سے نپٹ کر وقت گزارنا انتہائی مشکل اور حوصلہ شکنی ہے۔ اس راہ سے وہی سرخرو ہو کر گزر سکتے ہیں جن کے ہاتھوں میں صبر کا دامن ہوتا ہے اور وفا کی روشنی ہوتی ہے۔

میری ماں کی ذات کا مجھ پر بہت اثر تھا— شاید عورت کے تصور اور امیج کی جڑیں یہیں کہیں میری ماں کی ذات ہی سے پھوٹتی تھیں۔

پھر

وہ آپا سینہ بھی تھیں جن سے میں بے حد متاثر تھا۔ سینہ آپا کو شادی کے تیسرے سال ہی طلاق ہو گئی تھی۔ وہ بالکل بے قصور تھیں۔ لیکن سعید ملک نے اس فرشتہ خصلت عورت کو طلاق کا داغ دے کر الگ کر دیا تھا۔ طلاق پا کر بھی سینہ آپا نے اپنی زندگی سعید ملک کے نام پر ہی گزار دی تھی۔

ایسی کئی مثالیں تھیں جو میرے ذہن پر اپنے گہرے اور انمٹ نقوش ڈالے تھیں۔ ظلم سہہ کر بھی وفا نبھانے کی مثالیں۔ میرے اپنے ہی خاندان میں موجود تھیں۔
نجمہ بھابی اور عائشہ چچی کو میں اب تک بھولا نہیں تھا— انہی خواتین نے میرے ذہن میں عورت کا امیج بنا دیا تھا۔ اور یہ بات بھی میرے ذہن میں پکی کر دی تھی کہ دنیا کے کسی گوشے میں مجھے اس عورت کا سراغ نہیں مل سکے گا۔ مل سکے گا تو صرف اور صرف اپنے وطن میں۔
چنانچہ میں اس عورت کی تلاش میں اپنے وطن لوٹنے پر آمادہ ہو گیا۔ واقعی اب عمر ڈھلتی جا رہی تھی مجھے شادی کر لینا چاہیے تھی— گھر بسا کر اک مصروف زندگی گزارنا چاہیے تھی۔

میں بیس برس کی عمر میں گھر سے نکلا تھا۔ ایم اے کرنے کے بعد نوکری کی تلاش میں زیادہ سرگرداں نہیں ہوا۔ اپنی قسمت ملک سے باہر آزمانے کا میں نے تہیہ کر لیا— ماں کو بڑی مشکل سے راضی کیا۔ میرے بہترین مستقبل کے لیے اس نے اپنی ممتا پر صبر

کی سیل رکھ کر مجھے اجازت دے دی۔

میں ملک سے نکلا تو کہیں ایک جگہ قیام نہ کر سکا—— دوبئی سے قطر پھر کویت اور سعودی عرب گیا۔ پیسے تو بہت کمائے لیکن قرار نہیں آیا—— یہاں سے میں یورپ چلا گیا—— جرمنی میں کچھ عرصہ قیام کیا—— فرانس بھی رہا——

یوں زندگی کے دس قیمتی سال بیت گئے—— ماں کو میں کافی رقم بھیجتا تھا۔ اور وہ میری شادی کی تیاریوں میں لگی رہتی—— میں ہر سال باقاعدگی سے اسے ملنے جاتا اور اگلے سال آکر شادی کرنے کا وعدہ کر کے چلا آتا۔ میں ماں سے کہتا۔ "فکر نہ کر ماں—— شادی میں پاکستان ہی میں کروں گا—— بس تھوڑا سا اور کما لوں۔" "کمائی کرنے کو عمر پڑی ہے بیٹا! اب اس قابل تو ہو گئے ہو کہ اپنا اور بیوی بچوں کا بار اٹھا سکو—— شادی کر ہی ڈالو——"

"کروں گا——"

"کب؟ جب میں اس دنیا میں نہیں ہوں گی۔"

"تو ضرور ہو گی ماں—— میں بھلا تجھے ایسے ہی جانے دوں گا—— تو تُو پوتے کھلائے گی ماں—— میرے بچوں کی دادی بنے گی۔"

لیکن

ماں میرے سہرے کے پھولوں کا ارمان لے کر ہی چل بسی—— اچانک ہی سفرِ آخرت پر چل پڑی—— مجھے دکھ تو بہت ہوا—— لیکن اللہ کو یہی منظور تھا——

ماں کے مرنے کے بعد میں انگلینڈ چلا آیا—— یہاں میں نے قدم جمائے' کاروبار شروع کیا اور اب میں اک مستحکم حیثیت کا مالک تھا——

میں نے واپسی کی تیاری شروع کر دی—— دوستوں کو پتہ چلا تو بھاگے آئے—— خوشی کا اظہار کیا—— قریبی دوستوں نے اصرار کیا۔ "شادی کر کے جلدی لوٹ آنا—— وہیں نہ بیٹھ جانا——"

"لوٹ آؤں گا—— اپنی بیوی کو ساری دنیا کی سیر کروانے کے بعد ہی یہ کاروبار سمیٹوں گا نا—— یہ میں تہیہ کر چکا ہوں—— کہ اب زیادہ عرصہ پردیس میں نہیں رہوں گا۔"

"دیکھ لیں گے—— ہو سکتا ہے تمہاری بیوی اس ماحول میں خوشی سے رہنا قبول کر لے——"

"نہیں یار—— تھک گیا ہوں—— اسی اجنبی ماحول میں بھٹکتے۔ اب اپنے گوشہ

عافیت میں چین سے رہنا چاہتا ہوں——"

"چلو پہلے جا کر اپنی من پسند لڑکی تو تلاش کرو——"

"مجھے یقین ہے—— مجھے اس کے لیے زیادہ کوشش نہیں کرنا پڑے گی—— میرے ملک میں میرے معیار پر اترنے والی لڑکیوں کی کمی نہیں ہو گی——"

دوستوں نے خلوصِ دل سے دعائیں کیں اور میں ان دعاؤں کے سائے میں اپنی منزل تلاش کرنے اپنے دیس لوٹ آیا۔

میرے گھر کے دروازے کھلے تھے—— ماں کے مرنے کے بعد عائشہ چچی یہاں رہ رہی تھیں۔ میری واپسی سے شاید میرے اہلِ خاندان مایوس ہو چکے تھے—— اسی لیے تو سب نے تعجب بھری مسرت سے میرا استقبال کیا۔ خاندان کے بچے—— بزرگ—— دور پار کے کزن—— خالائیں' ممانیاں ان کی بہو بیٹیاں جس' نے بھی سنا ملنے کے لیے چلے آئے—— محلے کے پرانے لوگوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا اور بچپن کے دوست بھی خلوص سے ملے—— میں یہ محبت اور خلوص پا کر سرشار ہو گیا۔

دو تین دن گہما گہمی میں گزرے۔

اس رات میں عائشہ چچی کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ وہ بولیں۔

"چھوڑو ساری باتیں۔ یہ بتا گھر بسا لیا ہے——"

"گھر بسانے ہی آیا ہوں چچی——"

"سچ!"

"ہاں۔"

"تو تُو نے وہاں کسی میم ویم سے شادی نہیں کی——"

"اپنے ملک میں میموں کی کمی ہے کیا چچی——" میں نے ہنس کر کہا—— تو چچی کچھ سوچتے ہوئے بولیں:

"اتنی عمر یونہی گزار دی؟"

میں مسکرا کر بولا۔ "بہت بوڑھا ہو گیا ہوں——؟"

چچی میری بلائیں لیتے ہوئے بولی۔ "بوڑھا تو نہیں—— لیکن شادی کی عمر نکال ہی آیا ہے——"

پھر چچی مجھ سے اسی سلسلے میں باتیں کرنے لگی—— آٹھ دس لڑکیاں انہوں

نے گنوادیں—— جن کے والدین اچھے رشتے کی تلاش میں چشم براہ تھے۔

"چچی۔" میں نے تفصیلات سننے کے بعد کہا۔

"ہاں!"

"لڑکی کی عمر پچیس تیس سال ہو کم از کم۔"

میری بات پر چچی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "پچیس تیس سال کی عورت ہوتی ہے لڑکی نہیں——"

"تو پھر عورت ہی تلاش کیجیے——"

لیکن مجھے اس تلاش میں کسی کا ممنونِ احسان ہونا نہیں پڑا۔ وہ خود ہی مجھے مل گئی۔

اسے میں نے پہلی نظر میں دیکھا۔ وہ بیحد حسین تھی۔ عمر کی پختگی میں بھی اک معصوم حسن تھا۔ وہ میرے اندازے کے مطابق ستائیس اٹھائیس برس کی ہو گی۔ اس نے مجھے پہلی نظر ہی میں متاثر و مرعوب کر لیا۔ وہ ایک بھاری بھرکم عورت کے ساتھ بیٹھی چائے پی رہی تھی۔

وہ وقت اور زمانے کی بھیڑ میں گم بھی ہو سکتی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ دوسرے دن میں نے اسے ایک کتابوں کی دکان پر دیکھا۔ اور اسی شام میں نے اسے ہلٹن کے ڈائننگ ہال کے ایک کونے والی میز پر سرنگیں ہوئے پایا۔ تو بے اختیارانہ میرے قدم اس کی میز کی طرف اٹھ گئے۔

اس نے حیرانگی سے میری طرف دیکھا۔ میں اس کی نگاہوں کے سحر میں کھو سا گیا۔

میں بنا اس کی اجازت کے میز کی دوسری طرف کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

تو

وہ اک اجنبی کی اس جسارت پر شاید حیران رہ گئی—— گھبرا کر بولی۔

"آپ؟"

"میرا نام جعفر ہے۔ میں نے کہا شاید آپ کسی کا انتظار کر رہی تھیں؟"

"یقیناً آپ کا نہیں——" وہ جلدی سے بولی۔

"لیکن میں آپ سے ملنا چاہتا تھا——"

"کیوں؟"

"پتہ نہیں——"

میری بات پر وہ ہنسی نہ مسکرائی۔ سنجیدگی سے بولی۔ "میں اپنی آنٹی کا انتظار کر رہی ہوں۔"

میں اس کا مقصد سمجھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ "کل سے میں نے آپ کو اس وقت تک تیسری مرتبہ دیکھا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ از خود ہی نکل آیا کہ مجھے آپ سے ملنے کی وقت اور حالات نے خود ہی چھوٹ دے دی ہے۔ میں صرف آپ سے آپ کا نام پوچھوں گا۔ بتا دیں گی—— میں صرف نام——"

وہ حیرانگی سے میرا منہ تکنے لگی۔ کچھ پریشان بھی ہو رہی تھی۔ اس کا پریشان حسن میرے دل کو اپنے شکنجے میں اور مضبوطی سے جکڑنے لگا تھا۔

پھر میں نے کہا۔ "مجھے غلط مت سمجھیے۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔" میں نے مختصراً بیرون ملک سے آنے کا مدعا بیان کیا۔ میری جسارت شاید اس کے لیے صبر آزما تھی۔

اسی لمحے اس کی ادھیڑ عمر بھاری بھرکم فیشن ایبل سی آنٹی آ گئی۔ میری طرف دیکھا اور پھر حیرانگی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ——"

"مان نہ مان میں تیرا مہمان——" اس کی بجائے میں نے خود کہا۔ آنٹی بڑی خوش مزاج عورت تھی۔ میں اٹھنے لگا تو رسانیت سے بولی بیٹھیے۔ شاید آپ نیرا کے جاننے——"

"بالکل نہیں۔" میں بولا—— "ویسے شکریہ مجھے ان محترمہ کا صرف نام ہی معلوم کرنا تھا سو معلوم ہو گیا۔ سوری—— میں نے آپ لوگوں کو ڈسٹرب کیا۔"

میں اٹھنے لگا تو پھر آنٹی نے بیٹھنے کو کہا۔ مسکرا کر بولیں۔ "مہمان بنے ہی ہیں تو کھانا بھی ہمارے ساتھ کھا لیجیے۔" میں نے معذرت کی تو وہ بے تکلفی سے بولیں۔ "خود مہمان بننے کی جرأت کی ہے۔ اب کھانا کھانا پڑے گا۔"

"مس نیرا——" میں نے اس کی سادگی سے اس کے مس ہونے کا اندازہ لگایا تھا۔

وہ چونکی—— مجھے دیکھا اور پھر اپنی حسین آنکھیں جھکا لیں—— میں نے جلدی سے اپنے متعلق اس کی آنٹی کو مختصراً بتایا—— آنٹی جلد بے تکلف ہو جانے والی عورتوں میں سے تھی۔

کھانا کھاتے میں بھی اس کی آنٹی سے خاصہ بے تکلف ہو چکا تھا۔ وہ مجھے بڑی جہاندیدہ نظروں سے جانچ پرکھ رہی تھی۔ اور جس کسوٹی پر پرکھ رہی تھیں، اس کا مجھے اندازہ ہو رہا تھا۔

اس نے مجھے گھر آنے کی دعوت دی۔

میں اگلی شام ان کے گھر بیٹھا تھا۔ نیرا بھی وہیں تھی۔ ہماری گفتگو میں وہ بہت کم حصہ لے رہی تھی۔ دوسرے دن میں پھر آنٹی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور ہر روز جانے لگا۔ اس دن میرا مکمل انٹرویو لیا۔ میں نے بھی پوری روئیداد بیان کر دی۔ اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے صرف خلوص اور پیار چاہیے۔۔۔ وفا کی طلب مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔“ آنٹی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تم اچھے آدمی ہو۔“

”شکریہ۔“

”شادی کرنے کا پکا ارادہ ہے۔“

”جی بالکل۔۔۔“

”نیرا کے علاوہ بھی لڑکیاں دیکھی ہوں گی۔“

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میرے عزیزوں رشتہ داروں نے ضرور دیکھی ہیں۔ لیکن میں نے صرف نیرا کو دیکھا ہے۔ اور پہلی نظر ہی میں فیصلہ آپوں آپ ہو گیا تھا۔“

”کیا تم سنجیدہ ہو۔۔۔“

”بالکل آنٹی۔۔۔ آپ میرے متعلق کچھ جاننا چاہیں تو میں اپنا لندن کا پتہ دے دیتا ہوں۔ وہاں کئی اور لوگوں کے پتے بھی دے سکتا ہوں۔ آپ پوری چھان بین کر لیں۔ آپ مجھے یقیناً ہر طرح نیرا کے قابل پائیں گی۔“

”لیکن۔۔۔“ وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئیں۔

”کیا آنٹی۔۔۔“

”اچھا پھر کسی دن اس سلسلے میں بات کریں گے۔“

میں اس دن کے انتظار میں روز ہی آنٹی کی خدمت میں حاضر ہونے لگا۔ کسی کسی دن نیرا سے بھی ملاقات ہو جاتی۔

لیکن آنٹی نے ابھی تک مجھے کوئی ڈھنگ کا جواب نہیں دیا تھا۔

اس دن میں نے تہیہ کر لیا کہ آنٹی سے فیصلہ کن بات کروں گا۔ ڈھیروں باتیں کرنے کی بجائے میں نے چھوٹتے ہی کہا ”آنٹی میں نیرا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ مجھے واپس بھی جانا ہے۔ آپ مجھے۔۔۔“ آنٹی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا:

”نیرا کا انتخاب تم نے خود ہی کیا ہے۔“

”ہاں۔۔۔“

”تمہیں قبول ہے وہ۔۔۔“

”یہ بھی پوچھنے کی بات ہے آنٹی۔“

”اس کے متعلق سب کچھ جان لیا ہے۔ پوچھ گچھ کر لی ہے۔“

میں حیرانگی سے آنٹی کا منہ تکنے لگا۔ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ رہا پوچھ گچھ کا سوال تو میں نے اس سلسلے میں کوئی قدم ہی کب اٹھایا تھا۔ میں تو اسے دیکھ کر ہی دل ہار بیٹھا تھا۔ صرف یہی جانا تھا کہ وہ بے حد خوبصورت ہے۔ باقی رہی شرافت تو وہ میرے نزدیک مشرقی عورت کا وصف تھی۔ پوچھ گچھ کس بات کی کرنا۔ آنٹی نے سوگوار سا چہرہ بنایا۔ میرا دل دھڑکنا بھولنے لگا۔ آنٹی فوری ہولے ہولے بولیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ نہ ہی نیرا کو ہے۔ اگر تمہیں اعتراض نہیں ہے تو۔۔۔

”کس بات کا اعتراض۔“

”نیرا کو طلاق ہو چکی ہے۔“

ایک لمحہ کو تو میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ لیکن دوسرے لمحہ سینہ آپا کا چہرا میری آنکھوں میں گھوم گیا۔ جو ہمیشہ ہی اس احساس کو تقویت دیتا تھا کہ ہمارے ملک میں مطلقہ عورت ہمیشہ ہی مظلوم ہوتی ہے۔

میں نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور مسکراتے ہوئے آنٹی کو دیکھ کر بولا۔ ”بس اسی لیے آپ اتنے دنوں سے مجھے لٹکا رہی تھیں۔ آنٹی نیرا مجھے ہر حال میں چاہیے طلاق سے کوئی فرق۔۔۔“

میں خوشی سے جھولتے ہوئے جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا۔

آنٹی نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ شاید نیرا کی شادی اور طلاق کا پورا قصہ سنانا چاہتی تھیں۔ میں نے انہیں روک دیا۔۔۔ مجھے سب سننے کی کیا ضرورت تھی۔ میری آنکھوں میں تو شعلے سجیلے خواب اتر رہے تھے۔ رنگین و حسین تصور لہرا رہے تھے۔ میرے لیے یہی کافی تھا۔

میں شاداں و فرحاں آنٹی کے گھر سے نکلا اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں ایک پرانے دوست اعظم سے ملاقات ہو گئی۔ ہم دونوں تپاک سے ملے۔ بے اختیاری

سے بغلگیر ہوگئے۔ ایک دوسرے کا حال احوال گرم جوشی سے پوچھنے لگے۔ اور وہ سارے دوستوں کے حال احوال بتانے لگا۔ نسیم کے متعلق بتاتے ہوئے وہ بڑا افسردہ ہوگیا۔

"کیوں خیریت؟"

"جعفر تمہیں سن کر دکھ ہوگا کہ حادثے میں اس کی دونوں ٹانگیں کٹ چکی ہیں۔ بیچارہ معذور ہوگیا ہے۔ وہیل چیئر پر زندگی گزار رہا ہے۔"

"اوہ——" میں نے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔ یہ وحشت ناک خبر واقعی میری برداشت سے باہر تھی۔

اعظم کچھ رکا پھر بولا۔ "اس سے بڑی ٹریجڈی اس کے ساتھ یہ ہوئی کہ بیوی ساتھ چھوڑ گئی۔"

"کیا؟" مجھے اس کی بات پر یقین نہ آیا۔

"ہاں جعفر، بہت بدقسمت نکلا ہمارا دوست—— بیوی نے اس کی معذوری کی وجہ سے طلاق لے لی۔ دو بچوں کو بھی چھوڑ گئی۔" یہ ایک دھچکا تھا جو میرے ذہن کو لگا—— اک مشرقی عورت کا تصور یہ تو نہیں تھا نا—— اعظم کہہ رہا تھا:

"بے حد حسین تھی وہ بھی—— دونوں میں خوب نبھ رہی تھی۔ اعظم تو اس کا دیوانہ تھا۔ لیکن—— وہ معذوری میں اس کا ساتھ نہ نبھا سکی۔ بیچارہ نسیم اپنے آپ کو بھی سنبھال نہیں پاتا۔ دو بچوں کو بھی پال رہا ہے۔ بہت بری حالت ہے اس کی۔"

"اوہ کتنی سفاک ہے وہ عورت۔ ایسی عورت تو میں نے وہاں بھی نہیں دیکھی تھی——"

میں نے بے اختیارانہ کہا۔ مجھے چارلس کی بیوی لز یاد آگئی۔ دونوں میں بالکل نہیں بنتی تھی۔ طلاق ہونے ہی کو تھی کہ چارلس کو فالج کا اٹیک ہوگیا۔ لز سب کچھ بھول گئی۔ اور انسانیت کے ناطے طلاق نہ لی۔ وہ اب گھربار بھی سنبھالے تھی اور مفلوج چارلس کی خبرگیری بھی تن دہی سے کر رہی تھی——

میرا جی بہت برا ہوا—— جتنا خوش میں آنٹی اور نیرا کے ہاں سے آیا تھا—— اتنا ہی نسیم کے متعلق سن کر غمزدہ ہوگیا۔

"اسے دیکھنے چلو گے اس کے گھر۔" اعظم نے پوچھا۔

"ضرور—— جب لے چلو—— میں تیار ہوں۔"

اعظم نے گھڑی دیکھی اور بولا۔ "اس وقت تو نہیں جا سکتے۔ مجھے تمہاری بھابی نے دو ایک چیزیں لانے کا کہا ہے۔ یوں کرو کل یہیں آجانا پانچ بجے کے قریب۔ میں تمہیں لے چلوں گا۔"

دوسرے دن میں پانچ بجے اسی ریسٹورانٹ کے سامنے پہنچ گیا۔ اعظم بھی آگیا۔ وہ گاڑی لے آیا تھا۔

"چلو۔" اس نے کہا۔

"باہر آؤ۔" میں نے کہا۔ "اس کے بچوں کے لیے کچھ تحائف خریدنا چاہتا ہوں۔ ساتھ ہی سٹور ہے آؤ میرے ساتھ۔"

وہ گاڑی بند کر کے آگیا۔ ہم دونوں باتیں کرتے سٹور میں داخل ہوگئے۔

میں ابھی کاؤنٹر کی طرف مڑا ہی تھا کہ اعظم نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جلدی سے کہا:

"دیکھو جعفر وہ—— وہ"

اس نے سٹور کے آخری سرے کی طرف چپکے سے اشارہ کرتے ہوئے کہا——

"وہ—— وہ ہے اس کی بیوی، مطلقہ بیوی جو میک اپ کی چیزیں دیکھ رہی ہے۔ ذلیل عورت—— سنا ہے کوئی نیا شوہر تلاش کر رہی ہے۔ مالدار آسامی ڈھونڈ رہی ہے—— شکار کی تلاش میں روز نکلتی ہے، معصوم اور بے خبر بن کر——"

میں کچھ نہیں سن سکا۔ اعظم کیا کہہ رہا تھا—— کیا نہیں کہہ رہا تھا۔

میرا تو دل، دماغ اور وجود چکرائے جا رہے تھے۔

عورت کا امیج اور تصور جو برسوں سے میرے ذہن میں تھا۔ چور چور ہوگیا تھا۔

کرچی کرچی، ریزہ ریزہ ہوگیا تھا۔

اور یہ چور چور، ریزہ ریزہ، کرچی کرچی مجھے اندر ہی اندر لہولہان کر گیا تھا۔

کیوں کہ۔ کیونکہ

وہ خوبصورت بلا

حسین ناگن

نسیم کی مطلقہ بیوی—— نیرا تھی۔

خواہشوں کے بھنور

پڑھائی سے زیادہ اسے امریکہ دیکھنے کی تمنا تھی۔ اس کے دونوں دوست راحیل اور ثمین امریکہ جا چکے تھے۔ وہ باقاعدگی سے اسے خطوط لکھ لکھ کر وہاں آنے کے لیے اکسا رہے تھے۔ وہاں کی آزاد اور حسین طرز زندگی کا ذکر اتنی خوبصورتی اور پُرکشش انداز میں کیا ہوتا کہ شاہد کا بس نہیں چلتا اڑ کر وہاں پہنچ جائے۔ داخلہ اسے بھی وہاں کی کسی یونیورسٹی میں مل چکا تھا۔ لیکن سوال پیسے کا تھا—— اس کے پاس تو کراچی تک جانے کے لیے پیسے نہ تھے۔ امریکہ تو دُور کی بات تھی——

وہ اک متوسط گھرانے کا فرد تھا۔ چھ بھائی بہنوں میں اس کا دوسرا نمبر تھا۔ دو بہنیں اور دو بھائی اس سے چھوٹے تھے۔ بڑی بہن شکیلہ کی شادی پچھلے سال ہی ہوئی تھی۔ ہیڈ کلرک باپ نے بڑی مشکل سے یہ شادی کی تھی—— سال بھر کا عرصہ ہو گیا تھا۔ لیکن ابھی تک وہ قرضہ نہ چکایا جا سکا تھا جو شکیلہ کی شادی پر لینا پڑا تھا—— چھوٹی دونوں بہنیں بھی جوان تھیں۔ رملہ میٹرک کر کے گھر بیٹھ گئی تھی۔ اب اماں کے ساتھ کام کاج میں ہاتھ بٹاتی تھی۔ راحیلہ تھرڈ ایئر میں تھی۔ بھائی کی طرح اس کی دوستی بھی امیر گھرانوں کی لڑکیوں سے تھی۔ جس کی وجہ سے اس کا ذہن بھی بلندیوں پر پرواز کرتا رہتا تھا۔ چھوٹے دونوں بھائی ساتویں اور نویں میں پڑھ رہے تھے۔ بھرا ہوا کنبہ تھا۔ مکان اپنا نہ ہوتا تو محدود آمدنی میں گزر بسر بھی مشکل سے ہوتی۔ لیکن ابا کے حوصلے بڑے بلند تھے۔ بچوں کو اعلیٰ تعلیم دینے کی تمنا تھی۔ بیٹیوں کو اچھے گھروں میں بیاہنے کا ارمان تھا۔ اس لیے

نوکری کے ساتھ ساتھ تھوڑا بہت بزنس بھی کرتے رہتے تھے۔ یہاں سے مال خریدا اور ہاں منافع پر بیچ دیا۔ کبھی سپلائی کا کام کسی دوست کی وساطت سے لے لیا۔ تنخواہ کے ساتھ یہ فالتو آمدنی سفید پوشی کا بھرم رکھنے میں مدد معاون ثابت ہو رہی تھی۔ بڑے بلند حوصلہ ہمت والے اور خوش باش انسان تھے—— بچوں کو کبھی محسوس بھی نہیں ہونے دیا کہ وہ ان کی خاطر اتنی محنت کر رہے ہیں۔ وہ تو اپنا فرض سمجھ کر نبھاہ رہے تھے۔

اب تو ان کی امیدیں شاہد پر لگی تھیں۔ جوان بیٹا مضبوط بازو ہوتا ہے۔ اس نے بی کام کر لیا تھا۔ اور وہ اس کی نوکری کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ ابھی اس نے کمانا شروع نہیں کیا تھا۔ پر وہ بڑے پُرامید تھے—— اکثر شاہد کی امی سے کہتے۔ ”لے بھئی تیرے مشکل دن ختم——“

”وہ کیسے؟“

”بھئی اب تیرا بیٹا نوکر ہو جائے گا۔ ہر پہلی کو پوری تنخواہ تیری ہتھیلی پر لا کر رکھا کرے گا۔ پھر تو خوش ہو گی نا۔“

کہتی۔ ”ناخوش تو میں اب بھی نہیں ہوں، لیکن بیٹے کی تنخواہ کا کچھ اور ہی مزہ ہو گا۔ آپ کو ایک پیسہ بھی نہیں دیا کروں گی۔ ساری کی ساری تنخواہ میں رکھا کروں گی۔ آخر راحیلہ اور رملہ کے لیے بھی تو جہیز بنانا ہے——“

”بھئی جیسے جی چاہے خرچ کرنا—— بیٹے کو کھلا جیب خرچ دے دیا کرنا بس۔“

”وہ تو دوں گی ہی۔ میں اتنی بے وقوف تو نہیں ہوں—— میرا بیٹا بھی سمجھدار ہے۔ اسے نہیں پتہ کہ دو بہنیں بیل کی طرح بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔“

ابا مسکرا دیتے—— اور امی من ہی من میں اس تنخواہ سے خریدنے والی چیزوں کا حساب کتاب کرنے لگتیں۔ شاید شاہد بھی کسی چھوٹی موٹی نوکری کو قبول کر لیتا۔ لیکن جب راحیل اور ثمین نے داخلہ لے لیا اور امریکہ چلے گئے تو شاہد نے بھی داخلے کے لیے اپلائی کر دیا۔ اس کے شوق کو راحیل اور ثمین کے خطوط بھڑکانے لگے—— وہ دن رات انہی خیالوں میں کھویا رہنے لگا۔

راحیل اور ثمین ہی کی کوششوں سے اسے بھی داخلہ مل گیا۔

جس دن اسے داخلے کی اطلاع ملی—— وہ خوش خوش گھر آیا۔ آتے ہی ابا سے لپٹ گیا۔ پھر امی کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھول گیا۔ راحیلہ اور رملہ کو بھی زور زور سے پکارا۔

"کیا ہوا بھئی" — ابا نے اسے اتنا خوش ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

"ابا میری ایڈمشن ہو گئی۔"

"کہاں؟"

"کیل پول یونیورسٹی میں۔"

"کیل پول!"

"امریکہ میں ابا امریکہ میں — جہاں راحیل اور شین پڑھنے گئے ہوئے ہیں —"
امی اس کی خوشی کو نظر انداز کرتے ہوئے حیرت سے بولیں۔ "تو امریکہ جائے گا؟"

"آہا —" اس کے جواب دینے سے پہلے ہی راحیلہ خوشی سے ہاتھ اونچا کرتے ہوئے نعرہ لگانے کے انداز میں بولی۔ "گڈ — ویری گڈ — شاہد بھائی امریکہ سے ڈگری لے کر آئے تو اتنی بڑی جاب ملے گی۔"

شاہد اس کے ہاتھ پھیلانے پر ہنس پڑا۔

ابا جہاندیدہ آدمی تھے۔ بیٹے کا جوش اور خوشی مجروح کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے پیار سے اسے قریب بٹھایا اور پوچھا۔ "یہ داخلہ کب اور کیسے ملا۔"

"ابا میں نے اپلائے کیا ہوا تھا۔"

"ہمیں بتایا ہی نہیں۔"

شاہد بھڑک کر بولا۔ "شکیلہ کی شادی کی فضول رسومات پر ابا اتنا خرچ کر سکتے ہیں تو میرے لیے بھی کرنا چاہیے — سمجھ لیں میری شادی کر رہے ہیں۔"

"اوہ" رملہ کے ذہن میں اک بات آگئی۔ آنکھیں گھماتے ہوئے اس نے شوخی سے چٹکی بجائی —

"کیا ہوا؟"

"ایک تدبیر ذہن میں آگئی۔"

"کیا؟"

"آپ شادی کر لیں۔"

"دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تیرا — پڑھائی کے لیے جانے کے لیے بندوست نہیں ہو رہا اور تو شادی —"

"میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے شاہد بھائی — ٹھیک سے بھی کچھ زیادہ — شادی کر لیں۔ جہیز کی جگہ نقد رقم کا مطالبہ کریں۔ آخر جہیز پر بھی تو لوگ روپیہ خرچ کرتے ہیں وہ نہ کریں نقد ہی دے دیں۔ آپ کا کام بن جائے گا؟"

"بالکل۔"

"بالکل نہیں — میری تدبیر پر عمل کر کے ہی آپ اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہیں ورنہ یہ خیال دل سے نکال ہی دیں — کوئی نہیں دے گا آپ کو اتنا پیسہ — ابا کے پاس ہے نہ امی کے پاس — اور خاطر جمع رکھیں۔ ابا پہلے ہی قرضے کے بار تلے دبے ہیں۔ اب اور قرضہ آپ کی خاطر نہیں لیں گے۔"

شاہد اتنا بچہ بھی نہیں تھا کہ ابا کی مالی حالت کو نظر انداز کر سکتا۔ وہ واقعی اسے پچاس ساٹھ ہزار تو کیا پانچ چھ ہزار کی امید بھی نہ دلا سکتے تھے۔ ان کے سر پر قرض نہ ہوتا تو شاید وہ اس کی خوشی کی خاطر کہیں سے قرضہ لے کر پیسہ اکٹھا بھی کر دیتے۔

لیکن

اب؟

وہ پریشان ہونے لگا' رملہ ہنس کر بولی۔ "میری تجویز پر عمل کر لیں' فائدہ ہو گا۔"

"تو تو نری پاگل ہے۔"

"نہیں بھائی جان — غور کر کے دیکھیں تو سہی۔"

"چل ہٹ —" شاہد بڑبڑاتا ہوا اس کے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔

پھر اس نے اپنے طور پر قرضہ لے کر کچھ رقم جمع کرانے کی سوچی — اس کے دو تین دوست ایسے تھے جو چند ہزار روپیہ بطور قرض اسے دے سکتے تھے۔ گو اتنی رقم سے کام نہیں بن سکتا تھا — پھر بھی اس نے ارادہ کر لیا۔ باقی پیسوں کے لیے وہ امی اور ابا پر دباؤ ڈال سکتا تھا۔

وہ شاہین کے پاس گیا — وہ امتحانوں سے فارغ ہونے کے بعد اپنے ابا کی آئس فیکٹری میں کام کر رہا تھا۔ روپے پیسے کا حساب کتاب اس کے پاس تھا۔ باپ نے بزنس کی تربیت دینے کے لیے ہی اسے اس کام پر لگایا تھا۔

کسی سے قرض مانگنا کتنا مشکل کام تھا۔ شاہد کو پہلی بار احساس ہوا۔ کتنی ہی دیر وہ شاہین سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ مدعا زبان پر لا ہی نہ سکا۔ عجیب سی جھجک اور سبکی محسوس ہو رہی تھی۔

لیکن بات کرنا بھی ضروری تھا — اسے پیسے کی ضرورت تھی۔ اور ایک اچھے دوست سے مدد کی توقع لے کر ہی آیا تھا۔

اس سے پہلے راحیل اور ثمین کی باتیں چھڑیں پھر مسکرا کر بولا۔ "کم بختوں نے مجھے بھی پھنسادیا۔"

"کہاں؟" شاہین تجسّس سے بولا۔

شاہد نے اپنے داخلے اور اس سلسلے میں راحیل اور ثمین کی تگ ودو کا ذکر کیا۔

"اچھی بات ہے۔ زندگی سنور جائے گی۔ اگر تن دہی اور لگن سے پڑھائی کر کے ڈگری لے لی تو—"

"وہ تو کروں گا ہی۔"

"چھوڑو یار— امریکہ جا کر لوگ رنگین بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں۔ بہت کم لوگ اپنے مقصد اور لگن کا احساس کرتے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "ان بہت کم میں سے ایک میں بھی ہوں گا۔"

"خدا کرے— مبارک ہو جانا۔"

"لیکن۔"

"کیا۔"

"جانے ہی کے سلسلے میں تم سے کچھ بات کرنا تھی۔"

"مجھ سے— کرونا—"

"مجھے کچھ روپیہ قرض دو گے۔"

شاہین چپ ہو گیا— شاہد نے خفت تو محسوس کی۔ لیکن پھر بولا۔ "لوٹا دوں گا یار— اس وقت ہاتھ پکڑ لو تو میرا امریکہ جانا—"

"لیکن میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ تمہیں اپنے طور پر قرض دے سکوں۔"

"یعنی— انکار— !"

"نہیں یار— بات سمجھو— میرے پاس تو ابھی کچھ نہیں' ڈیڈی سے بات کروں گا۔ اگر وہ مان گئے تو—"

شاہد مایوس ہوا۔ پھر بھی اسے کہا۔ "کوشش کرنا۔ پانچ سات ہزار ہی دے دیں تو نوازش ہو گی۔"

"ضرور کروں گا۔"

"میں کب آؤں؟"

"اگلے ہفتے پتہ کرنا۔"

بات اگلے ہفتے پر ٹالنے ہی کی ایک صورت تھی۔ شاہد پھر اس کے پاس نہیں گیا۔ خودداری مجروح ہوئی تھی اس لیے صرف تلملا کر رہ گیا۔

لیکن

خوددار بنے رہنے سے بھی کام نہیں بنتا تھا۔ پیسے کی اسے ضرورت تھی۔ اس لیے دوسرے دو قریبی اور مخلص دوستوں کو ٹٹولا۔

یوسف نے تو سیدھی سادی رائے دی۔ "یوں کرو۔ قرض لینے کی بجائے نوکری کر لو۔ پیسہ جمع کرتے جانا۔ پھر اپنی خواہش پوری کر لینا۔ داخلے کا کیا ہے پھر بھی مل سکتا ہے۔ اصل چیز پیسہ ہے پہلے محنت سے کماؤ پھر اپنے لمبے چوڑے پلان بنانا۔"

بات معقول تھی۔ لیکن جو ذہن نامعقولیت پہ تُلا تھا۔ اس کو کیسے جچتی۔ امریکہ کے خواب تو وہ اٹھتے بیٹھتے دیکھنے لگا تھا۔ وہاں کی رنگین و حسین زندگی کا تصور جو اس پر نشہ بن کر چھایا تھا۔ خود مختاری اور آزادی کا تصور ہی ہوشربا تھا۔

احمد نے بڑے معذرتانہ انداز میں کہہ دیا تھا۔ "میری بہن کی شادی دو ماہ بعد نہ ہونا ہوتی تو میں تمہاری ضرور مدد کرتا۔"

شاہد کی پریشانی اور مایوسی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ اس میں راحیل اور ثمین کے خطوں سے مزید اضافہ ہو رہا تھا۔ کتنے مزے میں تھے وہ — کیسی خوبصورت زندگی گزار رہے تھے— ان کی تو جیسے وہاں جا کر آنکھیں کھل گئی تھیں۔ جینے کے انداز سیکھ لیے تھے۔ یہی باتیں وہ شاہد کو لکھتے اور جلد سے جلد پہنچنے کی ترغیب دیتے۔

شاہد کی آتشِ شوق بھڑک اٹھتی۔

وہ بڑے دن سرگرداں رہا— جہاں جہاں سے قرض ملنے کی توقع تھی' غیرت اور خودداری کو نظر انداز کر کے گیا۔ لیکن بنا کچھ نہیں۔ کسی نے صاف انکار کر دیا۔ کسی نے وعدے کا حسین چکر دیا۔ اور کسی نے اتنی رقم کی پیشکش کی کہ شاہد کو قبول کرنے سے انکار کرنا پڑا۔ اسے بھیک تو نہیں چاہیے تھی۔

ابا اور امی اس کی پریشانی سے پریشان تھے۔ اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ اپنے

حالات کا احساس دلایا لیکن وہ نہیں مانا۔

"میں نے جانا ہے اور ہر صورت میں جانا ہے۔" وہ بھڑک کر کہتا۔ امی کو کبھی کبھی غصہ آ جاتا۔ وہ بھی تلخی سے کہتیں۔

"جانا ہے تو پھر خود ہی صورت نکالو جانے کی"

"کچھ نہ کچھ تو کروں گا ہی——" وہ ہار ماننے والا نہیں تھا۔ اور ایسے میں رملہ مسکرا کر کہتی۔ "میرا نسخہ آزمایئے بھائی جان—— کام ضرور بن جائے گا۔ اور پھر حرج بھی کیا ہے——"

اور

وہ واقعی اب ان خطوط پر سوچنے لگا۔

لیکن

شادی کرنا مناسب نہیں تھا۔ وہ تو امریکہ ایک غیر معینہ مدت کے لیے جانا چاہتا تھا۔ کیا خبر واپس لوٹے ہی نہیں وہیں کا ہو رہے۔ وہیں اچھی جاب مل جائے۔ ایسی صورت میں شادی!

نہیں—— ناممکن وہ سر جھٹک دیتا۔

پھر——

"شادی نہ سہی منگنی کر لیں۔ ایک دن رملہ نے راہ سجھائی۔"

"اس سے کیا ہو گا!"

"بہت کچھ——"

"یعنی۔"

"ہم شرط ہی یہ رکھیں گے کہ پہلے لڑکے کو پڑھائی کے لیے امریکہ بھیجا جائے۔"

"یعنی لڑکی والے یہ اخراجات برداشت کریں۔"

"بالکل۔"

"رملہ بے پر کی نہ اڑایا کر۔"

"نہیں شاہد بھائی۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ میری ایک دوست رینا ہے نا' اس کے بھائی کو اس کے سسرال والوں نے ہائر سٹڈیز کے لیے یو کے بھیجا ہوا ہے—— پڑھ کر واپس آئے گا تو شادی ہو گی—— نکاح کر کے چلا گیا تھا۔"

"ہوں۔"

"ایسا ہم کیوں نہیں کر سکتے۔"

"لیکن—— ہمیں——"

"ہمیں بھی کوئی نہ کوئی قبول کر لے گا شاہد بھائی' کچھ ایسے گئے گزرے تو نہیں' آپ جیسا خوبرو اور وجیہ نوجوان——"

"بس۔ بس۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں بھائی جان—— آپ کی شکل و صورت' لیاقت شرافت' کس چیز کی کمی ہے۔ امیر لوگ تو ایسے رشتوں کو جھپٹنے کے لیے تیار بیٹھے ہوتے ہیں—— میری سہیلیاں تو یہی کہتی ہیں کہ امیر زادے بگڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ مڈل کلاس کے لڑکے ہر لحاظ سے اچھے ہوتے ہیں۔"

رملہ بہت کچھ کہہ گئی۔ شاہد سنتا رہا لیکن سن کر بات درگزر نہیں کی۔ رملہ کی باتوں میں وزن تھا۔ ایسا ہو سکتا تھا—— اور ایسا ہو جائے تو کوئی حرج بھی نہیں تھا۔

انہی دنوں شکیلہ بھی چند دنوں کے لیے میکے آ گئی۔ معاملہ اس کے سامنے بھی پیش ہوا۔ امی ابا نے بہ منت کہا۔ "اسے سمجھاؤ شکیلہ امریکہ جانے کی جو رٹ لگا رکھی ہے اور جس کے لیے دن رات سرگرداں پھر رہا ہے۔ اسے چھوڑ دے۔ ہزار بارہ سو کی نوکری مل سکتی ہے۔ آرام سے نوکری کرے۔"

شکیلہ نے جب شاہد سے بات کی تو اس نے اپنی خواہش کا اظہار اس انداز سے کیا کہ وہ بھی اس کی ہم خیال ہو گئی—— اس کی زندگی بن جانے کا سوال تھا۔ لیکن بات بنتی کیسے۔ اتنا پیسہ کہاں سے آتا۔

"میری تو کوئی سنتا ہی نہیں۔" اس رات جب تینوں بہنیں بیٹھی تھیں۔ رملہ نے کہا:

"تو کیا کہتی ہے۔" شکیلہ نے پوچھا۔

"کہتی ہوں کہ شاہد بھائی کی شادی کر دیں کسی امیر گھرانے میں بات بن جائے گی۔"

"شادی سے بات بن جائے گی۔"

"ہاں باجی ہم جہیز کی بجائے کہہ دیں گے کہ نقد پیسہ دیں۔"

"پیسے کا مطالبہ کرے گی؟"

"حرج کیا ہے——"

دونوں بہنوں کی تکرار کو قطع کرتے ہوئے شاہد بولا۔ "شادی کا تو اس وقت سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' چاہے اس سے مسئلہ حل ہونے کی بھی توقع ہو——"

"کیوں؟" رملہ اور راحیلہ نے پوچھا۔

"ہم لوگ اس پوزیشن میں نہیں ہیں۔ دوسرے میں کچھ بن تو لوں۔ بیوی کا ڈھول خواہ مخواہ ہی گلے میں لٹکا لوں۔ پھر شادی یونہی تو نہیں ہو جائے گی۔ پیسہ درکار ہوگا۔"

"ہاں ہوگا تو——"

"پھر خواہ مخواہ ایک لڑکی کو شادی کے پھندے میں پھنسا کر خود چلا جاؤں—— والدین پر بھی بوجھ ڈال جاؤں بیوی کا۔"

"یہ بھی ٹھیک——"

"تو پھر——"

"پھر شادی نہ کریں منگنی کر لیں کسی امیر لڑکی سے—— اس شرط پر کہ سسرال والے آپ کو امریکہ بھیج دیں۔ جب ڈگری لے کر آجائیں تو شادی کر دیں۔"

"کون تیار ہوگا۔ یہ رسک لینے کو؟" شکیلہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"رسک کیسا باجی۔ اپنی بیٹی کے شاندار فیوچر کے لیے سب کچھ کریں گے وہ—— ہمارے لیے تھوڑا ہی کرنا ہے کچھ۔"

شکیلہ مسکرانے لگی۔ شاہد اور راحیلہ بھی رملہ کی باتوں کو دیوانے کی بڑ کہہ کر ہنس پڑے۔

لیکن

شکیلہ اس بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگی۔ اسے کئی کھاتے پیتے گھرانوں سے شاہد کے لیے اشارہ کیا گیا تھا۔ جوان' خوبصورت اور شریف لڑکے جو ہونہار بھی ہوں' جوان لڑکیوں کے والدین کی نظروں میں ہوتے ہیں۔

اس نے کئی نام گنوائے۔ ان لوگوں کی مالی حیثیت اتنی تھی کہ بیٹیوں کی شادیوں پر لاکھوں خرچ کر سکتے تھے۔

"رملہ کی بات میرے دل لگی ہے۔" بالآخر وہ بولی—— ہم رشتہ کرنے کی شرط ہی یہ رکھیں تو شاید کوئی نہ کوئی تیار ہو ہی جائے۔"

"بالکل باجی—— ہم صاف کہہ دیں گے کہ ہمیں جہیز کی قطعاً ضرورت نہیں۔ صرف لڑکے کو اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ بھجوا دیں۔"

"اچھا میں اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھاؤں گی۔ پہلے اماں ابا کو راضی کر لوں۔"

اس نے دو چار دن پوری دلجمعی سے سوچا۔ پھر امی سے بات کی۔ امی ذہنی طور پر ایسی کسی بات کے لیے تیار نہ تھیں۔ ہنس کر بولیں۔ "شکیلہ تیرا دماغ بھی اس سرپھرے نے خراب کر دیا۔"

"نہیں امی—— یہ اس کی نہیں میری اپنی تجویز ہے۔ اور اس میں حرج بھی کوئی نہیں۔ شادی تو آپ نے آخر اس کی کرنا ہی ہے۔"

"کر لیں گے۔ جب شادی کا بار اٹھانے کے قابل ہوگا—— ہم ایسا کوئی بار اٹھانے کے قابل نہیں ہیں۔"

"شادی کا تو میں کہہ ہی نہیں رہی۔ صرف منگنی کی بات کر رہی ہوں۔ شادی تو کریں گے ماشاء اللہ جب وہ بہت بڑا آدمی بن کے آئے گا۔ بہت بڑی ڈگری لے کر آئے گا۔ دھوم دھام سے شادی کریں گے اس کی۔"

"منگنی اس شرط پر ہو گی۔"

"کوئی بری بات نہیں—— جو کوئی بھی یہ بار اٹھائے گا اپنے لیے ہی اچھا کرے گا۔ لائق اور شریف لڑکے راہ پر پڑے تو نہیں ملتے۔"

"تو جان اور تیرا چہیتا بھائی۔"

"میں کوشش ضرور کروں گی۔ آگے جو اللہ کو منظور۔"

واقعی شکیلہ نے سنجیدگی سے کوشش شروع کر دی۔ وہ تین چار جگہ اس نیت سے رشتہ لے کر گئی۔ اپنی شرط پیش کی۔

دو جگہ سے تو معذرت کر دی گئی۔

تیسری جگہ سوچنے کی مہلت مانگی گئی۔

لیکن چوتھی جگہ بات بن جانے کی صورت نظر آ گئی۔ میاں حمیدالدین جدی پشتی امیر آدمی تھے۔ بزنس بھی خوب چل رہا تھا۔ اور جائیداد بھی کافی تھی۔ انہیں اپنی چوتھی بیٹی کے لیے رشتہ چاہیے تھا۔ شکیلہ کے سسرال والوں سے جان پہچان تھی—— اپنی بڑی تینوں بیٹیوں کے رشتے بھی انہوں نے متوسط طبقے ہی میں کیے تھے۔ جہیز کی

صورت میں بیٹیوں کو اتنا کچھ دیا تھا کہ لائق اور شریف دامادوں کو کسی چیز کی کمی نہ رہی تھی۔۔۔ اب اپنی چوتھی اور آخری بیٹی کے لیے بھی انہیں کسی ایسے ہی رشتے کی تلاش تھی۔

شکیلہ کو بات بنتی نظر آئی تو شاہد کے امریکہ جانے کی بات کھل کر کر دی۔

میاں صاحب اور ان کی بیگم کے لیے اخراجات برداشت کرنا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ لیکن سوچ میں پڑ گئے دو سال کا طویل عرصہ شاہد کی واپسی تک لگ سکتا تھا۔ اس عرصے میں بہت کچھ ہو سکتا تھا۔

لیکن

عصمہ بیٹی کی تقدیر شاہد کے ساتھ بندھی تھی۔ سوچنے کے باوجود کچھ نہ کیا۔ شکیلہ کے خاندان کے بارے میں پوچھ گچھ البتہ ضرور کر لی۔ شاہد کے متعلق بھی چھان بین کر کے تسلی کر لی۔ سوائے اس کے کہ یہ لوگ دولت مند نہیں تھے اور کوئی خرابی یا کمی نہیں تھی۔ جس سے پوچھا اس نے تعریف ہی کی۔

رشتہ طے کرنے میں انہیں کوئی قباحت نظر نہ آئی۔ ہاں منگنی کی جگہ نکاح کرنے پر ضرور اصرار کیا۔ یہ ایک طرح کی ضمانت تھی شاہد کے واپس آنے کی۔

گھر والوں کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اتنے بڑے گھرانے کی خوبصورت اور نیک سیرت لڑکی کا رشتہ مل رہا تھا۔۔۔ یہ رشتہ شاہد کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش کو پورا کرنے کا بھی ذریعہ تھا۔۔۔ وہ لوگ اسے اپنے خرچ پر امریکہ بھجوانے کے لیے تیار تھے۔ پھر اعتراض کی گنجائش کہاں سے نکلتی۔

اب تو ابا بھی خوش تھے اور امی کا پاؤں بھی زمین پر نہ ٹکتا تھا۔ اتنے بڑے خاندان سے رشتہ جڑ رہا تھا۔ فخر ہی کی تو بات تھی۔ امی تو دل ہی دل میں اور امیدیں بھی جگا بیٹھی تھیں۔ رملہ اور راحیلہ کے رشتے بھی تو کرنا تھے۔ اس خاندان میں کئی لڑکے تھے۔ کیا عجب ان بچیوں کی بات بھی ان میں سے کسی کے ساتھ ہو جائے۔

شاہد بھی بہت خوش تھا۔ اب تو رملہ کا معتقد تھا۔۔۔ اسی نے تو یہ راہ سجھائی تھی۔

''مان گئے بھئی مان گئے۔ واللہ کیا دماغ پایا ہے۔'' وہ اس کے سر پر پیار سے چپت لگاتے ہوئے سرشار سے لہجے میں کہتا۔۔۔ ''راہ سجھا دی۔ ورنہ میں تو مایوسی کے اندھیروں میں ڈوبتا ہی جا رہا تھا۔''

''کیسا؟''۔۔۔ وہ فخر سے ہنس دیتی۔

نکاح کے لیے تیاریاں کوئی خاص تو کرنا نہیں تھیں۔ دو چار جوڑے خریدے گئے۔ ایک انگوٹھی لی گئی۔ مٹھائی اور پھل کے ٹوکرے آئے۔ اور اگلے ہی ہفتے نکاح کے بندھن میں عصمہ اور شاہد کو باندھ دیا گیا۔

بڑے گھرانے میں نکاح ہوا تھا۔ ابا اور امی کے منع کرنے کے باوجود ان لوگوں نے دینے دلانے کی ساری رسمیں نبھائیں۔ شاہد کو ہیرے کی انگوٹھی دی۔ کئی سوٹ دیئے۔ سب گھر والوں کو ریشمی اور قیمتی جوڑے دیئے گئے۔۔۔ امی کو سونے کے کنگن اور ابا کو قیمتی گھڑی دی۔

امی تو سارے محلے اور ساری برادری میں یہ چیزیں شان سے دکھاتی پھریں۔

نکاح کے فوراً ہی بعد شاہد کے جانے کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو گئیں۔ میاں صاحب نے کھلے دل سے پیسہ خرچ کیا۔ شاہد کے لیے کئی جوڑے کپڑے تیار کروائے۔ جوتے خریدے۔ قیمتی سوٹ کیس اور ہینڈ بیگ لیے۔۔۔ پاسپورٹ اور ویزے کے لیے دوڑ دھوپ کی۔ ڈالرز کا بندوبست کیا۔ مہینے کے اندر اندر ہی سب کچھ ہو گیا۔ ٹکٹ بھی آ گیا اور سیٹ بھی بک ہو گئی۔

جانے سے پہلے وہ تھوڑی دیر کے لیے عصمہ سے تنہائی میں مل سکا۔۔۔ میاں صاحب مشرقی اقدار کے پرستار تھے۔ وہ تو رخصتی سے پہلے عصمہ اور شاہد کے ملنے پر پابندی لگا چکے تھے۔ یہ تو شکیلہ اور عصمہ کی بڑی بہنوں نے چوری چوری دونوں کے ملنے کا اہتمام کیا۔

شاہد کے لیے عصمہ فرشتہ رحمت تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔ بڑا سرشار تھا۔ اس لیے عصمہ سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ امریکہ جانے کے لیے جو جو پاپڑ بیلے تھے' جو جو ناکام کوششیں کی تھیں۔ اسے بتاتے ہوئے کہا ''عصمہ میں بڑا خوش نصیب ہوں جو تم جیسی لڑکی مجھے ملی۔ میری دلی خواہش پوری ہو گئی۔ میں تمہارا ممنون احسان ہوں۔''

شرمیلی اور معصوم سی حیادار لڑکی تو پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھ بھی نہ سکی۔۔۔ شاہد ہی بولتا چلا گیا۔ بڑے حسین وعدے دیئے' مستقبل کے دو سال کی مدت کے لیے جا رہا ہوں۔ یوں گزر جائیں گے۔ پھر میں تمہیں وہاں بلا لوں گا۔۔۔ ہم وہیں سیٹل ہو جائیں گے۔

عصمہ اک حیادار نگاہ اس پر ڈال کر ہولے سے صرف اتنا ہی کہہ سکی:

"میں اس دن کا انتظار کروں گی۔"

"خط باقاعدگی سے لکھا کرنا۔" شاہد نے پیار سے کہا۔ "لکھو گی نا۔"

عصمہ نے حامی بھر لی۔

جانے سے پہلے عصمہ کی امی اور ابو نے اسے پاس بٹھا کر ڈھیروں نصیحتیں کیں۔ اپنی نازک پوزیشن کا احساس دلایا—— جلدی میں انہوں نے بہت بڑا اقدام اٹھالیا تھا۔ لیکن وہ پچھتا نہیں رہے تھے۔ شاہد کی شرافت اور اس کے خاندانی پس منظر پر انہیں اعتماد تھا۔ وہ تو بزرگی کے ناطے نوجوانی کو پند ونصائح کے بندھن میں باندھ رہے تھے۔ اپنے امی ابا نے بھی یہی کہا۔

شکیلہ نے بطور خاص نصیحت کی۔ "وہاں جا کر رنگ رلیوں میں نہ پڑ جانا۔ تم اب ایک بہت بڑی ذمہ داری کندھوں پر اٹھا چکے ہو—— اس سلسلے میں ہمیں شرمندگی نہ اٹھانا پڑے——"

وہ ہنس کر بولا۔ "عصمہ اب میری منکوحہ ہے باجی اور میں اس کی اہمیت جانتا ہوں۔"

سب کو تسلی دلاسے دے کر وہ چلا گیا۔

وہاں پہنچتے ہی اس نے سب کو علیحدہ علیحدہ خط لکھے—— ابا امی' شکیلہ' میاں صاحب کے علاوہ عصمہ کو بھی بڑا رومانی سا خط لکھا۔

سب کے جواب آنے پر اس نے پھر خط لکھے۔

خطوط کا سلسلہ چھ سات ماہ تک بڑی باقاعدگی سے چلتا رہا۔

اس کے بعد

وقفہ آنے لگا۔ پھر یہ وقفہ بڑھتا چلا گیا—— ہفتوں سے مہینوں پر بات گئی۔ اور پھر بات بالکل ہی گئی۔ ابا نے ڈانٹ بھرے خط لکھے۔ میاں صاحب نے اپنی پوزیشن کی نزاکت کا احساس دلانے کو کئی بار طویل خطوط لکھے۔ شکیلہ نے کئی خط لکھے۔ اور عصمہ نے تو باقاعدگی سے لکھنا شروع کیا۔ بنا جواب پائے ہی اسی طرح لکھے گئی۔

لیکن

شاہد تو وہاں کی ہوشربا دنیا میں کھو چکا تھا—— رنگین جال میں الجھ گیا تھا۔ بیک

وقت کئی کئی لڑکیوں سے دوستی کر رہا تھا—— رنگین حسین تتلیاں اس کے گرد منڈلاتی رہتی تھیں۔ اسے عصمہ کی یاد کیسے آتی۔ وہ تو اب پاکستان سے آنے والے خطوط کو کھولے بنا ہی ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتا تھا۔

انسان تقدیر کے دھاروں پر بہنے والا بے بس سا تنکہ ہے۔ یہ ان دھاروں کے رحم وکرم پہ ہے کہ تنکے کو کنارہ دکھادیں—— یا منجدھار میں پہنچادیں۔

عصمہ بھی اک ایسا ہی تنکہ ہے۔

شاہد کو گئے پانچواں سال ہے—— اس کا کچھ پتہ نہیں—— کہ وہ کہاں ہے—— کیا کر رہا ہے—— تقدیر کے بے رحم دھاروں نے تنکے کو منجدھار میں پھنسادیا ہے۔ پانی کے تیز گھمار میں آ کر چکر کاٹے جا رہا ہے۔

کون جانے۔

یہ گھماؤ سے کبھی نکلے گا بھی یا نہیں۔

کون جانے۔

کون

جانے

کھلونا

جب سے نومی نے ککی کے پاس پٹڑی پر آپوں آپ چلنے والی ریل گاڑی دیکھی تھی ضد کر رہا تھا۔

"امی میں بھی ایسی ریل گاڑی لوں گا۔ ابو سے کہیں مجھے بھی ویسی ریل گاڑی لا دیں۔" امی اس کی سنی اَن سنی کر رہی تھی۔ گھڑ گھڑ مشین چلائے جا رہی تھی۔ جمیل کی پرانی قمیص کاٹ کر نومی کی بش شرٹ سی رہی تھی۔ لیکن وہ تھا کہ زبان تالو سے لگا نہیں رہا تھا۔

"امی لے دیں نہ مجھے بھی۔ آج ابو آئیں تو ان سے کہیں مجھے بھی ویسی ریل گاڑی لا دیں۔ کتنے مزے سے پٹڑی پر چلتی ہے۔ اتنا بڑا گول چکر کاٹتی ہے۔ ککی تو مجھے ہاتھ ہی لگانے نہیں دیتا تھا۔ میں نے ریل کا ڈبہ ذرا سا چھوا تو کہنے لگا 'نہ کرو بھئی ٹوٹ جائے گی۔ بہت مہنگی ہے۔'"

"ہاں بیٹے۔" امی نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "یہ واقعی بہت مہنگی ہے۔ اتنے مہنگے کھلونے بچوں کے پاس ہونے ہی نہیں چاہئیں۔"

"کیوں۔ کیوں نہیں ہونے چاہئیں۔"

"بھئی اس لیے کہ ٹوٹ پھوٹ جائیں تو دو تین سو روپے کا نقصان۔۔۔"

"ککی بھی تو بچہ ہے۔ اس نے کیوں لی ہے۔"

"نومی ایسی باتیں نہیں کرتے۔"

"ککی کہتا ہے۔ اس کے امی ابو بہت اچھے ہیں جو چیز بھی وہ کہتا ہے فوراً خرید دیتے ہیں۔"

"ہاں بیٹا۔ وہ فوراً خرید دیتے ہیں۔ اس میں اچھے برے کا سوال نہیں۔"

"کیوں نہیں۔"

"ان کے پاس پیسے بہت ہوتے ہیں وہ خرید دیتے ہیں۔"

"آپ کے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

"ہیں۔ لیکن اتنے نہیں کہ ایسی مہنگی مہنگی ریل گاڑیاں خرید سکیں۔"

"امی۔ امی جی۔ صرف ایک دفعہ خرید دیں۔ پھر میں کچھ نہیں مانگوں گا۔ یہ ریل گاڑی لے دیں۔"

نومی نے جس منت سماجت سے کہا سائرہ کا دل مسلا گیا۔ چھ سات سالہ نومی بھلا مالی حالات کیا سمجھتا۔ اسے تفصیل بتانا بھی فضول تھا۔ ننھے منے ذہن میں ابھی سے احساس کمتری جگانا عقلمندی تو نہیں تھی۔ اور پھر سائرہ جانتی تھی کہ شروع ہی سے نومی کو کھلونوں میں سے صرف ریل گاڑی ہی پسند ہے۔

ٹین کی سستی ریل گاڑی' پلاسٹک اور ربڑ کا دو چار روپے کا ریلوے انجن اور گاڑی پا کر وہ اتنا خوش ہوتا تھا کہ مہنگے سے مہنگے کھلونے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔

لیکن آج وہ جس ریل گاڑی کی فرمائش کر رہا تھا وہ ککو کے پاس تھی۔ اس کا جواب ہی کیا تھا۔ سیل سے چلتی تھی۔ کوئی دو فٹ کے قطر میں ریلوے لائن بچھی تھی۔ جس پر سگنل بھی تھا اور پلیٹ فارم بھی۔ کیا مزے سے چھک چھک کرتی چلتی تھی۔ چیز تو لاجواب تھی۔ لیکن اتنی مہنگی تھی کہ سائرہ جانتی تھی وہ اس کی قیمت کا بوجھ اپنی آمدنی پر نہیں ڈال سکتی۔ اخراجات اتنے زیادہ تھے کہ جمیل بیچارے کی آمدنی ان کے متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ سارا مہینہ تنخواہ کے ساتھ کھینچا تانی ہی میں گزر جاتا۔ گھر کا کرایہ' بجلی' پانی اور گیس کا خرچہ' راشن پانی' مہمان داری' تنخواہ اتنے خانوں میں بٹتی تھی کہ مہینے کی آخری تاریخوں میں اس کا وجود ہی نہ رہتا۔ خالی ہاتھ کبھی کہاں پھیلانے پڑتے کبھی کہاں۔ سفید پوشی کا بھرم رکھنا بھی دو بھر ہوتا جا رہا تھا۔ دونوں میاں بیوی اور نومی ہوتے تو شاید تنخواہ ناکافی نہ ہوتی۔ لیکن جمیل کی اماں بھی انہیں کے ساتھ رہتی تھی۔ اماں کے ساتھ بیاہی بیٹیوں کا آنا جانا بھی تھا۔ ان کے ہاں خوشی غمی میں جو بھی خرچہ کرنا ہوتا تھا اماں ہی کو کرنا پڑتا۔ اور اماں کی آمدنی کا کون سا وسیلہ تھا۔ یہی بیٹا ہی تھا۔ جائز ناجائز اخراجات اسی سے پورے کرواتی تھی۔ تین بیٹیاں تھیں۔ ہر ماہ دو چار سو روپیہ ان کی نذر ہو جاتا تھا۔ کبھی

کسی کے بچہ ہوا ہے۔ کسی کے بچے کی سالگرہ ہے۔ کسی کا بچہ پاس ہوا ہے۔ کسی کے سسرال میں شادی آ گئی ہے۔ کسی کے شوہر کی پروموشن ہوئی ہے۔ بیٹے کی آمدنی میں گنجائش ہوتی نہ ہوتی' اماں بیٹیوں کا سر اونچا رکھنے کے لیے کبھی لڑ جھگڑ کر' کبھی پیار دلاسے سے' کبھی رو دھو کر اپنی بات پوری کروا ہی لیا کرتی تھی۔ جمیل طبعاً صلح پسند تھا۔ لڑائی جھگڑے سے ڈرتا تھا۔ اس لیے اماں کی بات اگر ٹالے نہ ٹلتی تو بلا چوں وچراں پوری کر دیا کرتا تھا۔ سائرہ کو غصہ آتا۔ کچھ کہنے کو زبان کھولتی تو جمیل سمجھانے کی کوشش کرتا۔ "اماں کیا کرے بیچاری۔ بیٹیوں کا معاملہ ہے۔ دینا ہی پڑتا ہے۔ ابا زندہ تھوڑے ہیں۔ جوان پر بار ڈالیں۔ سب کچھ ہم پر ہی پڑا ہے۔ ہماری ہی ذمہ داری ہے۔"

وہ جل کر کہتی۔ "کب تک یہ ذمہ داریاں نبھاتے رہو گے۔ منہ کا نوالہ ان لوگوں کے منہ میں ڈالتے رہو گے۔ اچھی بھلی ہیں سب اپنے گھروں میں۔ اماں نے بے جا سر پر چڑھا رکھا ہے انہیں۔ جھوٹی شان بنانے کے لیے ہمیں مصیبت میں ڈال دیتی ہیں۔"

جمیل کبھی تو سائرہ کی باتیں سن کر چپ ہو جاتا' کبھی جھڑک دیتا اور کبھی ملائمت سے سمجھانے کی کوشش کرتا۔ اسے خود بھی احساس تھا کہ یہ کافی حد تک زیادتی بھی ہے۔ لیکن مجبور تھا۔ جب تک نبھ سکتی تھی نباہنے کا ارادہ تھا۔ لڑائی جھگڑے سے دور بھاگنا چاہتا تھا۔ سائرہ اور اماں میں اکثر تُوتکار ہو جاتی تھی۔ ساس بہو کا روایتی رشتہ یہاں بھی تھا۔ لیکن سائرہ بھی جمیل سے ڈرتی تھی اور اماں بھی۔ اس لیے لڑائی جھگڑا اس کی عدم موجودگی ہی میں ہوتا تھا۔ ویسے دونوں ایک دوسرے کے درپۓ آزار رہتیں۔ ایک دوسری کو نیچا دکھانے کی شعوری اور لاشعوری کوشش کرتیں۔

"امی جی۔" نومی نے ماں کو جھنجھوڑا۔ "لے دیں گی گاڑی۔"

"کیسی گاڑی۔" دادی اماں اندر آتے ہوئے بولیں۔

"ریل گاڑی دادی اماں۔" نومی دادی کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ سائرہ نے سر اٹھا کر ساس کو دیکھا اور پھر مشین پر جھک گئی۔

"یہ کیا مانگ رہا ہے سائرہ۔" ساس نے پوچھا۔

"ریل گاڑی۔" اس نے مشین چلاتے چلاتے کہا۔

"دادی اماں ریل گاڑی۔" دادی کے چارپائی پر بیٹھتے ہی وہ ان کی گود میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ "اتنی بڑی پٹڑی پر چلتی ہے۔ بڑے مزے کی ہے۔ ککو کے پاس ہے۔ مجھے

ہاتھ بھی لگانے نہیں دیا اس نے۔ میں بھی لوں گا تو ہاتھ نہیں لگانے دوں گا کسی کو۔"

سائرہ زہرخند سے بولی۔ "تُو تو ضرور لے گا۔"

"سچ امی۔" نومی اچھل کر دادی کی گود سے اترا اور ماں کی پشت پر آ کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھول گیا۔ ماں کے لہجے کے طنز کو وہ کیا بھانپتا۔ "لے دیں گی نا۔ لے دیں گی نا۔"

"کھلونے تھوڑے ہیں تیرے پاس' دادی ماں نے جلدی سے کہا اور پھر تو نے پڑھنا لکھنا نہیں۔ کھلونے ہی کھیلتا رہے گا۔"

"پڑھتا تو ہوں دادی اماں۔" وہ بولا۔

"پھر کھلونوں کا کیا ذکر۔" دادی نے جواب دیا۔

"ککو بھی تو پڑھتا ہے۔ اس کے پاس ریل گاڑی۔"

"نومی۔" سائرہ نے ڈانٹا۔ "تجھے کہا ہے نا ضد نہیں کرتے۔ ککو کے ابو کے پاس بہت پیسے ہیں۔"

"اور تیرے ابو کے پاس کچھ نہیں۔" ساس نے طنز کیا۔ پھر تلخی سے بولی۔

"مجھے سنا رہی ہے۔ اٹھتے بیٹھتے یہی جتلاتی رہتی ہو جیسے میرے ہاتھ میں آتی ہے ساری کمائی۔"

سائرہ لڑنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ جلدی سے بولی۔

"اماں ہر بات اپنی طرف نہ کھینچ لیا کرو۔ دو تین سو روپے کا کھلونا ہے جو یہ مانگ رہا ہے۔"

"دو تین سو روپے کا!" دادی اماں کی آنکھیں پھیل گئیں۔ پھر نومی سے بولی "نواب کا پُتر ہے نا تو دو تین سو روپے میں تو سو ضرورتوں کا منہ بند ہو سکتا ہے۔ تیری پھپھو کے دونوں بیٹے پاس ہوئے ہیں۔ میں نے انہیں ایک پیسہ نہیں دیا۔ ریل گاڑی خریدنا ضروری ہے کیا۔"

"ہاں ضروری ہے۔" ایک دم سائرہ بھڑک اٹھی۔

ساس نے دو تین سو کا خرچہ سنا دیا تھا۔ آگ ہی تو لگ گئی تھی اس کے تن بدن میں۔ وہ جانتی تھی۔ اماں نے بات منہ سے نکالی ہے تو ہر طرح اسے جمیل سے پورا بھی کروائے گی۔ اس لیے اس کے اندر لاوا سا پکا ہوا تھا۔ اپنی اور اپنے بچے کی خواہشوں کا گلا گھونٹ کر وہ کبھی اماں کی بات پوری نہ ہونے دے گی۔ اس نے تہیہ کر لیا۔

شام جمیل دفتر سے آیا تو وہ ہنس ہنس کر بتانے لگی۔ "سنی اپنے صاحبزادے کی بات۔"

"کیا؟" جمیل جوتے اتارتے ہوئے بولا۔

"ٹکو کے پاس ریل گاڑی دیکھ آیا ہے۔ اس وقت سے ضد کر رہا ہے کہ ویسی گاڑی لوں گا۔"

نومی بھی کمرے میں آ گیا۔ آتے ہی باپ سے لپٹ کر بولا:

"ابو ریل گاڑی لے دیں گے نا ٹکو جیسی۔ امی نے تو کہہ دیا ہے کہ لے دیں گی۔"

"پھر امی ہی سے کہو بیٹا جی۔ بجٹ بنتا ہے تو لے دیں۔"

"بجٹ تو کبھی بنے گا ہی نہیں۔" سائرہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"پھر؟" مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جمیل بولا۔

"پھر کیا۔" وہ تیزی سے بولی۔ "کچھ بھی ہو نومی کو ریل گاڑی دلائیں گے ہم۔ وہ بچہ ہے۔ کتنی خواہش ہے اُسے۔ ٹکو اس کا ہم عمر ہے۔ بچے کو ہم کیوں احساس کمتری کا مریض بنائیں۔ جہاں اور خرچ چلتے ہیں یہ بھی چلے گا۔"

"بھئی مجھے کیا کہتی ہو۔ تنخواہ لا کر تمہارے ہاتھ پر رکھ دیتا ہوں۔ اس میں ریل گاڑی چھوڑ ہوائی جہاز خرید دو صاحب زادے کو۔ اپنا تو سگریٹ ہی کا خرچہ ہے۔ باقی تم جانو اور تمہارا کام۔"

"کب لے دیں گی امی۔" نومی بولا۔

"کتنے کی ہو گی۔" جمیل نے جرابیں بوٹوں میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"دو تین سو کی ہو گی۔" سائرہ بولی۔

"دو تین سو کی!"

"جی ہاں۔"

"بڑی شاہ خرچ ہو۔"

"ہر جگہ شاہ خرچی ہو سکتی ہے تو اپنے بیٹے کے لیے بھی ہو گی۔" سائرہ نے جواب دیا۔ جمیل چپ ہو گیا۔ نومی مچلنے لگا۔

"امی آج لے دیں گی۔ شام کو بازار چلیں گے نا ابو۔"

"آج نہیں بیٹے۔" سائرہ نے کہا۔ "آج تو پچیس تاریخ ہے پیسے نہیں ہیں ابھی۔ پھر لے دیں گے۔"

"کب؟"

"پہلی تاریخ کو۔ تنخواہ ملے گی نا ابو کو۔ پہلے ہی الگ رکھ لوں گی ریل گاڑی کے پیسے۔"

نومی انگلیوں پر دن گننے لگا۔ پھر شوق سے بولا۔ "ٹھیک ہے امی وعدہ۔ پہلی تاریخ کو لے کر دیں گی؟" "ہاں بیٹے ضرور۔ وعدہ رہا۔" سائرہ نے کہا۔ نومی چھلانگیں لگاتا صحن میں نکل گیا اور دادی کو مژدہ سنا دیا۔ دادی کو خوشی نہیں ہوئی۔ اس بے جا خرچ پر اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

نومی پہلی تاریخ کا بڑے شوق اور شدت سے انتظار کرنے لگا۔ ہر صبح اس کی آنکھ کھلتی تو پہلا فقرہ ہی یہ منہ سے نکلتا۔ آج اتنے دن رہ گئے ہیں۔

سائرہ اور جمیل مسکرا دیتے۔ بچے کا شوق اور خواہش دیکھتے ہوئے جمیل نے بھی نیت کر لی کہ اسے ریل گاڑی خرید ہی دیں گے۔

پہلی تاریخ ہمیشہ کی طرح آئی۔

نومی نے صبح ہی سے رٹ لگا رکھی تھی۔ شام کو بازار چلیں گے۔ ریل گاڑی لائیں گے۔ میں بھی کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گا۔ امی آپ کو بھی نہیں اور ابو آپ کو بھی نہیں۔ دادی ماں کو نہیں۔ بس میری مرضی۔

لیکن

نومی کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ اس دفعہ تنخواہ میں سے کٹوتی ہو گئی تھی۔ جمیل نے چھوٹی بہن کی پہلی ڈیلیوری کے لیے جو قرضہ لیا تھا دو ماہ سے اس کی قسط نہ کٹوائی تھی۔ اس دفعہ اکٹھی کٹ گئی۔ سائرہ کو غصہ بھی آیا۔ مایوسی بھی ہوئی۔ لیکن کیا کر سکتی تھی۔ جمیل نے تو پیسے لا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے تھے۔

سائرہ نے موٹا موٹا حساب لگایا۔ کرایہ' بجلی' گیس' پانی اور کریانہ کی دکان کا حساب' نومی کی سکول کی فیس' تانگے کا ماہانہ۔ پچھلے ماہ دو سو روپیہ بھابی سے قرض لیا تھا۔ سب دے دلا کر اتنا بھی نہ بچ رہا تھا کہ دو ہفتے بھی آرام سے گزرتے۔ مجبور تھی۔ نومی سے کیا ہوا وعدہ نبھایا نہ جا سکتا تھا۔

نومی رویا۔ تڑپا۔ ضد کی۔ امی ابو سے روٹھ گیا۔

سائرہ نے پیار سے 'دلاسے سے سمجھایا۔ اور پھر وعدہ کیا۔ "اس دفعہ معافی دو'

اگلے ماہ ضرور لے دیں گے ریل گاڑی۔ بہت اچھے بچے ہو نا۔ دیکھو ابو بچارے کی تنخواہ کٹ گئی ہے۔ تمہیں ریل گاڑی لے کر دی تو کھانے پینے کے لیے کہاں سے لائیں گے۔ میرا بچہ بہت اچھا ہے۔ وعدہ رہا اگلی پہلی تاریخ کو ضرور گاڑی لے دیں گے۔

نومی کیا کرتا۔ امی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”پکا وعدہ امی۔“

”ہاں بیٹے پکا وعدہ۔“ امی نے اس کا ماتھا چوم لیا۔

نومی اگلے ماہ کی پہلی تاریخ کا پھر سے انتظار کرنے لگا۔ کیلنڈر پر ہر گزرنے والے دن پر وہ اس کا نشان لگا کر باقی رہ جانے والے دنوں کی ہر روز گنتی کرتا۔

ایک ایک دن سرک رہا تھا۔ اور نومی کو یوں لگتا تھا جیسے اس کے دل پر آن پڑنے والا پہاڑ سرک رہا ہے۔ جوں جوں مہینہ خاتمے کی طرف بڑھ رہا تھا توں توں نومی کی خوشیوں کے سپنے پھیل رہے تھے۔ ان میں نئی زندگی بھر رہی تھی۔ نیا جوش ‘نیا ولولہ آ رہا تھا۔

”آج پانچ دن رہ گئے ہیں امی۔“

”آج چار دن۔“

”آہا صرف تین دن۔“

”دو دن۔“

”اب آج کا دن ہے۔ کل پہلی تاریخ ہے نا۔“

نومی سارا دن سائرہ سے یہی کہتا رہا۔ بچہ تھا۔ اسے اتار چڑھاؤ کی کیا خبر۔ اس کی امی نے پکا وعدہ کیا تھا۔ وہ اسی کے تصور میں ڈوبا تھا۔

لیکن

یہ تو سائرہ ہی جانتی تھی نا کہ اس ماہ کو پورا کرنے کے لیے پہلے ہی کس کس کے آگے ہاتھ پھیلا کر پیسہ لے چکی ہے۔ قرضہ پچھلے ماہ سے بھی زیادہ سر چڑھ گیا تھا۔ اکیلے ہوتے تو روکھی سوکھی کھا کر مہینہ پورا کر لیتے۔ لیکن مہمان آ گئے تھے۔ پورا ہفتہ تو اماں نے چھوٹی بیٹی اور بچوں کو بلا کر رکھا تھا۔

اٹھتے بیٹھتے کہتی تھیں۔ ”نسرین دو ماہ سے نہیں آئی۔ یہ کوئی آنا ہوتا ہے کہ میاں کے ساتھ سکوٹر پر بیٹھ کر آئی اور گھنٹہ دو گھنٹہ گزار کر چلی گئی۔ اس کے بچوں سے بھی دل اداس ہو رہا ہے۔ نسرین خود بھی آرام سے آ کر رہنا چاہتی ہے۔ میں کیا کروں۔ بھائی بھابی چاہیں تو لا کر رکھیں۔ گھر ان کا ہے۔ میں خود تو بلا کر نہیں لا سکتی۔“

بلا خود ہی لیا انہوں نے۔ اک شام دونوں میاں بیوی ملنے آئے تو اماں نے کہہ دیا:

”کل نسرین اور بچوں کو چھوڑ جانا۔ رہ لے کچھ دن میرے پاس۔ دل اداس رہتا ہے میرا۔ دو تین ماہ سے وہ بس اڑن کھٹولے ہی پہ آتی اور چلی جاتی ہے۔“

نسرین معہ تین بچوں کے ہفتہ بھر رہی تھی۔ بھائی بھابی کے سر چڑھی تھی۔ خاطر مدارات نہ کرتے تو شاید زندگی بھر وہ پیچھا نہ چھوڑتی اور نہ اماں۔

سائرہ کا بڑا بھتیجا اور اس کی نئی نویلی دلہن بھی تین دن رہ گئے تھے۔ سائرہ نے نسرین کی خاطر مدارات کی تھی تو اپنے بھتیجے اور اس کی بیوی کی کیوں کر نہ کرتی۔ شادی کے بعد دونوں پہلی دفعہ آئے تھے۔ نومی کے لیے قیمتی کھلونا اور امپورٹڈ جرسی بھی لائے تھے۔ خاطر کرنا ضروری تھا۔ خاطر تو کیا دونوں کو کوئی نہ کوئی تحفہ دینا بھی ضروری تھا۔ دلہن کے لیے ریشمی جوڑا تو اس نے اپنا ہی دے دیا تھا۔ بھتیجے کے لیے ریڈی میڈ شرٹ منگوائی تھی۔

کوشش تو اس نے کی تھی کہ اماں کو ان چیزوں کا پتہ نہ چلے لیکن دلہن کی سادگی یا بیوقوفی دونوں چیزیں اماں کے سامنے رکھ کر سائرہ اور جمیل کی تعریف کرتے ہوئے سب کا شکریہ ادا کرنے لگی۔ اماں کے دل میں تو گھاؤ پڑ گیا۔ مہمانوں کے جانے کے بعد سائرہ کو سنا ہی دیا۔

”نسرین کو دینے کے لیے تو تیرے پاس کچھ تھا نہیں۔“

سائرہ نے سنی اَن سنی کر دی۔ وہ بات بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔

لیکن

جمیل کے سامنے اماں نے دکھڑا رویا۔ سوکھی آنکھوں کے گوشے پونچھتے ہوئے کہا۔ ”باپ ہوتا تو کوئی حسرت رہتی دل میں۔ کیا تھا جو بچوں ہی کے کپڑے بنا دیتے نسرین کو۔ سسرال میں جا کر تمہارا ہی نام اونچا کرتی۔“

سائرہ نے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھایا۔ لیکن جمیل نے تیز نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ چپ ہو گئی۔ جمیل ماں کو دلاسہ دیتے ہوئے بولا:

”کوئی بات نہیں اماں۔ پھر سہی۔ بہنوں کا ادھار چکانا ہی ہوتا ہے۔ کبھی ہاتھ کھلا تو چکا دوں گا۔“

اماں نے جیسے سائرہ کو نیچا دکھا دیا۔ بڑی چبھتی ہوئی نظروں سے سائرہ کو دیکھا۔

سائرہ نے بھی اک خونخوار سی نگاہ ساس کی طرف اچھال دی۔

یوں نومی کی خواہش اور سائرہ کا وعدہ اس ماہ پھر حالات کی بھینٹ چڑھ گیا۔

بچہ مایوسی اور ڈپریشن کا شکار ہونے لگا۔ سائرہ نے پیار سے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ ضد اور ہٹ دھرمی پر اتر آیا۔ تڑ تڑ ماں کو جواب دیئے۔ نتیجے میں تھپڑ کھایا۔ پھر وہ اتنا چیخا اتنا رویا کہ جمیل کا دل بھی مسلا گیا۔

بڑی مشکلوں سے اسے بہلایا پھسلایا اور اگلی پہلی کو ریل گاڑی لا دینے کا وعدہ کیا۔ نومی نے وعدہ لے تو لیا لیکن بڑا ہی بددل ہوا۔ بجھا بجھا سا رہنے لگا۔ سائرہ سے تو سیدھے منہ بات نہ کرتا۔ کہنا نہ مانتا۔ اور تو اور سکول کا کام بھی دھیان سے نہ کرتا۔

بچے کی حالت سائرہ اور جمیل دونوں ہی دیکھ رہے تھے۔

"سائرہ تم نے نومی کو پہلے دن ہی ٹال دینا تھا۔ جانتی تو تھیں کہ اتنا مہنگا کھلونا دلانے کی ہم میں ہمت نہیں۔"

سائرہ نومی کو دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی تھی۔ بولی:

"جیسے تیسے اور خرچ بھی تو کرتے ہی ہیں ناہم۔ کیا قیامت آجاتی جو بچے کی خواہش پوری کر دیتے۔ کون سا روز فرمائشیں کرتا ہے۔ جانتے بھی ہو' اسے کھلونوں میں صرف اور صرف ریل گاڑی پسند ہے۔ کتنی شدید خواہش تھی اور کتنی بے رحمی سے دو دفعہ کچل چکے ہیں ہم۔"

"سوچتا ہوں اس دفعہ اسے لا ہی دوں گا گاڑی۔" جمیل نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر کہا۔

"اس دفعہ تو تم نے وعدہ کیا ہے۔ مجھ پر سے تو اس کا اعتماد اٹھ ہی گیا ہے۔ خدا کے لیے تم تو پورا کر دینا۔ یہ نہ ہو بچہ ہم سے بدظن ہی ہو جائے۔ اعتماد نامی چیز سے ناآشنا ہی ہو جائے۔"

جمیل سوچ میں ڈوبتے ہوئے بولا۔ "واقعی۔ اس کے ذہن پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔"

نومی پھر حسب سابق ایک ایک دن گننے لگا۔ گو اس دفعہ وہ کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ لیکن پھر بھی انتظار اور شوق اس کی حرکات سے مترشح ہوتا تھا۔ سائرہ اسے پیار کرتی۔ تسلی اور دلاسہ دیتی۔

"نومی۔ اس دفعہ تو ابو نے وعدہ کیا ہے۔ بس جونہی تنخواہ ملی' تمہیں ریل گاڑی

دلا دیں گے۔"

"سچ امی۔" نومی امید سے بھر جاتا۔

"بالکل سچ۔" سائرہ کہتی۔ "ابو نے تو ابھی سے پیسے جمع کرنے بھی شروع کر دیئے ہیں۔"

نومی ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھول جاتا۔ اسے کیا پتہ تھا کہ ابو نے اس ماہ سگریٹ اور چائے کا خرچہ بند کر دیا ہے۔ یہ پیسے بچا کر وہ کھلونے کی قیمت میں ڈالیں گے۔

نومی خوشی خوشی پہلی تاریخ کا انتظار کرنے لگا۔

اس کی خوشی دیکھ کر کبھی کبھی سائرہ کا دل ہول کھانے لگتا۔ وہ خوفزدہ سی ہو کر جمیل سے کہتی۔ "اس دفعہ وعدہ نہیں ٹالنا۔ بچے کو کچھ ہو جائے گا۔ اس کی خواہش پوری کر دینا۔"

"ہاں سائرہ۔ کچھ بھی ہو جائے میں اس دفعہ اسے ریل گاڑی لے کر دوں گا۔ تنخواہ بچے نہ بچے' قرض لینا پڑے' کچھ بھی ہو' نومی کی ریل گاڑی ضرور آئے گی۔ میں تنخواہ ملتے ہی گاڑی کے پیسے الگ جیب میں ڈال لوں گا۔"

"ایسا کرنا ہی ہوگا۔ نہیں تو ــــ"

"نہیں تو۔ والی کوئی بات نہیں۔ کہہ دیا ہے نا کچھ بھی ہو اسے گاڑی دلاؤں گا۔ بس تم اسے پہلی تاریخ کو میرے دفتر سے آنے پر تیار رکھنا۔ آتے ہی لے چلوں گا اسے۔"

"ٹھیک ہے۔" سائرہ نے کہا۔ وہ ہر خرچ کو پس پشت ڈال کر بچے کا کھلونا منگوانے کا عہد کر چکی تھی۔

پہلی تاریخ آئی۔

نومی سکول سے آیا۔ "امی آج گاڑی لیں گے نا؟"

"ہاں بیٹے۔ بس تم بستہ رکھو۔ کپڑے بدلو۔ کھانا کھا کر تیار ہو جاؤ۔ ابو دفتر سے آتے ہی تمہیں ساتھ لے جائیں گے اور گاڑی دلا دیں گے۔"

نومی نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔ سائرہ نے اس کا ماتھا چوم لیا۔

نومی سے کھانا بھی ٹھیک سے نہ کھایا گیا۔ اس کا من تو خوشی سے بھر گیا تھا۔ پٹڑی پر چھک چھک چلنے والی ریل گاڑی کا سہانا تصور لیے وہ اچھلتا کودتا پھر رہا تھا۔

سائرہ نے اسے دُھلے ہوئے کپڑے پہنائے۔ کنگھی کی' جرابیں اور جوتے پہنائے۔

"آج میرا بیٹا کتنا خوش ہے۔" وارفتگی کے عالم میں اس نے نومی کو لپٹا لیا۔

نومی کا تو پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہا تھا۔ ابو کے ساتھ جا کر ریل گاڑی لانے کے خیال ہی سے شاداں تھا۔

"کیا بات ہے بیٹے۔ کدھر کی تیاری ہے۔" دادی ماں نے صاف ستھرے کپڑے اور کنگھی دیکھ کر پوچھا۔

"دادی ماں!" نومی دادی کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ "آج ابو ریل گاڑی لے کر دیں گے۔ بالکل گکو ایسی۔ ابو نے کہا تھا۔ آج دفتر سے آتے ہی لے چلوں گا۔ ابھی ابو آئیں گے۔ واہ دادی ماں۔ ریل گاڑی۔ میں کسی کو بھی ہاتھ نہیں لگانے دوں گا۔ دادی ماں ریل گاڑی پتہ ہے کیسے چلتی ہے پٹڑی پر۔" نومی خود ہی ریل گاڑی بن کر دونوں ہاتھ آگے پیچھے کر کے منہ سے چھک چھک کی آوازیں نکالتے ہوئے دائرے کی صورت میں گھومنے لگا۔

دادی ماں نے سر ہلایا۔ پھر بولیں "اتنی مہنگی ریل گاڑی لے گا تو۔"

"ابو لے کر دیں گے۔" نومی خوشی پر قابو پاتے ہوئے پھر ان کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

جمیل کے آتے ہی نومی دوڑ کر باپ سے لپٹ گیا۔ "ابو آ گئے۔ آ گئے۔ چلیں نا ابو۔ آپ نے کہا تھا نا آتے ہی لے چلیں گے مجھے۔"

جمیل نے ہنس کر اس کے سر پر چپت لگائی۔ "بے ایمان سانس تو لینے دے۔"

نومی کے چہرے پر افسردگی کی سیاہی پھیلنے لگی۔ تو جمیل نے جھک کر اس کا ماتھا چوم لیا۔ "آج لے دیں گے گاڑی اپنے بیٹے کو ضرور۔ چلیں گے آج بازار۔ میں نے گاڑی کے پیسے الگ جیب میں رکھ لیے ہیں۔ یہ دیکھو۔" جمیل نے بچے کو پیسے دکھائے تو وہ خوش ہو گیا۔ سائرہ نے جلدی جلدی چائے کی ایک پیالی بنائی۔ جمیل کو دی۔ اور ہنس کر بولی۔ "چائے پی کر لے جایئے اسے۔ تنخواہ کا حساب رات کو کر لیں گے۔ ابھی ذکر ہی نہ چھیڑیں اس کا۔"

جمیل ہنس پڑا۔ چائے پی اور پیالی واپس کرتے ہوئے نومی سے بولا۔ "چلو بیٹے۔ کیا یاد کرو گے کس رئیس باپ سے پالا پڑا تھا۔"

سائرہ اور وہ دونوں ہنس پڑے۔ نومی خوشی سے باؤلا ہو کر الٹی سیدھی چھلانگیں مارنے لگا۔ جمیل اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے نکلا۔

صحن میں اماں کھڑی تھیں۔ باپ بیٹے کو دیکھا تو بولیں:

"کہاں جا رہے ہو؟"

جمیل مسکراتے ہوئے نومی کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "اس شیطان نے ناک میں دم کر رکھا ہے اماں۔ گکو کی گاڑی کیا دیکھ آیا ہے مصیبت ڈال دی ہے۔ آج سوچا ہے اسے دلا ہی دوں گاڑی۔ بازار جا رہے ہیں ہم۔"

"اچھا۔ تو بیٹے بازار جا رہے ہو تو نسرین کے بچوں کے کپڑے بھی لیتے آنا۔ وعدہ کر بیٹھی تھی میں۔ کل بھی آئی تھی کہ کپڑے منگوا دو اماں۔ نہیں منگوانے تھے تو کہتی ہی نا۔"

"لیکن اماں۔ کپڑوں کے لیے پیسے؟"

"تنخواہ نہیں ملی؟"

"ملی ہے پر کپڑوں کے لیے پیسوں؟؟"

اماں کا پارہ یک دم چڑھ گیا۔ غصے سے بولیں۔ "ہاں ہاں۔ کپڑوں کے لیے پیسے کہاں ہوں گے تمہارے پاس۔"

"اماں۔ اس دفعہ نومی کو ریل گاڑی——"

اماں جھلا کر بولیں۔ "ریل گاڑی کے لیے پیسے ہیں؟ کپڑوں کے لیے نہیں؟؟؟"

"اماں بیچارے کو تین ماہ سے ہم ٹال رہے ہیں۔ آج بمشکل——"

"ہاں ہاں۔ اپنا بچہ ہے نا' دو چار سو کا کھلونا کوئی چیز ہی نہیں۔ پچاس سو کے کپڑے ہی لانے کی ہمت نہیں۔"

پھر اماں نے ایک دم رونا شروع کر دیا۔ روتے روتے بولیں۔ "نسرین کا باپ بھی ہوتا تو خواہش پوری کرتا بیٹی کی۔ خود مر گئے مجھے محتاج کر گئے بہو بیٹے کا۔ میں بھی مر جاؤں تو اچھا ہے۔ نہ میں ہوں گی' نہ بیٹیاں آئیں گی' نہ آس باندھیں گی۔"

"اماں کیا کہہ رہی ہیں۔ اماں خدا کے لیے۔" جمیل گھبرا گیا۔ سائرہ بھی کمرے سے باہر نکل آئی۔ اماں نے جو ڈرامہ لگایا تھا اس پر اسے سخت غصہ آیا۔ وہ بھی نہ رہ سکی۔ دل کا غبار پھٹ پڑا۔

ساس بہو آمنے سامنے تھیں۔ ٹکر برابر کی تھی۔ نہ ہی تو اماں چپ رہنے والی تھیں اور نہ ہی سائرہ۔

جمیل گھبرا گیا۔ کبھی اماں کو چپ کراتا کبھی سائرہ کو۔ لیکن دونوں نے گھر سر پر اٹھالیا تھا۔

جمیل نے ہاتھ ماتھے پہ مارا۔ چیخ کر بولا۔ ”چپ ہو جاؤں دونوں۔ خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔“

لیکن

وہ چپ نہ ہوئیں۔ جمیل سمجھ نہ پا رہا تھا کہ کیا کرے۔ اسے دونوں پر بے طرح غصہ آرہا تھا۔ نومی کے لیے یہ لڑائی نئی نہ تھی۔ چند لمحے تو چپ رہا۔ پھر باپ کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر باہر کی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔ ”چلیں نا ابو۔ ریل گاڑی۔“

”ریل گاڑی کے بچے۔“ جمیل غصے سے بچے کا ہاتھ جھٹک کر چلایا۔ ”دفع ہو جاؤ۔“

نومی کا ننھا منا دل اچھل کر جیسے حلق میں آن پھنسا۔ رنگ پھیکا پڑ گیا۔ آنکھیں پھٹ سی گئیں۔ حیرت زدہ سا باپ کو دیکھنے لگا۔ جو چند لمحے پہلے خوشی خوشی اسے کھلونا دلانے جا رہا تھا۔

پر اب ؟؟؟

بیچارہ معصوم سا بچہ کیا جانتا تھا۔ غریب تو بذاتِ خود کھلونا ہوتے ہیں۔ تقدیر کے ہاتھوں کا۔

▲▲▲▲▲▲▲

عینی

آج رسم حنا تھی۔

عینی ہلکے رنگ کے زرد جوڑے میں ملبوس پلنگ کے چولی تکیے کے سہارے بیٹھی تھی—— اور اس کی سہیلیاں رشتے کی بہنیں اور چھوٹی بہن بنی اسی کمرے میں دھما چوکڑی مچائے ہوئے مہندی کے تھال سجا رہی تھیں۔ سات تھالوں میں مہندی بھری گئی تھی۔ لڑکیاں ہنستے مسکراتے گاتی اور ایک دوسری کو چھیڑتی' تھالوں پر رنگ رنگ چمکیلی پنیاں سجا رہی تھیں۔ کسی کے ہاتھ میں موم بتیاں تھیں—— انہیں تھالوں میں لگانا تھا—— خوب شور مچا تھا—— ”ہمارے تھال لڑکے والوں سے خوبصورت سجنے چاہئیں۔“ اسما نے محنت سے پنی کے پھول بوٹے بناتے ہوئے کہا:

”بالکل مات دینی چاہیے انہیں۔“ بنی ہنس کر بولی۔

ویسے وہ لوگ کافی ہوشیار ہیں۔ ان کی جیٹھانی صاحبہ فائن آرٹس کی ڈپلومہ ہولڈر ہیں۔“ اسماء نے کہا——

”اور نندیں بھی باذوق تو بڑی لگتی ہیں——“ ہنی بولی——

سب نے قہقہہ لگایا۔

سب دل کھول کر ہنس چکیں تو بنی نگاہیں گھما کر شوخی سے بولی:

”بھئی تصور میں تو ہم بھی گم ہیں—— کیوں عینی کی ڈولی میں تم بھی گھس بیٹھو گی۔“ اسماء نے شوخی سے کہا۔ سب ہنس پڑیں۔ ”واہ جی“ بنی منہ بنا کر شوخی سے

بولی۔ ”عینی کی ڈولی میں ہم کیوں گھسیں جناب! ہماری اپنی ڈولی نہیں آئے گی کیا؟“

”تو تم بھی تیار ہی تیار ہو۔“ سب نے پوچھا۔

”خالہ— اس کی شادی کے لیے بھی جلدی کر رہی ہیں۔“ عینی نے ململ کا دوپٹہ کندھوں پر پھیلاتے ہوئے کہا۔

”اوہ— اچھا!“ دو تین لڑکیوں نے تالیاں پیٹیں— ”تو تمہارا بھی عنقریب بوریا بستر گول ہے—“

”ہوں۔“ بنی خوشی سے لہرائی—

”خالہ کے بیٹے سے ہو رہی ہے اس کی شادی۔“ رملہ نے پوچھا۔

”ہاں— بہت اچھا ہے— بہت پیارا لڑکا ہے۔“ عینی نے کہا۔

”آیا ہوا ہے؟“— اسمانے پوچھا—

”دیکھ نہیں رہی بنی کتنی خوش ہے— یہ خوشی ایسی ہی تو نہیں—“ عینی نے بہن کو چھیڑا۔

”اچھا اچھا اب سمجھے—“ شاریہ نے کہا۔

”کیا؟“ سب نے پوچھا۔

”خالہ کا بیٹا ہے— کیا نام ہے اس کا—“ شاریہ نے عینی سے پوچھا۔

”کامل!“ بنی جھٹ سے بولی۔

”تو کامل اور بنی کا خوب فیئر ہو گا— بھئی گھر کی بات جو تھی۔“

نہیں بھئی نہیں!“ بنی بولی۔

”جھوٹی۔“ سب نے کہا۔ وہ بنی کے پیچھے پڑ گئیں— کوئی گدگدانے لگی۔ کوئی چٹکیاں کاٹنے لگی۔ عینی نے بنی کی جان چھڑانے کو کہا۔ ”فیئر ویئر نہیں تھا— ہمیں تو کبھی خیال بھی نہ آیا تھا— کہ خالہ یہ رشتہ مانگیں گی۔“

”کیوں؟“ کئی آوازیں آئیں۔

”بھئی وہ بہت امیر کبیر لوگ ہیں— دوسرے کراچی رہتے ہیں— زیادہ ملنا ملانا تو تھا نہیں— کبھی کبھی خالہ ادھر کا چکر لگاتی تھیں— رشی آپا کی شادی پر آئی تھیں— تو امی سے کہہ گئیں کہ بنی میری بیٹی ہے— سچی ہم نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔“

ثناء یونہی کہہ اٹھی— ”رشی آپا کی شادی پر تمہیں کیوں نہ بیٹی بنالیا؟“

بنی نے پیار سے اسے گھورا— عینی بولی۔ ”بھئی میری منگنی ہو چکی تھی۔“

پھر ٹھیک ہے— رملہ نے ہاتھ اٹھا کر فیصلہ دیا۔ سب ہنسنے لگیں۔ عینی ہنس کر بولی۔ ”ویسے خالہ کو زیادہ اچھی میں ہی لگی تھی— پر میری منگنی—“

”ہائے ہائے—“ بنی جھٹ سے بولی— ”کامل نے تو مجھے—“ ہوئی نا بات—

سب لڑکیوں نے شور مچا دیا— بنی شرما گئی— خوب ہنسی مذاق ہوتا رہا— مہندی کے تھال سج گئے— تو لڑکیاں ڈھولک لے بیٹھیں— خوب کھپ مچائی سب نے—

”مہندی لے کر لڑکے والے آئیں گے نا—“ رملہ نے پوچھا۔

”ہاں—“ بنی نے کہا ”پھر ہم جائیں گے“

”بہت دیر ہو جائے گی— ہیں نا—“ شاریہ نے کہا—

”تو کیا ہوا— آج رات تمہیں گھر تھوڑا ہی جانے دیں گے ہم—“

”نہیں بھئی— میں گھر واپس جاؤں گی۔“

”چاہے رات کے دو بج جائیں— چھوڑنے جاؤ گی تم ہی—“

بنی اور شاریہ میں واپس جانے اور یہاں رہنے میں تکرار و اصرار ہو ہی رہا تھا— کہ رشی آپا پھولوں بھرا تھال لیے اندر آئیں— یہ پھولوں کا زیور عینی کے لیے تھا— اس کے ساتھ ہی خوبرو اور باوقار سا نوجوان بھی اندر آیا— اسے عینی سے شاید کچھ پوچھنا تھا— لڑکیوں پر اک نگاہ ڈالی— یہ نگاہ تھوڑی دیر بنی پر رکی— پھوار سی نرم اور پھولوں سی مہکتی نگاہ— بنی کانوں تک سرخ ہو گئی— وہ تو عینی سے کچھ کہہ کر چلا گیا۔ ساری لڑکیاں بنی کے گرد جمع ہو گئیں۔

”کون تھا؟“

”کامل ہی نہیں یہ؟“

”دیکھا کیسے جانا ہم نے۔“

”بھئی واقعی بہت ہینڈسم ہے۔“

”لکی ہو“

”میدان مار لیا— بیٹھے بٹھائے— اتنا خوبرو آدمی مل گیا—“

”ہائے ہمارے سروں پر بھی ہاتھ پھیر دو۔“

سب لڑکیاں ہنس ہنس کر کہہ رہی تھیں— رشی آپا ان کی باتوں پر—

پھولوں کے گہنے عینی کے سامنے رکھتے ہوئے لڑکیوں سے بولیں۔۔۔ "واقعی ہماری بچی بڑی خوش قسمت ہے۔۔۔ کامل واقعی کامل ہے۔۔۔ صرف شکل وصورت کا نہیں' دل کا بھی بہت اچھا ہے۔ بڑا مخلص۔۔۔ بڑا ہمدرد۔۔۔ کل آیا ہے مجال ہے جو ایک منٹ بھی آرام سے بیٹھا ہو۔۔۔ ہر کام میں پیش پیش ہے۔۔۔ ساری لائٹنگ خود کرائی ہے اس نے۔۔۔ اب بارات کا سارا بندوبست کر رہا ہے۔"

"پاگل ہے۔۔۔" سنبیہ ہنس کر بولی۔

"کیوں؟" سب نے استفہامیہ اسے دیکھا۔

جتنا وقت یہ کام کرنے میں ضائع کر رہا ہے' اچھا تھا اتنا وقت ہماری پیاری بچی کو دے دیتا۔" رشی ہنس کر بولی۔ "اسے بھی بہتیرا دے رہا ہے وقت۔"

لڑکیوں نے شور مچادیا۔۔۔ بچی شرما گئی۔۔۔ "ہٹو آپی۔۔۔ ایسے ہی۔۔۔"

"جانتی ہوں تجھے میں۔۔۔ اتنی بھولی نہ بن۔۔۔" رشی آپا نے ہنس کر چھیڑا۔

"بھئی اس کا حق ہے۔۔۔" سنبیہ نے بچی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ سب لڑکیاں شوخی سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگیں۔

ملک صاحب نے بیڈروم کا دروازہ بند کیا۔ پھر بریف کیس سرہانے والی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔۔۔ پھر بیڈ کے قریب کھڑی حسنہ سے بولے۔ "روپے کا بندوبست ہو گیا ہے۔۔۔ لے آیا ہوں۔"

"کس سے لیا؟" حسنہ بیگم کے متفکر چہرے پر وقتی سکون آ گیا۔

"لے لیا ہے کسی سے۔۔۔ ایک دوست نے ہاتھ پکڑ ہی لیا۔ بارات کے کھانے اور فرنیچر ہی کا پیسہ دینا ہے نا۔۔۔"

"ہاں موٹی آئٹم تو یہی ہیں۔۔۔"

"بس اتنا بندوبست کر لیا ہے باقی دیکھیں گے۔۔۔ فرنیچر والے کو ابھی کچھ دیر روکا جا سکتا ہے۔۔۔ کوئی بات نہیں۔۔۔ بچی کا بھی تو اسی سے بنوانا ہے۔ فرنیچر والا اس لالچ میں دو ایک ماہ انتظار کر لے گا!۔۔۔"

"آپا تو اس کی شادی کے لیے بھی زور دے رہی ہیں۔۔۔"

"بھئی ان سے کہو عینی سے تو فارغ ہو کر کمر سیدھی کر لینے دیں۔۔۔ اتنی جلدی نہیں کر سکیں گے ہم۔۔۔ کہاں سے لائیں گے اتنا پیسہ۔۔۔ کم از کم ڈیڑھ لاکھ

روپیہ خرچ کیا ہے اس کی شادی پر۔۔۔"

"مجبوری ہے۔۔۔ مجھے تو ڈر ہی لگتا ہے۔ عینی کے سسرال والے لینے دینے کے۔۔۔"

"لڑکے والے ہیں نا۔۔۔ چلو اب کیا ہو سکتا ہے۔ جو جو فرمائش انہوں نے کی' ہم نے پوری کی۔۔۔ ایک دفعہ شادی ہو جائے۔۔۔ پھر عینی سنبھال لے گی عامر کو۔۔۔ لڑکا اچھا ہے۔ یہی تسلی ہے مجھے 'گھر والے تو۔۔۔"

"بیگم یہ وقت ایسی باتیں سوچنے کا نہیں۔۔۔ دعا کرو کل عزت و آبرو رہ جائے۔۔۔ عینی خیر خیریت سے گھر چلی جائے۔۔۔ رہ گئی بچی تو یہ گھر کا معاملہ ہے۔۔۔ اسماء آپا سے مہلت لی جا سکتی ہے۔ میں نے زمین بیچنے کا کہہ دیا ہوا ہے جس دن گاہک مل گیا سارا کام ہو جائے گا۔ تم اب کی فکر کرو۔۔۔"

"سب ٹھیک ہے۔۔۔ کھانا تیار ہے نا۔۔۔"

"ہو رہا ہے۔ وہ لوگ ساڑھے سات تک آئیں گے۔"

"یہی ٹائم دیا ہے۔"

"ان کے لیے پھولوں اور تلّے کے ہار منگوا لیے ہیں۔۔۔ اندازاً کتنے لوگ ہوں گے۔۔۔"

"ساٹھ ستر۔"

"ساٹھ ستر؟ مہندی کی رسم پر۔۔۔ پھر تو ہار کم پڑ جائیں گے۔ تم یہ بریف کیس سنبھالو۔ میں کسی کو بھجوا دوں ہار لے آئے۔۔۔ مفت کا خرچہ ہے یہ۔۔۔"

"کیا کروں عینی کی ساس نے خاص طور پر پیغام بھیجا تھا کہ جتنے لوگ آئیں گے انہیں ہار ضرور پہنائیں اور سب لڑکیوں اور عورتوں پر ٹیشو کے کام والے دوپٹے ڈالیں۔۔۔"

"اوہ مائی گاڈ۔۔۔"

"فکر نہ کریں ساری چیزیں تیار کر لی ہیں۔۔۔ عورتیں ہی آئیں گی۔۔۔ آپ ہار اور منگوا لیں۔ اور کھانے کا دیکھ لیں تیار ہو رہا ہے۔"

"تیاری تو کل کے کھانے کی بھی ہو گئی ہے۔۔۔ وہ سارا کام میں نے وحید کو سونپ دیا ہے۔ اس کی طرف سے بے فکر رہو۔۔۔ اور وہاں ہماری طرف سے مہندی جائے گی؟"

"ہاں تھال لڑکیوں نے تیار کر لیے ہیں۔۔۔ مٹھائی اور پھل بھی آ گیا ہے۔۔۔"

ملک صاحب نے اک گہری سانس لی — پھر متفکرانہ انداز میں سر ہلایا — اور بولے۔"زمین جلدی بک جائے تو اچھا ہے۔ سلیم سے میں نے دو ماہ کے لیے یہ روپیہ ادھار لیا ہے —"

"اللہ کرے گا بک جائے گی —" حسنہ نے بریف کیس اٹھاتے ہوئے کہا اور چابی لے کر سیف کھولنے لگی۔ ملک صاحب باہر نکل گئے۔

گھر مہمانوں سے بھرا تھا۔ بڑی رونق اور چہل پہل تھی۔ عورتیں تیار ہو رہی تھیں۔ لڑکیاں بالیاں بھی ادھر سے ادھر بھاگ رہی تھیں۔ کسی کے ہاتھ میں استری کیے کپڑے تھے۔ کوئی کپڑوں کی مناسبت سے میک اپ کر رہی تھی۔ کوئی کسی سے کپڑوں کے کام والے دوپٹے کا پوچھ رہی تھی' کوئی زیور پہن رہی تھی — اور کوئی مانگ تانگ کر فیشن پورا کر رہی تھی۔

"بھئی کوئی رہ تو نہیں گیا۔" کامل محسن کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا — کمرے میں بنی بھی تھی۔ جو آئینے کے سامنے کھڑی اپنے کپڑوں اور میک اپ کا آخری جائزہ لے رہی تھی۔

سب عینی کے سسرال مہندی لے کر جا رہے تھے — سب لڑکیاں اور عورتیں باہر جا چکی تھیں۔ کوٹھی کے پورچ اور ڈرائیو وے پر گاڑیاں کھڑی تھیں۔ جسے جہاں جگہ مل رہی تھی بیٹھ رہی تھی۔ بنی نے مٹھائی کے ٹوکرے اور مہندی کے تھال بھجوا کر کپڑے بدلے تھے۔ اسی لیے سب سے پیچھے رہ گئی تھی۔

کامل کو وہ لڑکیوں اور عورتوں کے جھرمٹ میں نظر نہ آئی تو وہ ڈھونڈتا ادھر چلا آیا۔

بنی نے پلٹ کر دیکھا — خوبصورت لباس اور ہلکے سے میک اپ نے اسے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ کامل اسے تکتا ہی رہ گیا۔

عینی دونوں کو یوں کھڑے دیکھ کر مسکرائی۔ دونوں کی محویت ٹوٹی تو اس نے شوخی سے کھنکارا —

کامل اس کھنکار سے چونک کر نادم سا ہو گیا — بنی نے بھی شرما کر جست بھری اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

"جاؤ بھئی جاؤ۔" عینی نے کامل سے کہا۔ پھر ہنس کر بولی۔ "کوئی بات نہیں۔"

کامل پلٹا اور بنی کے پیچھے کوریڈور میں آ گیا' جہاں وہ تیز تیز قدم اٹھائے چلی جا رہی تھی۔

"بنی!" اس نے آواز دی۔

"ہوں!" بنی نے بنا رکے کہا۔

"بھئی ٹھہرو ذرا —" وہ اس کے برابر آتے ہوئے بولا۔

"کیوں؟" بنی نے ادائے ناز سے اسے دیکھا۔

"مجھے دیکھنے تو دو —" کامل شوخ مسکراہٹ سے بولا —

"کیا۔" بنی رکتے ہوئے بولی —

"دیکھ رہا ہوں امی نے جس لڑکی کو میری شریکِ سفر چنا تھا وہ میرے معیار پر کس حد تک پورا اترتی ہے۔"

بنی نے گھبرا کر اسے دیکھا اور بولی۔ "پھر — کیا میں پوری اتر رہی ہوں آپ کے معیار پر —"

اس نے منہ بنا کر شوخی سے سر نفی میں ہلایا۔ بنی کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ وہ ایک دم ہنس پڑا اور جلدی سے بولا — "میں اپنی امی کے انتخاب کی داد دیتا ہوں۔"

"ہٹو جی — میں تو — میں تو —"

"ڈر گئی تھی — ہیں نا —"

بنی جواب دیئے بغیر بھاگ گئی — کامل کیف و سرور کے عالم میں وہیں کھڑا رہا۔

شام بارات آنا تھی — بارات کے شایانِ شان تیاریاں تقریباً ہو چکی تھیں۔

کامل اور وحید نے پنڈال بڑی خوبصورتی سے سجائے تھے۔ دولہا دلہن کے لیے سٹیج رنگین پھولوں کی کاغذی جھالریں' جھلملاتی طلے اور پنی کی لڑیاں' رنگین قمقمے' دودھیا مرکری لائٹس سب فٹ ہو چکی تھیں۔ کھانا بھی پک رہا تھا۔ اور اس کی ہلکی ہلکی خوشبو فضا میں پھیل رہی تھی — جہیز کا سارا سامان ایک کمرے میں پیک کر کے رکھ دیا گیا تھا۔ ٹرک کا انتظار تھا کہ آئے اور دلہن کے پہنچنے سے پہلے جہیز لے جائے۔ کافی اچھا اور بھاری جہیز تھا۔ ملک صاحب اور حسنہ نے بیٹی کو جہیز تو دینا ہی تھا لیکن وقت بے وقت سسرال والوں کی فرمائش پہنچتی رہی تھی۔ بادلِ نخواستہ اور مجبور ہو کر یہ فرمائشیں بھی جہیز میں اہلِ خانہ شامل کرتے رہے تھے۔ معلوم ہو چکا تھا کہ لالچی لوگ ہیں لیکن منگنی کر چکے تھے۔ شریفوں والا قول

تھا۔۔۔ بہرصورت نبھانا تھا۔

کئی بار ملک صاحب کو تاؤ آیا تھا۔ بُرا بھلا بھی کہا تھا پھر چپ ہو گئے تھے۔
استطاعت سے بڑھ کر جہیز کی مانگ تھی وہ پورا کیا تھا۔۔۔ اپنی بچی کی بھلائی اسی میں سوچی تھی۔۔۔ عینی کا رشتہ ایک بار پہلے بھی ٹوٹ چکا تھا۔ اور اس ٹوٹ پر جس طرح والدین اور بے قصور عینی ٹوٹی تھی، وہ تجربہ اب دُہرانے کی ہمت نہ تھی۔ وہ۔۔۔ اسی لیے سسرال والوں کی فرمائشیں پوری کرتے جارہے تھے۔ رشی سے کہیں زیادہ جہیز عینی کا بن گیا تھا۔۔۔ اور اس کے لیے ملک صاحب کو مقروض بھی ہونا پڑا تھا۔۔۔ بہت کچھ بنایا تھا عینی کے لیے۔

لیکن!

لیکن آج سہ پہر جب گھر مہمانوں کا بھر چکا تھا۔ شادی کی گہما گہمی رچی تھی۔ شام کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ مرد بارات کے لیے کیے گئے انتظامات کا جائزہ لے رہے تھے۔ عورتیں سجنے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ دلہن اور نوجوان لڑکیاں بال سیٹ کروانے بیوٹی پارلروں میں جانے والی تھیں کہ عینی کے سسرال سے پیغام آیا۔۔۔ بہت بھاری بھرکم پیغام۔۔۔ وہ شاید لڑکی والوں کی کمزوری جان گئے تھے۔۔۔ یہی موقع تھا۔ لڑکی والوں کے گلے پہ چھری چلانے کا۔۔۔ کہ لڑکے کو گاڑی نہیں دے سکتے تو سکوٹر ضرور دیں۔۔۔ جلدی نہیں خرید سکتے تو رقم کیش دے دیں۔

یہ فرمائش سن کر سب ہی دنگ رہ گئے۔۔۔ لڑکے والوں کی ایسی دیدہ دلیری حیران کن تھی۔ حسنہ کا دل بیٹھ گیا۔۔۔ کہاں سے اور قرضہ لیتے۔۔۔ ملک صاحب بھی بُت بن گئے۔ سارے گھر میں اک ہولناک سا سناٹا اور ویرانی پھیل گئی۔

خاندان کے چیدہ چیدہ افراد سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ پیغام لانے والے کو موقع اور حالات کی نوعیت کا سمجھایا۔۔۔ منت سماجت کی۔۔۔ بہت کچھ کہا۔ لیکن وہاں سے پھر یہی جواب ملا۔۔۔ کہ سکوٹر یا کیش۔۔۔ نہیں تو شادی نہ ہو سکے گی۔۔۔

نہیں ہوگی یہ شادی۔۔۔ ملک صاحب کا سکوت ٹوٹا تو سناٹے کو ان کی گرج نے توڑ دیا۔ جواب ہے ہماری طرف سے۔۔۔ لڑکے کو بیچنا ہے تو کوئی اور گھر ڈھونڈ لیں۔۔۔ نہیں کریں گے ہم شادی۔۔۔ نہیں کریں گے۔

یہ دوسرے بم کا دھماکہ تھا۔

جو پہلے سے بھی زیادہ لرزہ خیز اور تباہ کن تھا۔

حسنہ کا تو دل بیٹھ گیا۔۔۔ بیڈ پر بے دم سی ہو کر گر پڑی۔ رشی، بنی، وحید، کامل سب سکتے میں آگئے۔۔۔ اور عینی تو مٹی کے بُھربُھرے تودے کی طرح بستر میں گرتی چلی گئی؟۔۔۔ اس کی سہیلیاں گنگ سی رہ گئیں۔

گھر جو خوشیوں کا گہوارہ تھا کسی ماتم کدے میں بدل گیا۔ مہمان عورتیں اور مرد سرگوشیوں میں تبصرے کرنے لگے۔ کسی نے کہا اچھا ہی کیا جو ایسے لالچی لوگوں سے ناطہ توڑ دیا۔ کسی نے کہا بُری بات ہے۔ عین موقع پر یوں جواب دے دینا مصلحت کے خلاف ہے۔ جہاں اتنا کچھ دے رہے تھے سکوٹر بھی لے دیتے۔ بیٹی کا بار تو سر سے اتر جاتا۔۔۔

بیٹی کا بار سر سے نہیں اترا تھا۔ اور قرضے کا بار سر پر چڑھ گیا تھا۔ کل اور آج کے کھانے ہی پر جو خرچ اٹھا تھا۔۔۔ فضول ہی گیا تھا۔۔۔ یہی سوچ سوچ کر تو حسنہ کا دل بار بار بیٹھ رہا تھا۔۔۔ غشی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے خاندان کے افراد ملک صاحب کو سمجھا رہے تھے۔ لیکن وہ نہ کر چکے تھے۔ اور یہ نہ پتھر پر لکیر تھی۔ اس نہ سے گھبرا کر لڑکے والے بھی بھاگے آئے۔ ندامت ظاہر کی۔۔۔ معافی مانگی۔۔۔ لیکن جو ناطہ توڑ دیا گیا تھا اسے اس طرح جوڑنے پر ملک صاحب آمادہ نہ ہوئے۔

وحید ملک صاحب کے کمرے میں آیا۔ وہ منہ سر لپیٹے پڑے تھے۔ حسنہ نے تھوڑی دیر ہی پہلے آنکھیں کھولی تھیں۔ دوپہر اس سانحے کے بعد ویلیم دے کر سلا دیا تھا۔ وہ اب بستر میں اُٹھ کر بیٹھی تھی۔ ویران آنکھوں اور بوجھل دل کو تھامے ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ عینی کا خیال آرہا تھا۔ جو ٹوٹ کر بکھر گئی تھی۔ وحید نے غمناک آواز میں ملک صاحب کو پکارا۔ ''بھائی جان۔''

''ہوں۔''

''کھانے کا کیا کریں۔۔۔ سارا کھانا تیار ہے۔۔۔''

ملک صاحب اٹھ بیٹھے۔۔۔ جانے غم کے کیسے ٹھاٹھیں مارتے سمندر تھے، سینے کے اندر۔ پھر بھی حوصلے سے بولے۔ ''کرنا کیا ہے بھئی۔۔۔ گھر میں مہمان تو ہیں کچھ انہیں کھلا دو۔۔۔ کچھ یتیم خانے میں بھجوا دو۔۔۔ اب اور کیا ہو سکتا ہے۔ مہمانوں نے تو کھانا کھانا ہی ہے۔ خوشی سے نہ سہی۔۔۔''

''خوشی سے کیوں نہیں ملک بھائی۔'' کامل کی امی آمنہ جو چند لمحے پہلے ہی

کمرے میں آئی تھی بولی۔

"آمنہ آپا— " حسنہ کی آواز بھرا گئی— "خوشی کا موقع مقدر میں تھا ہی نہیں— "

"کیوں نہیں— " آمنہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ حسنہ 'ملک اور وحید نے اس کی مسکراہٹ کو بغیر کچھ جانے بوجھے دیکھا۔

آمنہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "جو کھانا خوشی کے موقع کے لیے بنا تھا اور خوشی کے موقع پر ہی کھایا جائے گا— عینی کی شادی آج ہی ہوگی۔"

"کیا؟؟" کوئی کچھ نہ سمجھا۔

"ہاں ملک بھائی— میں نے فیصلہ کیا ہے۔" آمنہ نے پورے خلوص سے کہا۔ "جو سانحہ گزر گیا ہے اسے بھول جائیے۔ میں کامل کی شادی عینی سے کروں گی— کامل کو میں نے رضامند کر لیا ہے۔"

لیکن

"لیکن ویکن کا موقع ہے نہ وقت— کامل کو آپ نے بیٹا بنانا تو منظور کر ہی لیا ہوا ہے۔ بنی نہ سہی عینی سہی— بنی ابھی چھوٹی ہے اور اللہ رکھے میرا افاضل بھی ہے۔"

"آمنہ آپا!" حسنہ بے اختیار سی ہو گئی۔

"کیوں ملک بھائی— آپ کا کیا خیال ہے؟" آمنہ نے اس کی اجازت چاہی۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں— اپنی بہن سے صلاح کر لو۔"

"صلاح مشورہ کیا کرنا— " آمنہ نے کہا— "اُٹھیے آپ لوگ اللہ کا نام لے کر یہ فریضہ ادا کیجیے۔"

"اچھی بات ہے بھائی جان۔ آمنہ آپا نے ہم سب پر یہ قدم اٹھا کر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اُٹھیے باہر چلیے— اس سانحے کو بھول کر خوشی کے شادیانے بجاتے ہیں ہم لوگ۔"

"بالکل بالکل۔" آمنہ مسکرائی۔ حسنہ اور ملک صاحب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

عینی تکیوں کے سہارے بیڈروم میں نیم دراز تھی۔ اس کا رنگ زرد سوتی جوڑے کی طرح پیلا پڑ چکا تھا۔ آنکھیں ویران اور ہونٹ خشک تھے۔ بنی اس کے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔ رو رو کر آنکھیں سجالی تھیں۔ غم سے نڈھال ہو رہی تھی۔ سہیلیاں جا چکی

تھیں۔ سارا سامان بے ترتیب پڑا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ تو بنی اٹھی۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں رشی۔ دروازہ کھولو۔"

بنی نے دروازہ کھولا تو رشی اندر آ گئی۔ وہ بنی کو خوشخبری سنانے آئی تھی اور آمنہ خالہ کے فیصلے سے مطلع کرنے آئی تھی۔ اس نے آتے ہی عینی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور آمنہ خالہ کے فیصلے کا مژدہ سنایا۔

"کیا؟— " عینی اور بنی دونوں کے ہونٹوں سے بے اختیار یہ وسیع مفہوم کا چھوٹا سا لفظ پھسلا— رشی نے ایک لمحہ کو بنی کی طرف دیکھا۔ پھر عینی کو ساری صورتِ حال سمجھانے لگی۔

"نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے رشی آپا۔" عینی نے سر زور اور نفی کے انداز میں ہلایا۔

"یہ ہو رہا ہے— " رشی نے کہا۔ "گھر کی عزت رہ جائے یہ تھوڑی بات ہے۔" رشی ایک لمبی چوڑی تقریر کرتے ہوئے عینی کو سمجھانے لگی۔ خالہ نے کتنی ہمت اور خلوص سے اس گھر کو ماتم کدہ بننے کی بجائے پھر سے خوشیوں کا گہوارہ بنا دیا تھا— اس فیصلے سے ماں باپ کتنی اذیت سے بچ گئے تھے۔ کتنے نقصان سے محفوظ ہو گئے تھے— لگا لگایا کام آ رہا تھا— بیٹی کا بوجھ سر سے اتر رہا تھا۔

عینی سن رہی تھی— اس کی نگاہیں بنی پر تھیں۔ جو سفید پڑ گئی تھی جس کی آنکھوں میں ایک حیران کن سوال تھا! جو چپ تھی لیکن چُپ چلّا چلّا کر کہہ رہی تھی۔ "یہ کہاں کا انصاف ہے؟ یہ کیسا ظلم ہے— "

عینی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا— رشی کی باتوں پر ہنسے یا چیخیں مار مار کر روئے۔

رشی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "سنبھلو عینی— حالات کا یہی تقاضا ہے— تم نہیں جانتیں کیا؟ امی اور ابو کی حالت کیسی ہو گئی تھی— خالہ کے بروقت فیصلے نے انہیں پھر سے زندگی کی خوشیاں لوٹا دی ہیں۔ جانتی ہو کس طرح یہ شادی کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ کم از کم بیس ہزار کے ابو مقروض ہو چکے ہیں۔ کھانے پر بھی پتہ ہے کتنا خرچ ہوا ہے۔ سب کا سب ضائع جاتا— اس نقصان سے بچ گئے ہیں ابو— بیٹی کا بار سر سے اتر رہا ہے۔ سوچو تو سہی— "

عینی اپنے مہندی لگے ہاتھوں کو تکے جا رہی تھی— رشی چپ ہوئی تو حسرت

سے تکتے ہوئے گھمبیر لہجے میں بولی:

"میرے ہاتھوں پر کسی اور کے نام کی مہندی لگی ہے رشی آپا۔"

"وہ تو گیا اب جہنم میں۔" رشی غصے سے بولی۔

"ٹھیک ہے آپا لیکن یہ رنگِ حنا—— چھٹتے چھٹتے ہی چھٹے گا نا—— آپ لوگ چاہتے ہیں کہ——"

"بس بند کرو یہ جذباتی باتیں——" رشی نے غصے سے کہا۔ "اپنے سے زیادہ امی ابو کا سوچو—— ان کو مصیبت میں ڈالنے کی بجائے نکالنے کا سوچو——"

"ہوں——" عینی کے منہ سے تلخ سی آواز نکلی۔ پھر بولی۔ "آپ چاہتی ہیں امی ابو کا لگا لگایا ضائع نہ جائے۔ بیٹی کا بار سر سے اُتر جائے اور——"

"ہاں ہاں—— ہاں۔" رشی کو اب عینی کی باتوں سے جھنجھلاہٹ ہونے لگی تھی۔

"اچھا——" اس نے اک آہ بھر کر بنی کو دیکھا اور بولی:

"ٹھیک ہے ایسا ہی ہوگا——"

"اچھی بہنا۔" رشی نے اس کا ماتھا چوم لیا—— اور بنی پر نگاہ ڈالے بنا کمرے سے نکل گئی۔ اسے امی ابو ہی نے یہ فیصلہ سنانے اور منوانے کو بھیجا تھا—— وہ انہیں عینی کا خوش کن فیصلہ سنانے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی عینی نے بنی کو لپٹا لیا۔ دونوں بے اختیار ہو کر رونے لگیں۔

نکاح نامے پر عینی کے بجائے بنی کے دستخط تھے۔ اور ایجاب و قبول کے مراحل سے بھی عینی نہیں بنی گزری تھی۔

یہ انکشاف سب کے لیے حیران کن تھا۔ کامل کے لیے بھی—— لیکن اس بات سے اس کا چہرہ کِھل اٹھا تھا——

ملک صاحب حیرت زدہ سے تھے۔ یہی حال حسنہ، آمنہ اور رشی اور دوسرے لوگوں کا بھی تھا۔ سب لپک کر اس کے کمرے میں آئے جہاں عینی اور بنی تھیں۔ بنی بیڈ پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ عینی نے اپنا زرد دوپٹہ اس پر ڈال دیا تھا۔ خود سپید دوپٹہ اوڑھے بیڈ کا چولی تکیہ پکڑے بڑے سکون سے کھڑی تھی۔

"یہ—— یہ—— سب—— کیا؟" ملک صاحب نے عینی سے پوچھا۔

عینی مسکراتے ہوئے آگے بڑھی۔ باپ کے قریب آ کر بولی۔ "ابو—— آپ

اور سب یہی چاہتے تھے نا لگا لگایا ضائع نہ ہو—— خوشی اور چاہت سے بنایا ہوا کھانا بھی غارت نہ جائے اور—— اور—— بیٹی کا بار بھی سر سے اتر جائے۔ بیٹی صرف میں ہی تو نہیں—— بنی بھی تو ہے۔ وہ—— اسے آپ نے کامل سے منسوب——"

"اوہ میری بچی——" ملک صاحب نے عینی کو سینے سے لگا کر اس کا سر چوم لیا—— پھر وہ اسے لپٹا لپٹا کر پیار کرتے ہوئے بے اختیار ہو کر رو دیئے۔ عینی بھی ان کے سینے سے لگ کر ہچکیوں سے رونے لگی۔

حسنہ، آمنہ، رشی اور دیگر لوگوں کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں—— بنی بھی سسک اٹھی۔

سب رو رہے تھے۔

کس کے آنسو خوشی کے تھے اور کس کے غم کے—— اس وقت کوئی بھی تشخص نہ کر پا رہا تھا۔

ذات کا کرب

آج پھر جھگڑا ہوا تھا۔

یہ جھگڑا پہلے لڑائی جھگڑوں سے کچھ زیادہ ہی زوردار تھا۔ دونوں حلق اور پھیپھڑوں کی پوری قوت استعمال کر رہے تھے — سلمیٰ تو صرف گلا ہی پھاڑ رہی تھی۔ ناصر نے آج لڑائی کو مار کٹائی بھی بنا دیا تھا — طیش میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے اس نے سلمیٰ کو دھکے دیئے تھے — کمرے سے گھسیٹ کر برآمدے میں لے آیا تھا — سلمیٰ پوری قوت سے چیختے ہوئے اندر جانے کو لپک رہی تھی —

"نکل جاؤ میرے گھر سے ذلیل عورت' میں تمہیں ایک لمحہ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔"

"نہیں نکلوں گی — نہیں نکلوں گی یہیں رہوں گی — اور اپنا حق لوں گی —"

"بکواس بند کرو۔"

"اس وقت تک نہیں کروں گی جب تک میرا حق مجھے نہیں دو گے — خود غرض انسان دیکھتی ہوں کیسے نکالتے ہو مجھے اس گھر سے —"

وہ تیزی سے ناصر کی گرفت سے نکل کر اندر چلی گئی۔ کھٹاک سے دروازہ بند کر لیا۔ ناصر نے غصے سے دو تین لاتیں دروازے کو رسید کیں۔

لان میں کھڑے دونوں نوکر یہ تماشا دیکھ کر دم بخود سے تھے۔ صاحب اور بیگم کے لڑائی جھگڑے سے لاعلم نہیں تھے۔ انہوں نے تو یہ بات برابر والی کوٹھیوں کے

نوکروں کو بھی منتقل کر دی تھی اور ان نوکروں نے اپنے مالکوں سے چٹخارے لے کر بیان کی تھی لیکن آج تک لڑائی جھگڑے بند کمروں ہی میں ہوتے رہے تھے — کبھی کبھی اونچی آوازوں میں بھی شور شرابا ہو جاتا تھا — اور ہمسایوں کو سن گن پڑ جاتی تھی۔

لیکن

آج تو حد ہو گئی تھی۔

ناصر ہانپ رہا تھا پھر بھی غصے سے بل کھا کھا کر سلمیٰ پر پل رہا تھا۔ سلمیٰ نے اس کے دو مکے کمر پر کھائے تھے پھر بھی زہر ناک لہجے میں اسے کوس رہی تھی اور کہے جا رہی تھی "مجھے اپنا حق چاہیے — اپنا بچہ — اپنا بچہ جو میرے گوشت پوست سے بنا ہو جو میری گود میں آئے تو میرے وجود میں ممتا کی آبشاریں پھوٹ پڑیں —"

"بکواس بند کرو —" ناصر غصے سے دروازے کو ٹھڈے مارتے ہوئے کہے جا رہا تھا۔ "بند کرو بکواس کمینی عورت — ڈائن — میں سمجھتا تھا تو میرے بچوں کو ماں بن کر پال رہی ہے —"

"ہاں میں نے انہیں پالا ہے لیکن وہ میرے بچے نہیں ہیں۔ مجھے اپنا بچہ چاہیے۔"

سلمیٰ چیختے ہوئے کہہ رہی تھی — اس کے چلانے میں دیوانگی کا عنصر غالب آ رہا تھا۔

ناصر جوان چھوکرا تھا نہ سلمیٰ — ناصر پچپن سے بھی اوپر تھا اور سلمیٰ بھی انتالیس چالیس سال کی ہو رہی تھی۔ دونوں جاہل' اجڈ اور گنوار بھی نہیں تھے — سلمیٰ بی اے بی ایڈ تھی اور ناصر بھی بھاری بھرکم ڈگریاں لیے ہوئے تھا۔

لیکن

اس وقت وہ بدترین جاہلوں کی طرح لڑ رہے تھے۔ تہذیب اور شائستگی لگتا تھا دونوں کو چھو کر بھی نہیں گئی — غصے کا بھوت دونوں ہی پر سوار تھا۔ اس بھوت نے ان کی شخصیتوں اور وجودوں سے تہذیب اور شائستگی کا ہر پہلو نوچ لیا تھا۔

ان کی شادی تقریباً پانچ سال ہوئے ہوئی تھی — چار سال تو نوکروں نے بھی کبھی لڑائی جھگڑے کی بات نہیں سنی تھی — لیکن پچھلے سال سے لڑائی جھگڑے ہو رہے تھے۔ پہلے تو تکرار بیڈ روم تک رہی پھر دوسرے کمروں میں پھیلی اور نوکروں کے کانوں میں پڑی — انہی سے ہمسایوں تک پہنچی۔ ناصر اور سلمیٰ کا رویہ اتنا مہذب رہا تھا کہ کسی نے نوکروں کی بات پر یقین کیا اور کسی نے بے پر کی اڑانے والی بات جانا —

لیکن آج

آج جو کچھ ہو رہا تھا—— نوکروں کے واسطے کی ضرورت ہی نہ رہی تھی۔

شور شرابا سن کر برابر والی کوٹھی کے ٹیرس پر گھر کی بیبیاں چڑھ آئی تھیں اور اُچک اُچک کر برآمدے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ دوسری طرف والی کوٹھی کے مکین بھی درمیانی گارڈینیا کی باڑ کے نیچے کان کھڑے کیے سن رہے تھے۔ پتوں اور شاخوں کو ہٹا کر دیکھنے کی بھی کوشش کر رہے تھے۔

ہمسائے بھی حیران تھے۔ آپس ہی میں قیاس آرائیاں اور چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔

"اپنا بچہ——"

"تمہارے بچے——"

کچھ سمجھ نہ پا رہے تھے کہ اصل موضوع کیا ہے۔

پانچ سال پہلے ہی کی بات تھی۔

ان دنوں سلمٰی حیات گرلز ہائی سکول میں سیکنڈ مسٹریس کے عہدے پر فائز تھی۔ وہ کئی سالوں سے اس سکول میں پڑھا رہی تھی۔ متوسط طبقے سے تعلق تھا۔ بی اے کیا ہی تھا اور گھر میں اس کی شادی کے تذکرے ہوئے ہی تھے کہ ابا اچانک سارا بار اس کے کندھوں پر ڈال کر راہیٔ ملکِ عدم ہوئے۔ ان کی آمدنی اتنی تو نہ تھی کہ گزربسر فراغت سے ہوتی پھر بھی کھینچا تانی سے وقت گزر ہی رہا تھا—— سلمٰی کے تینوں چھوٹے بھائی پڑھ رہے تھے—— وہ سب سے بڑی تھی۔ بھائیوں کا مستقبل بنانے کے لیے اس نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی۔ بی ایڈ کر کے اس سکول میں ملازمت کر لی اور پھر ملازمت اس سے ایسی چمٹی کہ اس کا اپنا آپ رہا ہی نہیں، وہ کمانے والی مشین بن گئی۔ نوکری کے ساتھ ساتھ ٹیوشنیں کیں اور زیادہ سے زیادہ کمانے کے لیے اپنی جوانی کی پرواہ کی نہ مستقبل کی۔ اماں بھی مجبور تھی یا خود غرض بن گئی تھی۔ بیٹے مستقبل کا آسرا تھے انہیں پوری تعلیم دلانا ضروری تھا—— سلمٰی کی شادی کے تذکرے اب بھول کر بھی ان کی زبان پر نہ آئے۔

یوں سلمٰی کی عمر کو تیرہ چودہ بے رحم سال روند گئے۔ وہ نوجوان نوخیز چنچل لڑکی نہ رہی تھی۔ 33 سالہ ادھوری عورت بن گئی۔ بھائیوں کو اس نے بچوں کی طرح

سمجھا، انہیں پڑھایا لکھایا۔ شادیاں کیں۔ گھر آباد ہوتے ہی وہ اپنی اپنی بیوی میں مگن ہو گئے۔ اب ان کے بچوں کو اس نے بچے جانا—— قدرت نے اسے ممتا کے خوبصورت جذبوں سے نوازا ہوا تھا اسی لیے وہ بھائیوں کے بچوں پر بھی جان چھڑکتی تھی۔

اماں بیٹوں سے فارغ ہوئیں تو سلمٰی کا بھی خیال آیا—— اس کی عمر بڑھتی جا رہی تھی۔ اب انہیں اس بات کی فکر دامن گیر ہوئی کہ جیتے جی سلمٰی کا گھر بھی آباد کر دیں——

وہ اب اٹھتے بیٹھتے سلمٰی کی شادی کا ذکر کیا کرتیں—— وقت گزرنے پر آنکھ کھلی تھی لیکن اس کا جواز تھا—— اب بھی وہ مایوس نہیں تھیں—— سلمٰی کے لیے انہوں نے رشتہ داروں، ملنے ملانے والوں سبھی سے کہہ رکھا تھا——

"کوئی اچھا سا رشتہ ہو تو سلمٰی کا دھیان رکھنا۔"

"زندگی کا کیا بھروسہ—— چاہتی ہوں آنکھیں بند ہونے سے پہلے سلمٰی کے ہاتھ پیلے کر دوں۔"

"مناسب سا رشتہ مل جائے تو اچھا ہے۔"

لیکن اس عمر میں اماں کی پسند کا رشتہ کہاں سے ملتا—— رنڈوے یا طلاقی کا تو اماں نام سننا بھی نہ چاہتی تھیں اور ظاہر ہے اتنی عمر میں کوئی بدنصیب مرد ہی کنوارہ بیٹھا رہ جاتا ہوگا——

اماں مایوس ہونے لگیں۔ سلمٰی کو دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتیں۔ اس نے جس طرح بھائیوں کی خاطر محنت کی تھی اماں کے سینے کا بوجھ بن گئی تھی۔

اس دن سلمٰی سکول سے آئی تو کاپیوں کا پلندہ بمشکل اٹھائے ہوئے تھی۔

اماں نے جلدی سے بڑھ کر اس کے صحن میں آتے ہی آدھی کاپیاں اس سے لے لیں۔ ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولیں:

"کب کھلے گا تیرا نصیب، تھک گئی ہو یہ بوجھ گھسیٹ گھسیٹ کر——" سلمٰی ہنس پڑی۔ بولی۔ "اماں خواب دیکھنے چھوڑ دو—— ساری پریشانی ختم ہو جائے گی۔"

اماں کے ساتھ اس نے بھی باقی کاپیاں تخت پر رکھ دیں۔ کمرے سے چھوٹی بھابی کا منا نکل کر سلمٰی کی ٹانگوں سے چمٹ گیا۔ "پھپھو ٹافی——"

"اے ہٹو بھی۔" اماں نے بچے کو جھڑکا۔ "دم تو لینے دے اسے۔"

"نہ اماں۔" سلمیٰ نے جھک کر بچے کو بازوؤں میں بھر لیا۔

"انہیں کچھ نہ کہا کر۔ یہ تو پھول ہیں پھول۔ جی چاہتا ہے ہر وقت انہیں چہکتا مہکتا دیکھوں—— تو اپنی مایوسی ان پر——"

"مایوسی کیسی۔" اماں جھلاّ گئی۔

وہ ہنس کر بولی۔ "اماں—— مایوسی ہی تو مسلط رہتی ہے۔ تم کو اسی لیے تو کہتی ہوں خواب دیکھنا چھوڑ دے۔ تیری بیٹی کی شادی کی عمر گزر گئی۔ پورے پینتیس سال کی ہو گئی ہے۔ اب تو بالوں میں چاندی کے تار بھی چمکنا شروع ہو گئے ہیں اور تُو اب بھی آنکھوں میں خواب سجائے ان کی خوبصورت تعبیر کی راہ تک رہی ہے—— ہونہہ——"

اماں کا جی جل گیا۔

سلمیٰ سیڑھیوں کی طرف بڑھی اور اوپر اپنے کمرے میں آ گئی۔

وہ اماں سے کبھی یہ بات ہنس کر، کبھی غصے اور کبھی تمسخر سے کہہ دیا کرتی لیکن اس بات سے بھی بے خبر نہ تھی کہ وقت گزر جانے کے باوجود یہ خواب اس کی اپنی آنکھوں میں بھی تو پوری تازگی سے موجود ہیں۔ ان کی تعبیر کی آس لگائے وہ خود بھی بیٹھی ہے۔ ایک پیارا سا گھر، دکھ سکھ کا ساتھی اور ہنستے مسکراتے کلکاریاں کرتے بچے۔

بچے تو اس کی کمزوری تھے۔

اتنی عمر کو پہنچ کر بھی وہ شادی کی شدت سے خواہشمند تھی تو صرف اور صرف اس لیے کہ اسے بچے چاہئیں تھے۔ گول مٹول، پیارے پیارے، صحت مند بچے۔ اسے تو یوں لگتا تھا اس کے وجود کے اندر ہر وقت ممتا کی آبشاریں پھوٹتی رہتی ہیں۔ ان آبشاروں کی پھوار سے وہ اکثر بھائیوں کے بچوں کو سیراب کرتی رہتی۔ گلی محلے کے بچوں پر بھی شفقت سے یہ پھوار برساتی۔ امیر غریب، صاف ستھرے، میلے کچیلے سبھی بچے اسے پیارے لگتے تھے۔ وہ اپنا پیار، اپنی سرسراتی ممتا ان پر نچھاور کرتی تو اسے سکون ملتا لیکن جس سکون کی اس کی ممتا متلاشی ہوتی وہ حاصل نہ ہوتا۔ وہ ادھورا پن بری طرح محسوس کرتی۔

وہ سکول کی مہترانی کے کالے کلوٹے بچے کو بھی اکثر گود میں اٹھا لیتی، چمکارتی پیار کرتی۔ اس کی کولیگز اکثر کراہت کھا کر کہتیں:

"سلمیٰ کیسے اٹھا لیتی ہو اسے——"

"یہ بچہ ہے معصوم بے ضرر—— مہکتا ہوا پھول——"

"بہت شوق ہے بچوں کا——"

"کیا کروں شوق سے بھی بڑھ کر کوئی جذبہ ہے۔"

"شادی کر لو، پھر بچوں سے گھر بھر لینا——"

"ارادہ تو اپنا بھی یہی ہے۔" وہ ہنس کر کہتی—— "لیکن شادی ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ مجھے تو ڈر لگنے لگا ہے۔"

"کس بات کا۔"

دو چار سال اور لڑھک گئے تو کوکھ ہی نہ سوکھ جائے کہیں—— بچوں کی پھلواری مہکنے کے امکانات ختم ہو جائیں گے—— پھر شادی کا فائدہ؟"

اسے واقعی وہم سا ہو گیا تھا—— کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی کوکھ سوکھتی چلی جائے گی۔ چند سال ہوئے تھے—— اس کی شادی اب بھی ہو جاتی تو بچوں کی حسرت پوری ہو سکتی تھی۔

انہی دنوں اماں کی چچی زینت ناصر کا رشتہ لے آئی۔ ناصر اس کے بیٹے کا دوست تھا۔ اس کی بیوی پانچویں بچے کو جنم دیتے وقت ختم ہو گئی تھی—— ناصر پچاس کے پیٹے میں تھا۔ بڑے دونوں بیٹے پندرہ اور تیرہ سال کے تھے۔ دونوں ایبٹ آباد میں برن ہال میں تعلیم پا رہے تھے۔ ایک بیٹی چوتھی کلاس میں تھی۔ اس سے چھوٹی دوسری میں۔ چھوٹا بچہ جسے ماں کے ہاتھوں کا لمس بھی نصیب نہیں ہوا تھا، سال بھر کا ہو چکا تھا—— ناصر تو دوسری شادی پر رضامند نہیں تھا لیکن بچوں کی دیکھ بھال نہیں ہو سکتی تھی۔ نوکر اور آیا کے ہوتے ہوئے بھی سال بھر کا جو عرصہ اس نے گزارا تھا وہی جانتا تھا۔ گھر میں ایک عورت کی ضرورت تھی۔ پیسے والا آدمی تھا۔ رشتے تو نوجوان لڑکیوں کے بھی مل رہے تھے لیکن اسے منظور نہ تھے۔ اپنے سے زیادہ اسے بچوں کے لیے عورت کی ضرورت تھی۔ چچی نے سلمیٰ کے متعلق بات کی تو ناصر نے سنجیدگی سے سوچا۔ پینتیس سالہ عورت اس کے لیے موزوں تھی۔ پڑھی لکھی بھی تھی—— اور سکول میں درس و تدریس سے منسلک ہونے کے باعث اسے یقین تھا کہ اس کے بچوں کی تربیت کے لیے یہ عورت صحیح ہو گی۔

چچی ناصر کو ذہنی طور پر تیار اور آمادہ کرنے کے بعد ماں کے پاس آئی۔

"رشتہ لائی ہوں سلمٰی کے لیے۔"

"سچ!"

"ہاں۔"

"کون ہے؟"

"اپنے صدیق کا دوست۔"

اماں نے اک گہری سانس چھوڑتے ہوئے صدیق کی عمر کے حوالے سے پوچھا۔ "رنڈوہ ہے یا طلاقی——"

"رنڈوہ۔"

"بچے بھی ہوں گے——"

"پانچ بچے ہیں——"

"پانچ—— بچے——" اماں کی کھلی آنکھیں چوپٹ کھل گئیں۔

چچی نے سر ہلاتے ہوئے کہا "پیسے والا نیک شریف آدمی ہے۔ دولت مند کی عمر نہیں پوچھی جاتی۔ اب بھی جوانوں سے جوان دکھتا ہے۔ تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ چار تو اپنے جوگے ہو گئے ہیں۔ گود والا سال بھر کا ہے۔"

"تمہاری مت تو نہیں ماری گئی چاچی——"

"مت تو اپنی نہ مار—— جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ بیٹی کو کب تک کنوارپنے کی سولی پر لٹکائے رکھے گی۔ کچھ ہوش کر۔ چالیس کو پہنچ رہی ہے۔ تجھے اب بھی آس ہے کہ کوئی کنوارہ چھیل چھبیلا اس کا ڈولہ اٹھائے گا۔"

اماں ہونقوں کی طرح چچی کا منہ تکنے لگی۔

"جب کنوارہ چھیل چھبیلا ملنے کا وقت تھا تو تم لوگوں نے اپنی غرض کی بھٹی میں بچی کو جھونکے رکھا—— اب تو وقت گرفت سے نکل کر بہت دُور جا چکا ہے۔ جو کچھ مل رہا ہے اسی پر قناعت کر لے۔"

"لیکن چاچی—— پانچ بچے——!"

"کیا ہوا بچے کون سے اس پر بھاری ہوں گے—— دو تو ہوسٹل میں ہیں۔ تین گھر پہ ہیں۔ ان کے لیے بھی نوکر چاکر موجود ہیں۔ سجی سجائی اے اتنی بڑی کوٹھی ہے۔ گاڑی ہے۔ پیسہ ہے—— پھر ناصر خود بھی پڑھا لکھا ہے۔ ملنے کو تو اسے نوجوان لڑکیوں

کے رشتے مل رہے ہیں۔ تو کن خیالوں میں بیٹھی ہے—— اے بی بی یہ وقت ہے نخرے کرنے کا؟ ضرورت دیکھ ضرورت۔ کتنے آ چکے ہیں اب تک رشتے؟"

"لیکن چاچی پچاس سال کا آدمی—— پانچ بچے—— اپنی بیٹی کوئی بیگار کا مال ہے جو جھونک دوں بھٹی میں——"

"نوکری کرتے کرتے لڑکی کا حلیہ بدل گیا ہے۔ چہرے پر شگفتگی رہی ہے نہ رونق—— دو چار سال اور گزر گئے نا—— تو دس بچوں والا رنڈوہ بھی نہیں پوچھے گا آ کر——"

چچی نے اپنے طور پر بہت کوشش کی لیکن اماں اپنی پڑھی لکھی کماؤ بیٹی کے لیے اس رشتے کو ذہنی طور پر قبول نہ کر سکی۔

چچی نے براہِ راست سلمٰی سے بات کرنے کا سوچا۔ وہ بچی تو تھی نہیں۔ زمانے کے نشیب و فراز سے گزری ہوئی سنجیدہ عورت تھی اب۔

چچی نے ملائمت سے سمجھایا۔ اونچ نیچ بتائی۔ وقت کے تقاضے اور نزاکت کا ذکر کیا۔ ان بچوں کا ذکر کیا جو گلاب کے مہکتے پھول تھے لیکن بن ماں کے ان بچوں کو وقت کی آندھی اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی—— "بیٹی تمہاری شادی وقت پر ہو گئی ہوتی تو تیرے بچے بھی اتنی عمروں کے نہ ہوتے؟ بڑے پیارے اور اچھے بچے ہیں اور ان پر تو ہر ایرا غیرا ترس کھاتا ہے۔ پیار کرتا ہے۔ تو نبھاہ نہ کر سکے گی؟"

سلمٰی سنتی رہی۔ چچی ناصر کی تعریفیں، اس کے روپے پیسے کے تذکرے کرتی رہی۔ لیکن سلمٰی کے ذہن میں ان بن ماں کے بچوں کے عکس لہرا رہے تھے۔ اسے جانے کیا ہونے لگا۔ اندر ہی اندر ممتا کی آبشاریں زوروں سے گزرنے لگیں۔ ان ان دیکھے بچوں پر اسے ٹوٹ کر پیار آنے لگا۔

اس نے حامی بھر لی۔

اماں نے سنا تو ششدر رہ گئیں۔

"تجھ سے عقلمند ہے تیری بیٹی۔" چچی نے اماں کو دلاسہ دیا۔

"سوچ سمجھ کر حامی بھری ہے اس نے۔ سائبان تو مل جائے گا اسے—— اپنے گھر کی تو ہو جائے گی۔ دل پر جو اس کے بوجھ کا پہاڑ اٹھائے بیٹھی ہے تو وہ تو اتر جائے گا—— پھر تسلی رکھ عیش کرے گی سلمٰی—— ملکہ بنے گی اس گھر کی—— دیکھ لینا——"

اماں چپ رہیں۔

اور

پھر اگلے ماہ سلمیٰ کا نکاح بڑی خاموشی اور سادگی سے ناصر سے ہو گیا۔ ناصر نے معقول مہر باندھا۔ زیورات اور ملبوسات بھی دیئے — صرف یہی نہیں، پہلے ہی دن اس گھر اور سیف کی چابیاں اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "سلمیٰ یہ سب کچھ تمہارا ہے۔ میں اور میرے بچے سب تمہارے ہیں۔ تم سے توقع یہی ہے کہ ہم سب کو اپنا ہی سمجھو گی۔ اس گھر کو اور مجھے اور میرے بچوں کو اپنا سمجھو گی۔"

سلمیٰ کو ذرا بھی برا نہیں لگا کہ ناصر نے اس سے پہلی بات ہی گھر بار اور بچوں کی کی ہے۔ وہ تو ذہنی طور پر تیار تھی — اس نے ناصر کو یقین دلایا۔

"آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہ ملے گا۔ میری حتی المقدور یہی کوشش ہو گی۔ بچوں کے متعلق آپ تسلی رکھیں۔ میں ان پھولوں کی آبیاری پوری تن دہی سے کروں گی۔"

"شکریہ سلمیٰ — تمہارے ان الفاظ نے مجھے بہت سہارا دیا ہے۔ خدا کرے تم جیسا کہہ رہی ہو ویسا ہی کر دکھاؤ —"

سلمیٰ نے دل میں عزم کر لیا کہ وہ ایسا ہی کر دکھائے گی۔

سلمیٰ نے سکول کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اور اب اس گھر کی چھوٹی سی مملکت کا نظام سنبھال لیا تھا — یہ کام اتنا آسان بھی نہیں تھا جتنا وہ سمجھی تھی۔ بچوں سے اپنا آپ منوانا۔ ان کے ذہن سے بچھڑ جانے والی ماں کا احساس مٹانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ بڑا ہی صبر آزما کام تھا۔ خاص کر سمجھ دار بچوں سے نپٹنا — لیکن لگن سچی ہو تو کام بن ہی جاتے ہیں — اور پھر اس کے اندر تو ممتا کی آبشاریں پھوٹتی تھیں۔ ان کی پھوار سے ان بچوں کو سیراب ہونا ہی تھا — چھوٹا بچہ تو دو تین ماہ ہی میں اس کا ہو گیا۔ ہاں بڑے بچوں کے لیے اسے شفقت، عنایت اور محبت کے رویے خاصی دیر آزمانے پڑے — ناصر جہاندیدہ آدمی تھا۔ سلمیٰ کی لگن اور محبت سے بہت خوش تھا۔ جوں جوں سلمیٰ بچوں کو مانوس کرنے میں کامیاب ہوتی جا رہی تھی، ناصر کے دل و دماغ کا بوجھ ہلکا ہو رہا تھا۔ اور سلمیٰ کی عزت و احترام اور محبت اس کے دل میں جڑ پکڑتی جا رہی تھی۔

گھر پرسکون تھا۔

ایک سال گزرنے کا پتہ بھی نہ چلا۔ دوسرا سال بھی گزرنے لگا۔ اب گود والا

بچہ بھاگنے دوڑنے اور بولنے لگا تھا — زیادہ ذمہ داری اسی کی تھی۔ سلمیٰ اب اس سے کسی حد تک فارغ تھی۔ اسی فراغت نے ہی اس کے دل کی دبی دبی خواہش کو ہوا دی — وہ اپنے بچے کے تصور میں ڈوبی رہنے لگی۔

ایک دن ناصر نے اس سے پوچھ ہی لیا۔ "کیا سوچتی رہتی ہو؟"

وہ مسکرا دی — حیابار نظروں سے ناصر کو دیکھا اور کپکپاتے مسکراتے لبوں کے کونے دانتوں تلے دبانے لگی۔ ناصر نے اسے غور سے دیکھا لیکن سمجھ نہ پایا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "کیا کہنا چاہ رہی ہو سلمیٰ —"

وہ چپکے چپکے مسکرائی۔ ناصر نے پھر پوچھا تو آہستگی سے بولی:

"منّا اب دوڑنے بھاگنے لگا ہے۔"

ناصر کچھ نہ سمجھا بولا — "ہاں ماشاءاللہ اب بڑا ہو گیا ہے۔"

وہ دل کی بات کہہ ہی گئی۔ "گود اب خالی ہو گئی ہے —"

"تو؟" ناصر نے پوچھا۔

"اس کا چھوٹا بہن بھائی اب آ جانا چاہیے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

ناصر چپ ہو گیا — وہ بھی چپ ہو گئی — دونوں کے درمیان اس کے متعلق کوئی بات نہ ہوئی۔

لیکن چند دنوں بعد ہی جب ناصر کے دوست کی بیوی نے سلمیٰ کو ٹٹولا۔ "کیا بات ہے دوسرا سال جا رہا ہے۔"

تو وہ اس کی بات سمجھ کر مسکرا دی لیکن اندر ہی اندر دکھ کی ایک لہر اٹھتی محسوس کی۔

اس نے پھر ناصر سے کہا۔ "منّا اب سمجھدار ہو گیا ہے۔"

ناصر نے جواب دیا۔ "اچھا ہے تم فارغ ہو گئیں اس کی دیکھ بھال سے۔"

وہ ہنس کر بولی۔ "مجھے یہ دیکھ بھال اچھی لگتی ہے ناصر۔"

"سلمیٰ!" ناصر سنجیدہ ہو کر بولا۔

"جی۔"

"پانچ بچے ہیں ہمارے۔ لڑکے بھی، لڑکیاں بھی ہیں اور کیا کرنے ہیں۔ کیا ان بچوں کو تم اپنا نہیں سمجھتی۔"

’’یہ کیسے کہہ دیا آپ نے کیا آپ نے۔ کبھی محسوس کیا کہ میں ان بچوں کو اپنا نہیں سمجھتی۔‘‘

’’نہیں۔‘‘

’’تو پھر۔‘‘

’’پھر تم ہی بتاؤ بچے کے لیے مُصر کیوں ہو— کیا یہ کم ہیں؟‘‘

سلمیٰ چُپ ہو گئی— کیسے بتاتی اسے کہ وہ فرض ادا کرنے والی مشین نہیں۔ اک عورت بھی ہے۔ عورت جو ماں نہ بنے تو مکمل نہیں ہوتی۔ اپنی تکمیل کے لیے اس کے اندر تڑپ ہے— اس نے اپنی ممتا بے شک ان بچوں پر نچھاور کی ہے۔ لیکن پھر بھی پوری تسکین کا احساس نہیں ہوا۔

وہ مکمل ہونا چاہتی ہے۔ تسکین پانا چاہتی ہے۔ ممتا کی جو آبشاریں اس کے اندر پھوٹتی ہیں، برستی ہیں۔ ان کے لیے اس کے اندر تخلیق کا عمل شروع ہونا چاہیے۔

وقت کے ساتھ ساتھ ماں بننے کی تڑپ شدید ہو رہی تھی۔

’’ناصر کیا حرج ہے پانچ کی جگہ چھ ہو جائیں گے۔‘‘

’’آج کل کے زمانے میں پانچ بھی بہت ہیں۔‘‘

’’ہم صاحب حیثیت ہیں بار نہیں بنے گا بچہ۔‘‘

’’تم سمجھتی کیوں نہیں ہو سلمیٰ، سوال بچے کا نہیں وہ تو غریبوں کے بھی پل جاتے ہیں— ‘‘

’’تو پھر— ‘‘

وہ چپ ہو گیا۔ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ ’’میں نہیں چاہتا کہ سگے اور سوتیلے کا سوال پیدا ہو جائے اور میرے گھر کی یہ فضا جو سکون اور آسودگی سے عبارت ہے فنا ہو جائے۔‘‘

’’سلمیٰ کو غصہ آ گیا لیکن پیتے ہوئے بولی۔ ’’اس گھر کی فضا کو سکون اور آسودگی سے ہمکنار کرنے میں یقیناً میرا ہاتھ بھی ہے۔‘‘

وہ مرعوب ہو کر بولا۔ ’’کیوں نہیں، کیوں نہیں سو فیصد تمہارا حصہ ہے۔‘‘

’’پھر یہ کیوں کر وہم ہوا آپ کو کہ سگے سوتیلے کا سوال اٹھے گا۔‘‘

ناصر نے سر جھکا لیا لیکن ’’میرا بچہ‘‘ جو سلمیٰ نے کہا تھا اس کی چبھن ذہن میں بہت ہوئی۔

پھر آئے دن سلمیٰ کا اصرار ہونے لگا۔ ناصر کا انکار رہا۔ اصرار و انکار نے تکرار کی صورت اختیار کر لی۔

ناصر کے ذہن میں یہ بات پختہ ہوتی گئی کہ سلمیٰ اس کے بچوں کو اپنا نہیں سمجھتی۔ دیکھ بھال، نگہداشت اور تربیت دینے کے باوجود اس کے دل میں یہ بچے اپنائیت نہیں پا سکے۔

ادھر سلمیٰ کو ناصر کا وجود اک خود غرض آدمی کا وجود لگنے لگا۔ جو روپے پیسے کے بل بوتے پر بیوی کے نام پر بچوں اور گھر بار کی دیکھ بھال کے لیے لونڈی خرید لایا تھا۔

دونوں اپنے اپنے رویوں کے سامنے جھکتے زندگی کی راہ پر گامزن تھے— ایک دوسرے پر بھروسہ ختم ہو رہا تھا— وقت گزر رہا تھا— اور گھر کی آسودہ فضا میں تناؤ آتا جا رہا تھا۔

اس دن سلمیٰ منّے کو سکول داخل کروا کے آئی تو ایک بار پھر اسے اپنی گود خالی ہونے کا شدّت سے احساس ہُوا— اس دن اس نے پوری سنجیدگی سے ناصر سے بات کی۔

لیکن ناصر کا ذہن پراگندہ تھا— جھلّا کر بولا۔ ’’تم پانچ بچوں کے ہوتے ہوئے بھی مطمئن نہیں ہو— ‘‘

وہ دانستہ مسکرائی— ’’میرا کوئی حق نہیں— جی چاہتا ہے میرا اپنا بچہ بھی ہو— ‘‘

وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔ ’’اپنا اپنا اپنا— کیا بکواس کرتی رہتی ہو— میرے بچوں کو اپنا کہہ کر دھوکہ دیتی رہی ہو مجھے— دل سے انہیں اپنا سمجھتی تو اپنے بچے کا درد نہ ہوتا تمہاری زبان پر۔‘‘

سلمیٰ کی آنکھوں میں نمی آ گئی—

’’ناصر— میری عمر بھی گزر رہی ہے۔‘‘

’’اپنا بچہ— یہ میری خواہش ہے، آرزو ہے، حق ہے— ‘‘ وہ بے قابو سی ہو گئی۔

’’بکواس بند کرو۔‘‘ ناصر نے اٹھتے ہوئے میز کو ٹھوکر سے راستے سے ہٹاتے ہوئے کہا اور بک بک کرتا باہر نکل گیا—

اس دن سلمیٰ بہت روئی—

پھر

آئے دن تُو تکار ہونے لگی— اور نوبت یہاں تک آ گئی کہ دونوں ہی اپنے

جذبوں کے اندھے غلام بن گئے——

یہ سلسلہ بھی سال ڈیڑھ سال تک چلتا رہا لیکن ناصر نے ضد چھوڑی نہ سلمٰی نے—— وہ تو اپنی ممتا کے تقاضوں کے سامنے بالکل ہی بے دم ہو گئی—— اچھی خاصی جنونی ہو گئی—— ڈپریشن سے دورے پڑنے لگے۔ اور جب جذبوں کی تکمیل کا جنون اس حد تک بڑھا کہ جان پر بن آئی—— تو ڈاکٹروں نے ناصر کو یہی مشورہ دیا۔

”ان کی ممتا کو تسکین دینے کے لیے بیٹا چاہیے—— ورنہ جنون تشویشناک صورت اختیار کر جائے گا۔“

ناصر نے بھی حالات کا رخ دیکھا—— تو ضد چھوڑ دی—— یوں سلمٰی نے مکمل ہونے کا حق پا ہی لیا—— ناصر کو کوئی خوشی نہیں تھی—— لیکن سلمٰی تو جیسے دیوانی ہو گئی تھی—— اپنی ذات سے گویا اب آگہی ہو گئی تھی۔ قدرت کی حسین تخلیق کا عمل اس کے وجود میں شروع ہو گیا تھا—— اسے یوں لگتا تھا—— جیسے ایکا ایکی اس نے نسوانیت کی معراج پالی ہے—— عورت ہونے کا حق لے لیا ہے—— خوشی کے سوتے اس کے انگ انگ سے پھوٹتے تھے—— وہ بے حد جذباتی ہو جاتی تھی—— خالی بازوؤں میں اپنے خیالی بچے کو بھر کر پہروں چومتی، باتیں کرتی، لوریاں دیتی رہتی۔

”میرا بیٹا—— میرا اپنا بیٹا وہ سرشار ہو کر کہہ اٹھتی، اپنے آپ پر اسے پیار آتا—— فخر محسوس کرتی—— چیک اپ کے لیے وہ لیڈی ڈاکٹر کے پاس باقاعدگی سے جاتی اور باقاعدگی ہی سے ایک سوال دہراتی۔“

”ڈاکٹر—— میرا بچہ ٹھیک ٹھاک ہے نا——“

”ڈاکٹر اس کی جذباتیت سے پریشان تھی—— ایسے میں اس کا بلڈ پریشر بہت بڑھ جاتا تھا اور یہ بات اک زچہ کے لیے کتنی خطرناک تھی وہ جانتی تھی—— جوں جوں دن قریب آ رہے تھے—— بلڈ پریشر بہت بڑھتا جا رہا تھا—— دوائی سے کنٹرول نہیں ہوتا تھا—— ڈاکٹر اسے سمجھاتی۔

”مسز ناصر آپ پر سکون رہا کریں۔ دوائیوں کا بھی اثر—— نہیں ہو رہا——“

”میرا بچہ تو ٹھیک ہے نا—— ڈاکٹر نجمہ——“

”آپ—— خود—— بھی تو ٹھیک رہیں—— نارمل رہا کریں—— بچہ ہو جائے تو جو جی چاہے گا کرتی پھریں——“

”وہ ڈاکٹر—— ہو جائے گا نا—— میرا اپنا بچہ؟“ وہ خالی بازو سینے سے یوں بھینچ لیتی—— جیسے ننھا منا سا وجود ان بازوؤں میں بھر لیا ہو—— ڈاکٹر کی تشویش بڑھ جاتی——

سلمٰی نے پل پل انتظار کی لذت میں گزارے اور جس دن کلینک میں آئی—— اس کی حالت دیدنی تھی۔ کرب و اذیت وہ انتہائے شوق کے مرحلوں سے گزر کر گزار رہی تھی—— یہی بات ڈاکٹر کی نظر میں خطرے کی علامت تھی۔

اور

پھر خطرہ ٹوٹ ہی پڑا——

سلمٰی کو جب لیبر روم میں لے جایا گیا—— تو اس کا بلڈ پریشر خطرناک حدوں کو چھو رہا تھا—— ڈاکٹر سخت مضطرب و پریشان تھی—— اس نے دو اور ماہر ڈاکٹروں کو کیس کی نوعیت کے پیش نظر بلا لیا تھا——

لیکن

وہی ہوا جس کا ڈاکٹر کو خدشہ تھا—— لیبر روم میں افراتفری مچ گئی—— نوزائیدہ بچے کو دوسری ٹیبل پر ڈال کر سب ڈاکٹر اور نرسیں سلمٰی کے گرد جمع ہو گئے۔ اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی مگر——

لیکن کچھ نہ ہو سکا—— سلمٰی غنودگی میں ڈوبتی چلی گئی—— ایک ڈاکٹر نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا اور دل کی دھڑکن کو محسوس کرنے کو سٹیتھو سکوپ لگانے لگی۔

ڈاکٹر کی کوشش رائیگاں گئی—— کچھ نہیں بن پایا—— سلمٰی زندگی سے منہ موڑ گئی۔

ڈاکٹر نجمہ بے دم ہو کر گرنے لگی—— اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا—— پھر چیخنے کے انداز میں بولی۔

”یہ عورت بچے کے لیے مری جا رہی تھی—— اسے کہو کہ اپنا بچہ تو دیکھتی جائے—— دکھاؤ اسے اس کا بچہ—— دکھاؤ—— اپنا بچہ دیکھے بغیر نہیں مرنا چاہیے اسے—— نہیں—— نہیں——“

دوسری ڈاکٹر اور نرسوں نے ڈاکٹر نجمہ کو تھام لیا۔

ڈاکٹر نجمہ کا ذہن بری طرح متاثر ہوا تھا——

خواب

رنگ و نُور کا جیسے سیلاب اُمنڈ رہا تھا۔ کمرے کی ساری فینسی بتیاں روشن تھیں۔ اس کے علاوہ بھی تاریں دوسرے کمروں سے کھینچ کھینچ کر تیز روشنی کے بلب عارضی طور پر لٹکائے ہُوئے تھے۔ تیز دودھیا روشنی میں جھلمل کرتے لباس' میک اَپ زدہ چہرے اور چمچماتے زیور بہت اچھے لگ رہے تھے۔ شوروغل مچا تھا۔ باتوں اور ہنسی کی جھنکاروں میں دلہن کو سجے سجائے صوفے پر لاکر بٹھایا گیا تھا۔ سرخ ٹشو کے بھاری بھرکم غرارے اور کامدانی دوپٹے میں وہ جھکی جھکی بیٹھی تھی۔ زیور کے بھاری بھاری جڑاؤ سیٹ گردن جھکائے ہی چلے جا رہے تھے۔

سلامی کی رسم ہو رہی تھی۔ ساس اور سُسر نے حسنہ کو سونے کا ایک جڑاؤ سیٹ دیا تھا۔ ان کے بعد خاندان کی خواتین اور ملنے جلنے والی عورتوں نے دلہن کو گھیر لیا تھا—— سلامی کے روپے دُلہن کو پکڑاتے ہوئے ہنسی مذاق بھی کر رہی تھیں۔ حسنہ کے حسین چہرے پر بڑی حیادار مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

باہر بھی خوب ہنگامہ تھا۔ گھر کے افراد جہیز میں آیا ہُوا سامان ٹرک سے اتروا اتروا کر کمروں میں رکھ رہے تھے۔ بھاری جہیز دوسرے رشتہ داروں کی توجہ کا بھی مرکز بنا ہوا تھا۔ کوٹھی ابھی بقعۂ نور بنی تھی۔ روشنی میں ہر چیز دیکھی پرکھی جا رہی تھی۔ خاندان کی عورتیں خوب تعریفیں کر رہی تھیں۔

ناصر تھا ہی اس قابل۔ دلہن بھی ماشاءاللہ چندے آفتاب چندے ماہتاب

ہے۔ پڑھی لکھی بھی۔ اور جہیز بھی خوب لائی۔

ناصر کی امی ماشاءاللہ' ماشاءاللہ کر رہی تھیں۔

"اب عمر کو بھی ایسی ہی جگہ بیاہنا۔" رشتے کی پھوپھی بولیں۔

اور سامان اترواتا عمر کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولا۔ "ابھی تو معاف ہی رکھیں مجھے۔"

"کیوں؟" دوسری عورت نے کہا۔

"شادی بھیا کی ہُوئی ہے اور کام کر کے میں بے حال ہوگیا ہوں۔ اپنی شادی ہوئی تو——"

اس کی بات کاٹتی ہُوئی امی بولیں۔ "تمہاری شادی ہوئی تو ناصر کام کرے گا۔ لیکن ابھی خاطر جمع رکھو۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہُوئے ہیں ملازم ہُوئے۔ شادی تین چار سال بعد ہی کروں گی۔"

"اوہ مام——" عمر نے ایک ڈبہ اٹھا کر پیٹی پر رکھتے ہُوئے ہنس کر کہا۔ "میں نے کب کہا کہ ابھی شادی کر دیں—— وہ تو پھپھو——"

"چل کام کر—— ٹرک میں ابھی ڈھیر سامان پڑا ہے۔ دو تین آدمیوں سے جلدی نہیں اترنے کا۔ کچھ اور لڑکوں کو بھی بلالے۔"

"آپ ہی آواز دیں اوروں کو۔ وہ تو سب دلہن پر یوں ٹوٹ پڑے ہیں جیسے——" وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ عظمیٰ بھابی اسے ڈھونڈتی ادھر آ نکلیں۔

"اوہ—— عمر کے بچے——" وہ بولیں—— "تم یہاں ہو۔"

"جی ہاں۔" وہ بولا "دیکھ لیجیے۔"

"چھوڑو یہ کام' اندر آؤ"

"کیوں؟"

"بھابی کا گھٹنہ نہیں چھونا۔"

"کیا؟"

سب عورتیں ہنس پڑیں۔ خالہ بولیں۔ "ہاں عمر بیٹے—— شگن ہوتا ہے یہ بھی۔ جاؤ دلہن کا گھٹنہ چھوؤ—— پیسے ملیں گے۔"

"کس سے؟" عمر ہاتھ جھاڑتے ہُوئے بولا۔

"بھابی سے۔" اس نے کہا۔

"اوہ مام جی' آپ نے پہلے بتایا کیوں نہیں۔۔۔ ؟" وہ بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتا عظمیٰ کے ساتھ چل دیا۔ عظمیٰ بھابی خاصی باتونی تھیں۔ عمر کو خوب اکساتی چلیں۔

"پانچ سو سے کم نہ لینا۔ ایک ہی تو دیور ہو۔ یہ موقعے بار بار نہیں آتے۔ سمجھے۔۔۔"

عمر خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا۔

خوشی اسے بہت تھی۔ ناصر بھائی کی شادی ہوئی تھی۔ اپنا پیارا سا بھائی اسے عزیز بھی بہت تھا۔ پھر دو ہی تو بھائی تھے وہ۔۔۔ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ ملازمتوں کے سلسلے تھے۔ جو دونوں الگ الگ شہروں میں رہتے تھے۔ لیکن مہینے بھر سے زیادہ الگ رہنے کی تاحال نوبت نہ آتی تھی۔ کبھی دونوں ویک اینڈ پر گھر آجاتے۔ کبھی عمر ناصر کے ہاں چھٹی گزارنے آجاتا اور کبھی ناصر عمر کے پاس چلا جاتا۔

ناصر کی شادی چٹ منگنی پٹ بیاہ والی بات ہوئی تھی۔ ان کی امی نے ہی رشتہ ڈھونڈا تھا۔ اور ناصر نے ماں کی مرضی پر سر جھکا دیا تھا۔

شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ ماں باپ نے دل کے سارے ارمان نکالے تھے۔ کئی دنوں سے کوٹھی کے ماتھے پر رنگین قمقموں کے جھومر سجے تھے۔ رشتہ دار اور دوست احباب جمع تھے۔ ڈھولک پر لڑکیوں بالیوں کی تھاپ ہر شام پڑتی تھی۔ کھیل تماشے ہوتے تھے۔

عمر دو دن پہلے آیا تھا۔ اس نے دس دن کی چھٹی تو لی تھی۔ خیال تھا ناصر اور بھابی ہنی مون کے لیے جلدی کہیں چلے نہ گئے تو وہ چند دن ان کے ساتھ گزارے گا۔ بھابی سے دوستی کے پلان اس نے بہت پہلے بنا لیے تھے۔

عظمیٰ کے ساتھ وہ کمرے میں آیا تو شوخ و شنگ لڑکیاں اور نئی نویلی دلہنیں حسنہ کو گھیرے بیٹھی تھیں۔ عمر بھی بڑا شوخ' بڑا کھلنڈرا اور ہنس مکھ تھا۔ اس کو خاندان میں رونقِ محفل کہا جاتا تھا۔۔۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے رنگ و نور کے سیلاب پر اک نگاہ ڈالی۔ پھر حسنہ کی طرف عظمیٰ بھابی نے دھکیل دیا۔

نویرا نے حسنہ کا لمبا سا گھونگھٹ فوراً ہی کھینچ دیا۔

"کیوں جی؟" عمر نے کمر پر ہاتھ رکھ کر ہنستے ہوئے پوچھا۔

"پہلے سلامی نکالو۔" کوئی شوخ اور منچلی بولی۔

"اوں ہوں۔۔۔ ہم تو گھٹنہ پکڑنے آئے ہیں اپنی بھابی کا۔۔۔ سلامی دینے نہیں۔"

"کنجوس۔" دو تین آوازیں آئیں۔

"جو جی چاہے کہہ لیں۔ سلامی دینے کے نہیں ہم۔" وہ اکڑ کر بولا۔

"تو پھر منہ دھو رکھو۔ دلہن کا منہ دکھانے کے بھی نہیں ہم۔"

جینی ہنسی اور حسنہ کا گھونگھٹ اور لمبا کر دیا۔

عمر کہنیوں سے ارد گرد کھڑی بھابیوں اور بہنوں کو ہٹا کر دلہن کے عین سامنے قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے دلہن کا گھٹنہ پکڑ کر بولا۔ "اللہ کے نام پر بھابی۔۔۔ دے دیجیے پانچ سو روپیہ۔۔۔"

اس نے جس انداز میں کہا۔۔۔ سب ہنس پڑے۔ حسنہ کو بھی ہنسی آ گئی۔ وہ کچھ اور جھک گئی۔

"سلامی نکالو۔"

"پیسے نکالو۔"

"پہلے سلامی اور پھر گھٹنہ پکڑائی لینا۔"

"اب تو کماتے ہو۔ کنجوس کہیں کے نکالو سلامی۔"

چاروں طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ اسی انداز میں بیٹھا رہا اور "اوں ہوں" کر کے نفی میں سر ہلاتا رہا۔

چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق کئی لمحے ہوتا رہا۔ خوب قہقہے پڑے۔ خوب ہنسیوں کے فوارے چھوٹے۔ ہر کوئی خوش تھا۔ چہک رہا تھا۔ مسرتیں اپنے عروج پر تھیں۔ عمر بڑا شوخ ہوا جا رہا تھا۔

نہ وہ سلامی دے رہا تھا' نہ نویرا گھونگھٹ اٹھانے دے رہی تھی۔

بالآخر عظمیٰ بھابی نے فیصلہ دیا۔ "چلو بھائی پہلے تم سلامی دو۔ پھر حسنہ گھٹنہ پکڑائی دیں گی۔"

"کتنی دیں گی۔" وہ بولا

"جتنی تم سلامی دو گے۔"

"اوہو۔۔۔ فائدہ کیا ہوا؟"

"پھر۔۔۔ کیا چاہتے ہو؟"

"جتنی سلامی دوں۔ اس سے دس گنا بھابی گھٹنہ پکڑوائی دیں۔"

"چالاک کہیں کا۔"

"نہیں تو نہ سہی۔"

"اتنا زیادہ نہیں۔"

"کچھ کم کر لیں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" عظمیٰ چہکی۔ "سو سلامی دو تو دو سو ملے گا۔ دو سو دو تو پانچ سو۔"

"پانچ سو دوں تو۔"

"دو ہزار۔"

"سودا اچھا ہے۔"

عمر نے جیب سے بٹوہ نکالا۔ پانچ نوٹ نکالے اور بولا۔

"سب گواہ رہیں، کہیں بھابی ٹھگی نہ کر جائیں۔ دو ہزار ملے گا نا بھابی۔" اس نے گھونگھٹ پر نظریں جمادیں۔

سر کو ہلکی سی جنبش ہوئی۔ سب نے خوشی سے تالیاں پیٹیں۔

"لو جی۔" نورا نے گھونٹ الٹ دیا۔

حسنہ نے سر اونچا کیا اور پوری آنکھیں کھول کر سامنے بیٹھے عمر کو دیکھا۔ اس کی بادامی آنکھوں میں حیا کے ڈورے تھے۔ اور بھرے بھرے ہونٹوں پر مسکراہٹ لو دے رہی تھی۔ عمر کا ہاتھ اٹھے کا اٹھا رہ گیا۔

اس نے حسنہ کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ بادامی آنکھیں—— بیضوی چہرہ، بھرے بھرے ہونٹ، وہ پھٹی پھٹی نظروں سے حسنہ کو دیکھنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے اس نے یہ سب کچھ پہلے بھی دیکھا ہے۔

"یہ چہرہ؟ اُف—— یہ—— چہرہ—— ہاں یہ چہرہ—— دلہن کا چہرہ۔" اس کے ذہن میں ان گنت سوال لہرا گئے—— وہ حیران—— ششدر اور بھونچکا سا رہ گیا۔

"دیں نا پیسے۔" کسی نے کہا۔

مسکراتے ہوئے حسنہ نے آگے ہاتھ بڑھایا اور اس کے ہاتھ سے نوٹ ہولے سے چھین لیے۔ خوب شور مچا، تالیاں پیٹی گئیں۔ ہلا گلا اپنے عروج پر جا پہنچا اور—— شاید اسی لیے کسی نے عمر کی طرف توجہ نہ دی۔ اس کی حالت پر غور نہیں کیا۔

اسی لمحے اس کی امی آ گئیں۔ "عمر بیٹے چابیاں تمہارے پاس ہیں؟" وہ قریب آ کر بولیں۔

"جی—— جی—— مام۔" وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ اور چابیاں جیب میں ٹٹولتے ہوئے جمگھٹے سے باہر نکل گیا۔

"گھٹنہ پکڑائی تو لیتے جاؤ۔" آوازیں آئیں۔

لیکن——

وہ پلٹا نہیں——

"چلو صبح لے لے گا۔" اس کی امی نے مسرور لہجے میں کہا۔

"باہر سامان بکھرا پڑا ہے۔ وہ اٹھوا لے ابھی——"

لیکن اس نے سامان نہیں اٹھوایا۔ چابیاں راجی باجی کو دے کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کھٹاک سے اس نے دروازہ بند کیا۔ چند لمحے بت بنا بند دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔

اس کے ذہن میں ہلچل مچی تھی۔ قیامت کا شور تھا—— توڑ پھوڑ تھی—— کرب تھا—— دکھ تھا۔ وہ بے تابانہ بیڈ کی طرف بڑھا۔ اور گرنے کے انداز میں اوندھا لیٹ گیا۔ وہ بے حد بے چین اور مضطرب تھا۔

ایسا ہی بے چین اور مضطرب وہ کوئی چھ ماہ پہلے بھی ہوا تھا۔

وہ برسات کی بھیگی رات تھی۔ بادل گھر گھر کر آ رہے تھے۔ بجلیاں خونخوار بادلوں کے سینے میں پیوست ہوئی جا رہی تھیں۔ ہوا چلنے لگی تھی۔ اور موسلا دھار بارش کے امکانات پیدا ہو رہے تھے۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں تھا۔ نیند نہیں آ رہی تھی اور بے چین سا سناٹا اس کے اندر اتر رہا تھا۔ وہ اس غیر محسوس سی بے چینی کو محسوس کر کے اور بے چین ہو رہا تھا۔ اسی لیے نیند نہیں آ رہی تھی۔ گھٹن اور حبس کو دور کرنے کے لیے اس نے کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ فر فر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آنے لگی تھی۔ اور گھر گھر چلتا پنکھا بھی شاید اس ہوا کی وجہ سے سکون دینے لگا تھا۔ بادلوں کی گرج اور بجلیوں کی چمک کے ساتھ ساتھ بوندیں بھی پڑنے لگی تھیں اور اس مسحور کن ترنم نے اس کی آنکھوں میں نیند کا فسوں گھول دیا تھا۔

جانے وہ کب سویا تھا؟

لیکن ہڑبڑا کر اٹھا تھا تو باہر موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ اور اندر بستر میں پڑا اس کا وجود پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا اور چوپٹ آنکھیں بے یقینی کا اظہار کر رہی تھیں۔

وہ بے حد ڈرا ہوا تھا۔ بہت زیادہ سہا ہوا تھا۔

ایک عجیب سا خواب اس نے دیکھا تھا— خواب— عجیب سا خواب—

شادی کا ہنگامہ ہے۔ رنگ و نور کا سیلاب شوخ و شنگ لڑکیوں‘ ارمانوں بھری دلہنوں اور مستانی دوشیزاؤں کے ہجوم میں گھری بیٹھی سرخ سی گٹھڑی بنی دلہن۔ وہ اس کے سامنے آلتی پالتی مارے بیٹھا سلامی کے پیسے نکالے گھونگھٹ اٹھنے کا منتظر ہے۔ گھونگھٹ اٹھنے پر اس نے خوبصورت چہرہ‘ بادامی مسکراتی آنکھیں اور شوخی سے لو دیتے بھرے بھرے ہونٹ دیکھے۔ ناصر بھیا کی دلہن اسے بہت اچھی لگی۔

پھر یہ منظر بدل گیا

اس نے دیکھا—

اُف وہ سر تا پا کانپ گیا۔

لیکن جو کچھ دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں محفوظ ہو گیا۔ خوف و ہراس اس کے اعصاب پر سوار ہو گئے۔

وہ بستر سے نکل آیا۔ کمرے کی ساری بتیاں جلا دیں۔ پانی پیا۔ اپنے آپ کو پُرسکون رکھنے کے لیے اس نے کئی جتن کر ڈالے۔

صبح تک وہ بے چین رہا۔ بالکل سو نہ سکا۔ آنکھوں میں ڈھلا خواب حیران و پریشان کرتا رہا۔

پھر—

یہ بے چینی کئی دن اس کے اعصاب پر سوار رہی۔ وہ ہر وقت سہا سہا رہتا۔

”تمہیں کیا ہو گیا ہے عمر۔“ امی اکثر پوچھتیں۔

لیکن

وہ کچھ نہ بتاتا۔ بہانہ بنا کر ٹال دیتا— وہ انہیں کچھ بتاتا بھی کیوں کر—

دن گزرتے چلے گئے۔

اور

وقت اس کی بے چینی کو ختم کرنے میں ممد و معاون بنتا گیا۔ اسے نوکری مل گئی اور وہ اپنے کام میں لگ گیا۔

اسے یہ خواب بالکل بھول چکا تھا۔ اس نے خود اس خواب کو بے حقیقت بنا کر ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

لیکن—

لیکن—

آج دلہن کو دیکھا

تو

بھولا بسرا خواب ذہن میں لہرا گیا۔ حسنہ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس نے محسوس کیا کہ یہ سارا منظر— یہ رنگ و نور کا سیلاب— ہنستے مسکراتے چہرے‘ چہلیں کرتی لڑکیاں— شوخ و شنگ رنگین لباس‘ سرسراتے آنچل‘ چھچھاتے زیور اور اسی طرح کی چھیڑ چھاڑ۔ وہ آلتی پالتی مارے بھی اسی طرح بیٹھا ہے اور سلامی کے نوٹ ہاتھ میں پکڑے ہیں۔

یہ سارا منظر اس نے خواب میں بھی دیکھا تھا۔ ذرّہ بھر فرق نہ تھا۔ حسنہ کا چہرہ بھی بعینہٖ وہی تھا۔

خواب کے منظر کی آج کے منظر سے اس قدر مماثلت پریشان کن تو تھی ہی لیکن پریشانی تو اسے بقیہ خواب سے تھی۔ اگر خواب کا یہ حصہ سچ ہو سکتا ہے۔ تو باقی۔ باقی خواب!

اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کی بے چینی اور گھبراہٹ میں اور اضافہ ہو گیا۔

”اللہ نہ کرے۔ خدا نہ کرے۔“ وہ سر کو جھٹک جھٹک کر کہہ رہا تھا۔

رات ڈھلتی رہی اور اس کی بے چینی‘ اضطراب اور بے سکونی میں اضافہ ہوتا رہا۔

پھر جانے کب اسے نیند آ گئی۔

صبح گھر میں خوب شور تھا‘ ہنگامہ تھا۔ ولیمے کا فنکشن تھا۔ نئی دلہن آئی تھی۔ لوگ آ رہے تھے۔ جہیز کی نمائش ہو رہی تھی۔ داد دی جا رہی تھی۔ عورتیں تو ایک ایک چیز جیسے ناپ تول رہی تھیں۔

وہ بے خبر سو رہا تھا۔

کہ

امی اسے تلاش کرتی ادھر آ گئیں۔

"اٹھنا نہیں، عمر بیٹے — ؟" انہوں نے اُسے جگایا۔ "اتنے کام پڑے ہیں اور تم لمبی تان کر سوئے ہو۔ جانتے ہو تمہارے ابو کوئی کام نہیں کرتے اور ناصر خود دولہا ہے اسے آج تو چھٹی دینا چاہیے۔"

"ناصر — دولہا۔" ہتھوڑے کی ضرب سی اس کے دل و دماغ پر پڑی۔ وہ خوفزدہ سا نظر آنے لگا۔

"کیا بات ہے میرے لال۔" ماں نے چمکارا۔ "لگتا ہے بہت تھکے ہوئے ہو۔ کوئی بات نہیں، آج ہی کا دن ہے۔ اٹھو — جلدی سے تیار ہو جاؤ — چائے بھجوا دوں؟"

"ہاں۔" وہ بولا۔

امی میز پر پڑا گلاس اٹھا کر چل دیں۔

وہ بستر میں ادھ مُوا سا پڑا رہا۔

اور —

جب گھنٹہ بھر بعد بھی وہ کمرے سے نہ نکلا تو ابو، ناصر، عظمیٰ بھابی اور کئی لوگ آ گئے۔

"طبیعت خراب ہے کیا؟"

"رت جگے مناتے تھے نا۔ تکان تو ہونا ہی تھی۔"

"چلو چائے پی لو۔ تکان کچھ تو رفع ہو گی۔"

ہر کوئی بول رہا تھا۔ عمر چپ چاپ پڑا ناصر کو تکے جا رہا تھا۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ اور اضطرابی کیفیت بڑھ رہی تھی۔

"بھئی اٹھو نا — بھابی سے پیسے نہیں لینے۔" ناصر اس پر جھک گیا۔ "رات تم واپس اس کے پاس آئے ہی نہیں۔"

ناصر بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔

"یا خدا۔ میرے بھائی کی یہ خوشیاں دائمی ہوں۔" اس نے دل ہی دل میں دعا کی۔ وہ سب کے کہنے پر اٹھ بیٹھا — طبیعت خراب تھی ہی۔ بہانہ بھی یہی معقول تھا۔

لیکن گھر میں دعوتِ ولیمہ تھی۔ اس لیے اسے اٹھتے ہی بنی۔

وہ سارا دن کھویا کھویا رہا — خواب اور رات کے منظر کی مماثلت حیران کیے ہوئے تھی۔ اور آنے والے کسی نہ معلوم خدشے سے ڈول رہا تھا۔

دوسرے دن وہ نسبتاً بہتر تھا۔ اس نے اپنے آپ پر قابو پانے کی بھرپور کوشش کی۔ اپنے آپ کو کوسا کہ یونہی ایک بے حقیقت سے خواب کو اعصاب پر یوں مسلط کر لیا ہے۔ اسے دھیان دوسری طرف لگانا چاہیے۔ اور خدا سے خیر مانگتے ہوئے سب کچھ اس کی مرضی اور رضا پر چھوڑ دینا چاہیے۔

اس نے اپنی ڈھارس آپ بندھائی۔ ہمت بندھائی اور نارمل ہونے کی پوری پوری کوشش کی۔ حسنہ بے حد پیاری، ہنس مکھ اور سمارٹ لڑکی تھی۔ چھوٹے دیور اور بھابی کی ہمیشہ ہی لگ آتی ہے۔ وہ عمر کی ہم عمر ہی تھی۔ اس سے جلد ہی بے تکلف ہو گئی۔

چند دن عمر گھر رہ کر واپس نوکری پر آ گیا۔ اب وہ خواب کی اذیت ناکی قدرے بھول چکا تھا۔ کبھی کبھی خواب کا بُھوت اس کے ذہن سے اب بھی چمٹ جاتا لیکن وہ پوری قوت سے اسے جھٹک دیتا۔

ناصر اور حسنہ ہنی مون کے لیے سوات گئے۔ واپسی پر وہ عمر کے پاس بھی آئے۔ حسنہ بے حد شگفتہ اور نکھری ہوئی تھی۔ ناصر بھی خوش و خرم تھا۔

چائے کے بعد تینوں باتیں کرنے لگے۔ حسنہ، عمر کا گھر گھوم پھر کر دیکھ چکی تھی۔

"اب شادی کر ہی ڈالو، دیور جی۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "ورنہ گھر کوڑ کباڑ ہی بنا رہے گا۔"

"آپ ہی ڈھونڈیئے میرے لیے بھی کوئی اپنے جیسی دلہن۔"

وہ بولا۔

"ضروری ہے کہ میرے ہی جیسی ہو؟"

"آپ سے زیادہ خوبصورت، زیادہ سمارٹ، زیادہ دلکش ہو جائے پھر بھی قبول ہو گی۔"

"شریر کہیں کا۔"

"کیوں جی؟"

"دودھ سمیت ملائی والی بات کر رہا ہے۔"

"تو اور کیا—— شادی بھی کریں اور کسی چھوٹی موٹی شے سے ؟"

"موٹی تازی لا دوں"

"توبہ توبہ——"

دونوں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ ناصر ان کی باتیں سن سن کر مسکرا رہا تھا۔ اس کی نظریں حسنہ کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

ایک دم عمر بولا۔ "آپ کو اچھی لگی ہیں بھابی ؟"

ناصر کھلکھلا کر ہنس پڑا—— "بری لگیں کیا—— ؟"

"آپ انہیں پہلے تو نہیں جانتے تھے نا—— ؟"

"نہیں۔"

"پھر ؟"

پھر کیا—— "اریجنڈ میرج میں جو لطف و کشش ہے نا—— وہ بس کیا بتاؤں۔"

"ٹھیک ہے—— میں بھی ایسے ہی کروں گا۔ سو بھابی ڈھونڈ لائیے اپنے لیے ایک عدد دیورانی۔"

تینوں ہنستے مسکراتے رہے۔

ناصر اور حسنہ شام چلے گئے—— حسنہ جب ناصر کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تو عمر کو پھر ایک ایسا محسوس ہُوا کہ یہ منظر پہلے بھی اس نے دیکھا ہے۔

ان کے جانے کے بعد وہ کچھ اُلجھا اُلجھا تھا۔ طبیعت معمول پر نہ آ رہی تھی۔ وہ رات کافی دیر تک جاگتا رہا—— اور—— اور پھر اسے ایک دم یاد آ گیا کہ یہ منظر بھی اسی خواب کا ایک حصہ ہے۔

وہ سخت مضطرب رہا—— کئی دن طبیعت اچاٹ رہی—— دل ڈوب ڈوب جاتا—— اور وہ بے بسی اور بے کسی کی تصویر بن کر رہ جاتا——

دن گزرتے چلے گئے

حسنہ نے اس کے لیے واقعی ایک خوبصورت اور بے حد اچھی لڑکی تلاش کر لی۔ اس کی امی ابھی شادی کے حق میں نہ تھیں لیکن ایسا اچھا رشتہ گنوایا بھی نہ جا سکتا تھا۔ انہوں نے فون پر عمر سے بات کی۔

"تمہاری بھابی نے اپنی دیورانی ڈھونڈ لی ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا۔ اگر جلدی

شادی نہیں کرنا چاہتے تو منگنی ہی سہی۔ لڑکی اور گھر بار مجھے پسند ہے۔ میں یہ رشتہ گنوانا نہیں چاہتی۔"

"جیسے آپ کی مرضی امی——"

"تو منظور ہے تمہیں ؟"

"ہاں۔"

"منگنی۔"

"شادی۔"

امی ہنس پڑیں۔ "تم تو اتنی جلدی شادی کرنے کے حق میں نہیں تھے۔"

"اب ارادہ بدل لیا ہے۔ یہی میرے حق میں بہتر ہے۔"

اس نے اس کی بات پر زیادہ توجہ نہ دی۔ انہیں تو خوشی تھی کہ عمر بنا دیکھے ناصر کی طرح شادی پر آمادہ ہو گیا ہے۔

عمر عجلت میں تھا۔ شادی کر کے وہ اس بھیانک خواب کی تعبیر کا رُخ موڑنا چاہتا تھا——

بھیانک خواب——

جو اس کے اعصاب پر مسلّط تھا۔

ناصر کی طرح عمر کی شادی بھی بڑی دھوم دھام سے ہُوئی۔ اس دفعہ تو سارے انتظامات حسنہ کے ہاتھ میں تھے۔ ایک اکیلے دیور کی ایک اکلوتی بھابی، خوب جوش و خروش دکھا رہی تھی۔ رشتہ بھی اسی نے ڈھونڈا تھا۔ اس لیے ہر بات میں پیش پیش بھی وہی تھی۔

حجلۂ عروسی اسی نے سجایا۔ وہ بہت ہنس مکھ اور بڑی جاندار شخصیت کی مالک تھی—— رشتے کی بھابیاں نندیں اسے چھیڑتیں۔

"حسنہ لگتا ہے جیسے تو حجلۂ عروسی سجاتے سے اپنے ارمان پورے کر رہی ہے۔"

وہ برجستہ جواب دیتی۔ "اور کیا، میرے کمرے کو تو کسی نے ڈھنگ سے سجایا ہی نہیں تھا—— جو کمی وہاں تھی میں یہاں رہنے نہیں دوں گی۔"

"خوش قسمت دیور ہے۔"

"دیور—— کا رشتہ بڑا پیارا رشتہ ہے۔"

"رومینٹک بھی۔" کسی نے ہنس کر کہا۔ وہ بھی ہنس پڑی۔ چہکتے ہوئے بولی

"واقعی۔ لیکن رومینٹک کسی اور اعتبار سے نہیں۔ صرف پیار کے اعتبار سے۔"

وہ بڑی مسرور تھی۔ ہنستے مسکراتے کام کر رہی تھی۔ حجلۂ عروسی اس نے امیدوں اور ارمانوں کی طرح چمکتا دمکتا بنا دیا——

عمر بھی خوش تھا۔ حسنہ کی پسند پر اسے اعتماد تھا۔ پھر وہ جس شوق اور جس خوشی کا مظاہرہ کر رہی تھی، وہ قابلِ تحسین تھا۔

دلہن آ گئی۔ ساری رسوم ادا ہوئیں۔ اور پھر رات گئے شوخ و شنگ دلہنیں اسے حجلۂ عروسی میں چھوڑ آئیں۔

عمر اپنے دوستوں میں بیٹھا گپ شپ لگا رہا تھا۔ رات کے بارہ بجنے والے تھے کہ ناصر نے اسے اس محفل سے نکالا۔ "جاؤ بھئی اب، بہت رات ہو گئی ہے۔"

وہ وہاں سے اٹھا اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

تو

حسنہ نے بازو سے پکڑ کر حجلۂ عروسی کی طرف دھکیلا۔

"دلہن پسند آ گئی نا۔ تو سونے کے کنگن لوں گی۔" اس نے آنکھیں نچاتے ہوئے کہا۔

"نہ پسند آئی تو—— ہرجانہ دیں گی۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پسند نہ آنے کا۔"

"آپ جیسی ہے۔"

"میں کیا ہوں، وہ تو بڑی—— بڑی—— بس جا کر دیکھ لو۔" حسنہ نے ہنستے ہنستے اسے اندر دھکیل دیا۔

عمر نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر کے لاک لگایا۔ اور پلٹ کر دیکھا۔ وہ کچھ گڑبڑا سا گیا۔

یہ سجا سجایا کمرہ——

خوشبوؤں کی مہک——

روشنیوں کی یلغار

چمکتی دمکتی چھپر کھٹ——

اور——

اس پر زرنگار گٹھڑی سی بنی دلہن۔

ایک سوال سا اس کے ذہن میں پھیل گیا—— اسے یوں لگا جیسے یہ سارا منظر وہ پہلے بھی دیکھ چکا ہے۔

منظر

وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اسی خواب کا یہ دوسرا منظر تھا—— اس کا رنگ فق ہو گیا۔ ہونٹ تک سپید پڑ گئے۔ آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں—— اور سردی کے باوجود ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک اٹھیں۔

وہ ششدر سا کھڑا رہا۔

پھر جانے کیا ہُوا؟

تیزی سے آگے بڑھا اور بغیر کسی تمہیدی کلام کے اس نے دلہن کا گھونگھٹ زبردستی کھینچنے کے انداز میں الٹ دیا۔

شرمیلی لجیلی نازیہ اس جارحانہ انداز سے کچھ ششدر سی ہُوئی۔ اسے ایک لمحہ کو دیکھا اور آنکھیں جھکا لیں۔

"وہی—— وہی—— وہی چہرہ—— عمر بڑبڑایا—— اور بے دم سا ہو کر بستر پر گر گیا۔

نازیہ بے طرح گھبرا گئی—— اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ وہ تو جانے کون کون سے حسین سپنے سجائے بیٹھی تھی۔ بھاری قدموں کی چاپ، گمبھیر آواز اور مضبوط انگلیوں کا تصوراتی لمس ذہن میں تھا۔ سب ٹوٹ پھوٹ گیا۔

عمر لمبے لمبے غیر متوازن سانس لے رہا تھا—— جسم مٹی کے ڈھیر کی طرح تھا۔

نازیہ کا چہرہ وہی تھا، جو اس نے اس سنگین خواب میں دیکھا تھا——

ہم مستقبل جاننے کے لیے اکثر بے چین ہوتے ہیں۔ نجومیوں کو ہاتھ دکھاتے پھرتے ہیں۔ پامسٹری کی کتابوں پر مغز ماری کرتے ہیں۔ روحانیت سے فیض حاصل کر کے آنے والے دور کی جھلک دیکھنے کے متمنی ہوتے ہیں۔ خواب دیکھتے ہیں تو اسے مستقبل کے حوالے سے تعبیروں کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

لیکن یہ ساری باتیں، سارے عمل، یہ ساری کاوشیں ہم بہتر مستقبل اور اچھے دور کو پانے کے لیے کرتے ہیں۔

یہ کبھی نہیں سوچتے کہ اچھا بُرا جنم جنم کا ساتھی ہے۔ دُکھ سُکھ کی سانجھ

ہے۔ روشنی اور اندھیرے لازم و ملزوم ہیں۔

یہ یقین کرلیں

تو۔۔۔

مستقبل کے متعلق جاننے کی کبھی خواہش ہی پیدا نہ ہو۔ آنے والے دَور کے حادثوں، سانحوں اور دکھوں کا پتہ چل جائے تو جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ عمر کرب کے اسی اذیت ناک لمحوں سے دوچار تھا۔ اس کا مستقبل کی نشاندہی کرنے والا وہ خواب جو مدّت ہوئی اس نے دیکھا تھا، ٹکڑیوں میں بٹ بٹ کر سامنے آ رہا تھا۔

حالات اور وقت سے سمجھوتہ کر کے ایک بار پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ دل کی تسکین و تسلی کے لیے اس نے بڑے جتن کیے۔

خواب کو خواب سمجھ کر بھلا دیا۔

بھلا دیا۔۔۔ یا بھلا دینے کی کوشش کی۔

بہر حال وہ حالات سے سمجھوتہ کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

نازیہ، حسنہ کی طرح بہت اچھی، بڑی حسین اور بڑی خوش خلق لڑکی تھی۔ وہ عمر کے سینے میں پگھل پگھل کر پچھلے خدشوں سے لاعلم تھی۔ حسنہ کو بھی کچھ خبر نہ تھی۔ ناصر کے امی ابو کچھ نہ جانتے تھے۔ سب ہی خوش تھے۔ پھر اُپرا گھرانہ مسرور سی زندگی کی راہ پر گامزن تھا۔

ناصر کے ہاں پہلا بیٹا پیدا ہوا تو اس گھرانے میں پھر ایک بار جشن کی سی کیفیت تھی۔ خوشیاں اور مسرتیں سایہ فگن تھیں۔ کوئی دکھ، کوئی رنج قریب سے بھی نہ گزرا تھا۔

عمر نے ناصر کے بیٹے کا نام فخر رکھا۔ نازیہ نے پیار کا نام بلو دیا۔ حسنہ اور ناصر نے ان ناموں پر دلی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

سب ہی خوش تھے۔ لیکن جب خوشیاں انتہا کو چھونے لگتیں تو عمر کا دل کسی نامعلوم احساس سے کانپ جاتا۔ خواب کا آسیب ذہن کے کسی گوشے سے اب تک چپکا تھا۔ گو عمر نے اس آسیب کو جھٹلانے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ لیکن کبھی کبھی۔۔۔ یہ آسیب۔

اپنے وجود کا احساس ضرور دلا جاتا۔

پھر عمر کے ہاں بھی بیٹا پیدا ہوا۔ زندگی مصروف ہوگئی۔ اگلے سال ناصر کے

ہاں بیٹی پیدا ہوئی۔ وہ بھی گھر بار اور بچوں میں الجھ گئے۔ دونوں اپنے اپنے گھروں اور بچوں میں پوری دلچسپی اور شوق سے کھو گئے۔

عمر کے دوسرے بچے کی پیدائش سے پہلے ہی اسے مشرقِ وسطیٰ میں ملازمت کی آفر ملی۔ اس نے قبول کرلی۔

وہ چند ہفتوں ہی میں باہر چلا گیا۔ بہت بڑی تنخواہ اور بے حد سہولتیں حاصل تھیں۔ نازیہ بھی بہت خوش تھی۔ اسے آنے والے بچے کی قسمت سے تعبیر کر رہی تھی۔

یہ عمر اور نازیہ کی قسمت کا بڑا خوشگوار پلٹا تھا۔ چند ماہ بعد نازیہ بھی عمر کے پاس چلی گئی۔ ان کے خطوط اور آنے والے لوگوں کے ہاتھ تحائف وغیرہ آتے رہے۔ بہت بڑھیا بڑی قیمتی چیزیں عمر اور نازیہ، حسنہ اور ناصر اور ان کے بچوں کے لیے بھیجتے تھے۔ امی اور ابو کو روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ پھر بھی ایک فرمانبردار بیٹے کی طرح عمر ہر ماہ گھر معقول رقم بھیجتا تھا۔

حسنہ ایک دن ہنستے ہوئے ناصر سے کہنے لگی۔ "ناصر جتنے پیسے عمر صرف امی ابو کو بھیج رہا ہے، اتنی تو ہماری پوری تنخواہ بھی نہیں۔"

"ہاں۔۔۔ وہاں اسے بہت زیادہ تنخواہ جو ملتی ہے۔" ناصر بولا۔

"تم نہیں جاسکتے باہر۔"

ناصر ہنس پڑا۔۔۔ "حسد کرنے لگی ہو ان سے۔"

حسنہ ناراض ہوگئی۔ "خوب سے خوب تر کی تلاش کو حسد تم ہی کہو گے۔"

ناصر ہنس پڑا۔ "قسمت پر شاکر رہنا چاہیے۔۔۔"

"اگر کوشش سے ہم بھی باہر جاسکیں تو ہرج کیا ہے؟"

"میں نے ان خطوط پر کبھی نہیں سوچا۔"

حسنہ ہنس کر بولی۔ "میری بڑی خواہش ہے۔"

"کیا؟"

"باہر جانے کی۔"

ناصر مذاق سے بولا۔ "گویا تمہیں نازیہ کی جگہ ہونا چاہیے تھا۔"

حسنہ مذاق سمجھتے ہوئے اٹھلائی" یا آپ کو عمر ہونا چاہیے تھا۔"

دونوں ہنس پڑے۔ پھر باتیں ہوتی رہیں۔ ناصر اور حسنہ نے طے کر لیا کہ عمر

جب سالانہ چھٹی پر گھر آئے گا تو اس سلسلے میں اس سے بات کریں گے۔

عمر اور نازیہ مہینے کی چھٹی پر گھر آ رہے تھے۔ دونوں نے ہر فرد کے لیے بیش قیمت تحائف خریدے تھے۔ دونوں بے حد خوش تھے۔ اپنے آنے کی اطلاع انہوں نے گھر پر دے دی تھی۔ ناصر اور حسنہ بھی گھر آ گئے تھے۔ چند دنوں کی چھٹی لے کر وہ عمر کے آنے سے پہلے ہی گھر پہنچ گئے تھے۔ تقریباً ایک سال کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ خوشی کے جذبے کچھ زیادہ ہی بے قرار ہو رہے تھے۔

ناصر اور حسنہ دونوں کو لینے ایئرپورٹ گئے۔ بے تابانہ خوشیوں کا ملنے پر دونوں طرف سے اظہار ہوا۔

لیکن——

خوشیاں جیسے راس نہ آئی تھیں۔

واپسی پر گاڑی کا اندوہناک حادثہ پیش آ گیا۔ ناصر ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ اس کے ساتھ عمر اور پیچھے نازیہ اور حسنہ تھیں کہ کار سامنے سے آنے والے ٹرک سے ٹکرا گئی۔

عمر اور حسنہ شدید زخمی ہوئے۔ لیکن شومئ تقدیر' نازیہ اور ناصر دونوں موقعے پر ہی ہلاک ہو گئے۔ دونوں بچے معجزانہ طور پر بچ گئے۔

ایک قیامت بپا تھی۔

لیکن

کاتب تقدیر نے جو لکھ دیا تھا۔ وہی ہونا تھا۔ اس کو بدلنے کی کسے تاب و مجال تھی۔ والدین کی کمر ہمت ٹوٹ گئی۔

حسنہ راکھ ہو گئی——

عمر پتھرا گیا——

پھر——

وقت گزرتا چلا گیا۔ عمر بچوں کو ماں کے پاس چھوڑ کر اکیلا ہی باہر چلا گیا۔ وہ بالکل چپ تھا۔ گم صم اپنی سوچوں سے ہی الجھتا رہتا۔

اگلے سال عمر واپس آیا تو صدمے سے نپٹنے کی ہمت پا چکا تھا۔ ہاں اس کے بوڑھے والدین کچھ اور بوڑھے ہو گئے تھے۔ اور حسنہ لُٹی پٹی تھی۔ بے چاری نے چاروں

بچوں کو اپنے دامن شفقت میں پناہ دے رکھی تھی۔ عمر کے بچے اب اُسے ماں سمجھتے تھے۔

اور

جیسے عمر کے بچے حسنہ کو ماں سمجھتے تھے' ویسے ہی حسنہ کے بچے عمر کو ابو ہی سمجھے۔ وہ آیا تو چاروں بچے "ابو آ گئے' ابو آ گئے۔" کی رٹ لگائے اس سے چمٹ گئے۔

حسنہ کا دل بے طرح بھر آیا۔ امی اور ابو کی آنکھوں سے سیلابِ اشک رواں ہو گیا۔ شام چائے کی میز پر جب سب چائے پی رہے تھے۔ بچے پھر عمر کے گرد جمع ہو گئے' حسنہ کے بیٹے نے بڑی معصومیت سے کہا "ابو—— امی بڑی خراب ہیں۔"

"کیوں؟" عمر نے پہلے بچے کو پھر حسنہ کو دیکھا۔

"کہتی تھیں' ہمارے ابو اللہ میاں کے پاس چلے گئے ہیں۔ جھوٹ کہتی تھیں نا؟"

"ہاں—— ہاں بیٹے" عمر نے بچے کو گود میں بھر لیا۔

"آپ اللہ میاں کے پاس تو نہیں گئے نا۔" وہ سادگی سے پوچھ رہا تھا۔

حسنہ خفت سی محسوس کر رہی تھی۔ بے حد دکھی ہو رہی تھی۔ بچے کو عمر کی گود سے لیتے ہوئے بولی۔ "بیٹے' یہ آپ کے چچا میاں ہیں۔"

"ابو ہیں۔" بچہ ضد سے بولا۔

"ہاں بیٹے۔ ہم آپ کے ابو ہیں۔ امی غلط کہتی تھیں۔ آئیں میرے پاس۔" عمر نے حسنہ کی طرف دیکھتے ہوئے بچے کو چمکارا۔ بچہ اس سے لپٹ گیا۔ حسنہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور وہ سفید دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی۔

اسی رات عمر کے ابو اور امی نے حسنہ اور عمر کو نکاح کے بندھن میں باندھنے کا فیصلہ کر لیا۔

بچے حسنہ سے مانوس تھے۔ ناصر کے بچے عمر کو ابو کہتے تھے۔ حسنہ' ناصر کی بیوہ تھی۔ اس کے گھرانے کی عزت تھی۔ اس عزت کو اپنا دامن ہی سمیٹ سکتا تھا۔ جوان جہاں حسنہ کی زندگی کا سہارا عمر ہی بن سکتا تھا۔

صبح جب سب ناشتہ کر کے اٹھ گئے تو امی نے عمر کو اپنے کمرے میں بلایا۔

اور——

پھر——

آنسوؤں کی نمی میں ساری بات عمر کے گوش گزار کر دی۔

عمر بڑے اطمینان سے بڑی خاموشی سے ماں کی باتیں سنتا رہا۔

امی اپنے آنسو آنچل میں جذب کرتے ہُوئے بولیں۔ "عمر' تمہارے لیے رشتوں کی بے شک کمی نہیں۔ اچھے اچھے گھرانوں کی لڑکیاں مل جائیں گی۔۔۔ لیکن بچے حسنہ سے مانوس ہیں۔ حسنہ۔۔۔"

"امی۔" عمر نے اک گہری ٹھنڈی آہ بھری۔ پھر آہستگی سے بولا "آپ نے جو کچھ سوچا وہی ہونا تھا امی۔۔۔ میری تقدیر میں یہی تھا۔۔۔ یہی تھا امی۔"

"تو تم رضامند ہونا۔۔۔"

اس نے سر جھکا کر کہا۔ "میرے رضامند ہونے نہ ہونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اپ حسنہ۔۔۔"

"حسنہ سے بھی پوچھ لُوں؟"

"پوچھنے کی ضرورت کیا ہے امی؟"

"پھر بھی بیٹے۔"

"امی تقدیر مدتوں پہلے یہ ناطہ جوڑ چکی ہے۔"

عمر کی بات پر امی نے دھندلائی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ وہ بے حد سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہی خواب ڈھل رہا تھا جو اس نے ایک مدت پہلے دیکھا تھا۔

آج اس نے سارا خواب ماں کو سنا دیا۔ امی حیران و ششدر اسے دیکھ رہی تھیں۔ "یہ خواب نہیں تھا ماں' میرا نوشتۂ تقدیر تھا جو مجھے بہت پہلے دکھا دیا گیا تھا۔ میں نے اسے بھلانے کی بہت کوشش کی' لیکن وہی ہوا ماں۔۔۔ وہی ہوا۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔"

وہ چند لمحے چپ رہا۔

پھر۔۔۔

ہولے ہولے جیسے کہہ رہا تھا۔ "اس کی آخری کڑی یہی تھی۔۔۔ آخری منظر یہی تھا۔"

ماں کے منہ سے جیسے بات ہی نہ نکل رہی تھی۔ گُنگ سی اسے تکے جا رہی تھی۔۔۔ عمر آہستہ آہستہ ساری باتیں بتا رہا تھا۔

"خواب کا آخری منظر کچھ ایسا ہی تھا امی۔۔۔ میں نے حسنہ کو بے حد سوگوار

سفید چادر اوڑھے اپنے برابر کھڑے دیکھا تھا۔ آپ نے اس کے سر سے سفید چادر اتار کر گلابی دوپٹہ اوڑھا دیا تھا۔ اور چار ترو تازہ پھول اس کی جھولی میں ڈال کر اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا تھا۔"

عمر شدتِ کرب سے بے کل تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

امی سسکیاں بھرنے لگیں۔

اور۔۔۔

پھر۔۔۔

کچھ عرصے بعد جب عمر حسنہ اور بچوں کو لے کر ملک سے باہر جا رہا تھا' حسنہ ہچکیوں سے روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "مجھے باہر جانے کا بہت شوق تھا' لیکن میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ناصر کی بجائے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔"

عمر آنسو بھری مسکراہٹ سے حسنہ کو دیکھ کر بولا۔ "ایسا چاہا تو میں نے بھی نہیں تھا حسنہ۔۔۔ لیکن میں جانتا تھا کہ یہ دن آئے گا ضرور۔۔۔"

حسنہ نے حیرانی سے اُسے دیکھا تو عمر نے سارا خواب۔۔۔ بھیانک سا خواب حسنہ کے گوش گزار کر دیا۔

وہ حیرانی سے پتھرا سی گئی۔۔۔

قول و فعل

اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی ڈاکٹر شفقت نے کوٹ اتار کر کرسی کی پشت پر پھینکا اور دوسری آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا ہوا نیلا لفافہ چاک کیا۔ اس کے لبوں پر بڑی شفیق مسکراہٹ تھی۔ خط جگو کا تھا۔ اس نے نیلا لفافہ دیکھتے ہی تحریر پہچان لی تھی' ویسے بھی پاکستان سے جو میل آتی تھی اس میں شاذ ہی کوئی کسی دوسرے کا خط ہوتا۔ ہر ہفتے باقاعدگی سے جگو ہی کا خط ملا کرتا تھا۔ ابا کی طرف سے مہینے بھر میں ایک آدھ شفقت نامہ مل جاتا تھا۔ بڑے بھائی تیسرے چوتھے ماہ کبھی کوئی ضروری بات ہوتی تو خط لکھ دیتے تھے۔ بیاہی بہنیں شوہروں اور بچوں میں اتنی مصروف رہتی تھیں کہ وقت ہی نہ نکال سکتیں۔ ہاں ان کے کارڈ عیدوں پر باقاعدگی سے ملتے تھے۔ اسے کسی سے گلہ بھی تو نہیں تھا۔ گلے والی بات بھی کونسی تھی۔ اسے جگو کا خط جو مل جاتا تھا۔

جگو کے خط کو وہ ہمیشہ اخبار کہا کرتا تھا۔ تین چار اور کبھی کبھی پانچ چھ مضامین پر مشتمل خط زمانے بھر کی خبریں سمیٹے ہوئے تھا۔ ہر بات' ہر خبر ہر' واقعہ وہ اتنی باریک بینی سے اور تفصیل سے لکھا کرتی تھی کہ شفقت پڑھتے ہوئے اپنے آپ کو پاکستان میں ہی محسوس کرتا۔ بہن بھائیوں میں گھرا ہوا' ابا امی سے باتیں کرتا' اپنوں سے ملتا ہوا محسوس کرتا۔

شفقت میڈیکل کرتے ہی یہاں آ گیا تھا۔ ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم و تربیت لینے کی اسے ہمیشہ سے خواہش تھی۔ اس کی امی اور ابا تو ہرگز اس کے حامی نہ تھے کہ وہ ایم بی بی ایس کرتے ہی انگلینڈ چلا جائے لیکن وہ بضد تھا۔

"شفقت میاں خیر سے تعلیم سے فارغ ہوئے ہو اب یہیں کہیں نوکری کر لو—— بھئی کچھ ہمیں بھی دم لینے دو۔ جانتے ہو کتنی مشکلوں سے تمہیں تعلیم دلوائی ہے۔" ایک دن ابا نے کہا۔

"مجھے احساس ہے ابا جی۔" وہ سعادت مندی سے بولا۔ "میں اسی لیے باہر جانا چاہتا ہوں۔ وہاں جاب بھی کروں گا۔ آپ پر اب مزید بار نہیں ڈالوں گا۔ صرف آپ کی اجازت چاہیے۔ اور تھوڑا سا خرچہ۔ بس!"

"یہی تو میں کہتا ہوں۔ کچھ دیر یہاں نوکری کر کے پیسے جمع کر لو۔ پھر چلے جانا۔ ہمارے پاس کونسے خزانے رکھے ہیں بیٹا۔ تھوڑا سا پیسہ جگو کی شادی کے لیے رکھا ہے۔"

"اوہ جگو تو ابھی بہت چھوٹی ہے ابا جی۔ اس کے بیاہ تک میں انشاء اللہ اتنا کمانے لگوں گا کہ آپ کو کوئی پرابلم نہ ہو گی۔ اپنی منی سی بہن کی دھوم دھام سے شادی کروں گا۔ ابھی تو پانچ چھ سال ہیں اس کی شادی میں—— چودہ پندرہ برس کی تو ہے ابھی۔"

"وقت گزرتے پتہ نہیں چلتا۔"

"انشاء اللہ اچھا وقت ہی آئے گا۔"

"تمہاری ماں بھی تمہیں نظروں سے دور کرنا نہیں چاہتی۔"

"انہیں میں منا لوں گا۔ آخر بڑی آپا بھی تو ملک سے باہر گئی ہوئی ہیں۔ چھوٹے بھائی جان بھی تو دوبئی جانا چاہ رہے ہیں۔"

"کئی دن نہیں کئی ماہ بحث مباحثے ہوتے رہے تھے۔ شفقت اپنے طور پر ضروری کارروائی بھی کرتا رہا تھا۔ بالا بالا ہی اس نے انتظامات کر لیے تھے۔ وہ ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کرنا چاہتا تھا۔ متوسط طبقے کا فرد اپنی محنت اور لگن سے اونچے طبقے میں مقام پا سکتا۔" اس نے یہی عزم کر رکھا تھا۔ نامساعد حالات میں بھی اس نے دن رات ایک کر کے میڈیکل کیا تھا۔

اور اب وہ مزید تعلیم پانے کے لیے باہر جانا چاہتا تھا۔

اس کی لگن اور ولولے کے سامنے والدین کو ہار ماننا پڑی۔ ویسے اس کے ابا میاں سعادت علی سمجھدار آدمی تھے۔ مالی حالات کے پیشِ نظر وہ مخالفت کرتے تھے' ورنہ بیٹے کو ڈاکٹر بنانے اور ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم دلانے کے وہ مخالف کہاں تھے۔ اتنا بھی جانتے تھے کہ شفقت جتنا روپیہ وہاں جا کر چند سالوں میں کما سکتا ہے یہاں عمر بھر نہیں کما سکتا۔ اسی

لیے جب شفقت اپنی ضد منوانے پر تلا رہا تو انہوں نے جگو کے لیے رکھے ہوئے پیسے میں سے اسے اتنی رقم دے دی کہ وہ باہر جا سکے۔

شفقت ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کرنے کے بعد سٹیٹس چلا آیا تھا۔ ان دنوں وہ شکاگو میں تھا۔ بہت اچھی جاب ملی ہوئی تھی۔ ہزاروں ڈالر کی آمدنی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کے مالی حالات سے بے خبر نہیں تھا نہ ہی اس پر خود غرضی مسلط ہوئی تھی۔ وہ والدین کو باقاعدگی سے اتنے پیسے بھیج دیا کرتا تھا کہ وہ فکرِ معاش سے آزاد ہو گئے تھے۔

جگو کی شادی کے لیے وہ الگ رقم بھیجتا تھا۔ اس کی شادی وہ بڑی دھوم دھام سے کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اسی کے لکھنے پر ابا نے جگو کا بینک اکاؤنٹ کھلوایا تھا۔ اور اس میں ہر ماہ خاصی رقم جمع ہو رہی تھی۔

جگو اسے بے حد عزیز تھی۔ اپنی ساری کامیابی کی اساس وہ جگو ہی کو سمجھتا تھا۔ جگو کی شادی کے لیے رکھے گئے پیسے سے اسے مدد نہ ملتی تو آج وہ شاید اس مقام پر نہ ہوتا۔

ویسے بھی جگو اسے بہت پیاری تھی۔ ہر ہفتے کتنی باقاعدگی سے خط لکھا کرتی تھی۔ وہ بڑے پیار سے اس خط کو پڑھتا تھا۔ دنیا جہان کے قصے لکھے ہوتے۔ چھوٹی چھوٹی بات بھی لکھنا نہ بھولتی۔ اگر کوئی بات بھول بھی جاتی تو دوسرے خط میں تفصیل سے ذکر ہوتا۔

"شانی بھائی جان آج ہماری گلی میں بڑی لڑائی ہوئی۔ وہ جو عظمت بھائی ہیں نا—— بھول تو نہیں گئے آپ انہیں۔ ان کی بیوی بڑی لڑاکا ہے۔ ہائے بھابی فوزیہ۔ آپ کے یہاں ہوتے ہی تو شادی ہوئی تھی۔ ہاں تو فوزیہ بھابی کی مرغی رحمتے ماسی کے گھر انڈے دیتی تھی۔ فوزیہ بھابی کو پتہ چلا تو ان کے ہاں انڈے لینے جا پہنچی۔ بھلا انڈے بھی کوئی چھوڑتا ہے۔ رحمتے ماسی روزانہ انڈا تل کر کھایا کرتی تھی۔ بس اسی بات پر وہ لڑائی ہوئی، وہ لڑائی ہوئی—— سارا محلّہ اکٹھا ہو گیا۔"

"شانی بھائی ان دنوں امی ابا میں بڑی جھڑپیں ہو رہی ہیں۔ ابا زیادہ وقت باہر گزارنے لگے ہیں۔ گھر آتے ہیں تو لوگوں کے جمگھٹے ہوتے ہیں۔ پتہ ہے کیوں؟ ابا کو ان دنوں سوشل ورکر بننے کا شوق ہو رہا ہے۔ ویسے شانی بھائی یہ کوئی بری بات بھی تو نہیں۔ ابا کہتے ہیں شانی نے فکرِ معاش سے آزاد کر دیا ہے۔ چلو لوگوں کے کام ہی آتا رہوں۔ بیکار بھی تو نہیں نا بیٹھ سکتے۔ وہ بھلا کوئی اتنے بوڑھے ہیں جو گھر پلنگ پکڑ کر بیٹھ جائیں۔ ویسے

شانی بھائی امی کو ان کی مصروفیات سے چڑ نہیں، نہ ہی ان کی یہ خواہش ہے کہ ابو ان کے پاس ہی رہا کریں۔ پتہ ہے انہیں تکلیف کیوں ہوتی ہے۔ بتاؤں؟ ابا کے مہمانوں کے لیے چائے پانی کھانا وانا بنانا پڑتا ہے نا اس لیے۔"

"شانی بھائی آپ کو بڑی بھابی کے چچا کے فوت ہونے کی خبر مل گئی ہے نا۔ ہائے میں تو اتنا روئی، اتنا روئی کہ بے ہوش ہو گئی۔ حادثے میں ان کی لاش بھی تو بری طرح کچلی گئی تھی، ہائے بھائی جان دو چھوٹے چھوٹے بچے رہ گئے ہیں۔ توبہ توبہ۔"

"اس دفعہ آپ نے جو پیسے ابا کو بھیجے ہیں نا۔ اماں چاہتی ہیں کہ باورچی خانہ ٹھیک کروالیں۔ بالکل ولایتی طرز کا بنوالیں۔ گیس ہماری گلی میں بھی آ گئی ہے۔ اماں تین چولہوں والی ککنگ رینج خریدنا چاہتی ہیں۔ واقعی بہت اچھا ہوگا۔ مہمان بھی تو بہت آتے ہیں ہمارے گھر۔ گو ابا ایسے مہمانوں پر کچھ زیادہ خرچ نہیں کرتے پھر بھی چائے تو پلانا ہی پڑتی ہے۔"

"شانی بھائی میں نے ایف۔اے پاس کر لیا ہے۔ آپ کو پچھلے خط میں خبر دی تھی نا—— اب امی بی۔اے میں داخل نہیں کروائیں گی۔ میں نے سوچا ہے چھوٹے چھوٹے کورسز کر لوں۔ شانی بھائی آج کل یہاں دس دس پندرہ پندرہ دن کے کورسز میں بہت اچھی اچھی چیزیں سکھائی جاتی ہیں۔ ایک سنٹر ہماری گلی کے بالکل سامنے والے بڑے مکان میں بھی کھلا ہے۔ وہاں کاغذ اور شیشے کے پھول، سیپوں کا کام، کٹائی سلائی اور کھانا پکانا سکھاتے ہیں۔ میں بھی سب کچھ سیکھوں گی۔ جب آپ آئیں گے نا تو مزے مزے کی چیزیں پکا کر کھلاؤں گی۔"

"شانی بھائی ابا تو سوشل لیڈر بنتے جا رہے ہیں۔ کل انہوں نے ایک چھوٹے سے جلسے میں تقریر کی—— اور کئی سو روپے چندہ جمع ہو گیا۔ آج انہوں نے بیوہ عورتوں کے لیے ایک سلائی گھر بنایا ہے جو چندے پر چل رہا ہے۔ بیوہ عورتوں کی مدد کے ساتھ انہیں مشینیں بھی دیتے ہیں اور سلائی کا کام بھی—— واقعی شانی بھائی جان ابا بہت کام کر رہے ہیں اس سلسلے میں۔ آپ کتنے اچھے ہیں شانی بھائی۔ صرف میرے خط پڑھ کر ہی ابا جی کو چندے کے لیے اتنی رقم بھیج دی۔ ان دنوں وہ گاؤں گاؤں جا کر لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ ابا تو ان دنوں بات بات پر تقریریں کرنے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں بس چلے تو گاؤں گاؤں مدرسے کھول دوں، ہسپتال بنا دوں، سڑکیں پانی اور بجلی کا انتظام کرا دوں۔ ویسے شانی بھائی

ایک بات بتادوں۔ آپ نے جو رقم بھیجی تھی نا فنڈ میں۔ امی ابا کہتے تھے حساب ہی سے بھیجا کریں۔ ہنسنے کی بات ہے نا؟"

جگو کے خط ہمیشہ ہی تفصیلات لیے ہوتے تھے۔ آج بھی شفقت نے کرسی میں آرام سے تقریباً لیٹتے ہوئے خط کھولا۔ خط حسبِ معمول کافی بوجھل تھا۔

آج جگو نے اخباروں کے تین چار تراشے بھی ساتھ بھیجے تھے جن میں ابا کی تصویریں اور تقریریں چھپی تھیں۔

"ابا تو واقعی لیڈر بنتے جارہے ہیں۔" شفقت نے تصویروں پر مسکراتے ہوئے نگاہ ڈالی۔ پھر خط پڑھنے لگا۔

خط واقعی دلچسپ تھا۔ حسبِ معمول اس نے چھوٹی چھوٹی مزے مزے کی باتیں لکھی تھیں۔ خاندانی جھگڑے جو تایا ابا کے ساتھ چل رہے تھے ان کا بھی ذکر تھا۔ اپنے سنٹر کا بھی حال لکھا تھا جہاں ان دنوں وہ پھول بنانا سیکھ رہی تھی۔ اپنی سہیلی کی شادی کا بھی حال لکھا تھا جس میں وہ گوٹے والا غرارہ پہن کر گئی تھی۔ اور سب سہیلیوں نے اس لباس میں اس کی بے حد تعریف بھی کی تھی۔ بڑے بھتیجے کے چھت پر پتنگ اڑانے اور بھابی کے کوسنے بھی لکھے تھے۔ ابا کی سرگرمیوں اور مصروفیات کا لکھنے کی بجائے اس نے اخباروں کے تراشے بھجوا دیئے تھے۔

شفقت نے خط ختم کر کے میز پر رکھ دیا۔ "زندہ باد جگو۔" اس کے لبوں سے نکلا۔

پھر

اس نے پھر اخباروں کے تراشے اٹھالیے' ابا کی تصویریں اچھی تھیں۔ پانچ سالوں میں ذرا بھی تو بدلے نظر نہ آتے تھے۔ ماشاءاللہ صحت بھی خوب تھی۔ تصویریں دیکھنے کے بعد وہ اخبار کے حوالے سے تقریریں پڑھنے لگا۔ واقعی ابا کسی لیڈر کی زبان سیکھ چکے ہیں۔ کتنے موثر انداز میں اپیل کی تھی۔ کتنے پُر تاثیر الفاظ کہے تھے۔

شفقت کا دل عقیدت و احترام کے جذبات سے بھر گیا۔ اس کے ابا قریب ہوتے تو وہ یقیناً ان کے سامنے سر جھکا کر انہیں تعظیم دیتا۔ ان کے خیالات پڑھ کر شفقت کا سینہ فخر سے تن گیا۔ ملک و ملت کو ایسے ہی بے لوث خدمت گزاروں کی ضرورت تھی۔ وطن سے دور رہ کر وطن اور ہم وطنوں کی محبت کچھ زیادہ ہی جاگ اٹھتی ہے۔ شفقت کے دل میں ابا کی مختلف اخباروں میں چھپی تقریریں پڑھ کر یہ جذبات جاگ اٹھے تھے۔

وہ کتنی ہی دیر آنکھیں موندے کرسی کی پشت پر گردن ڈالے تصور کی آنکھ سے اپنے وطن اور اس کے مکینوں کو دیکھتا رہا جو قدم قدم پر مسائل سے دوچار تھے۔

دروازے پر ناک ہوا تو شفقت خیالات سے چونکا۔

اوہ! وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ یقیناً ڈاکٹر صدیقی آیا تھا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔

وہ صدیقی ہی تھا۔

"تیار نہیں ہوئے؟" صدیقی نے اس کی طرف دیکھا۔ "تم نے تو دس منٹ میں آنے کا کہا تھا۔"

"یہ اخبار پڑھنے لگا تھا۔ بھول ہی گیا۔" شفقت نے مسکراتے ہوئے جگو کے خط کی طرف اشارہ کیا۔

"آج تو واقعی اخبار کے تراشے بھی ہیں۔" صدیقی نے میز پر سے ایک تراشا اٹھالیا۔

"اباجی کی تقریریں اور تصویریں چھپی ہیں۔" شفقت نے بڑے فخر سے کہا۔

"واقعی!"

"ہاں اباجی تو پورے لیڈر بن گئے ہیں۔ کتنا درد ہے ان کی تقریروں میں۔ ذرا پڑھو تو۔"

تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ میں پڑھتا ہوں۔ فنکشن میں جانا ہے۔ دیر نہ ہو جائے۔

اور

جب دونوں فنکشن میں شمولیت کے لیے جارہے تھے صدیقی بڑے اچھے الفاظ میں اس کے ابا کی تقریروں کی تعریف کر رہا تھا۔

"قوم کو ایسے ہی مخلص اور بے لوث خدمت گزاروں کی ضرورت ہے۔ قوم کا درد تو میں سمجھتا ہوں۔ اللہ کی دین ہے۔ روشن ہے وہ سینہ جس میں یہ درد جاگ اٹھے۔ عظیم ہے وہ دل جو اس درد کو محسوس کرے۔"

صدیقی کی باتوں سے شفقت نے بڑا فخر محسوس کیا۔

"تین چار ہزار ڈالر۔" "تیس چالیس ہزار روپیہ بنتا ہے۔ جگو کی ماں تیس چالیس ہزار روپیہ۔ یہ اپنے شانی کی تنخواہ ہے۔ اتنی بہت۔"

"ہاں ہاں۔ ماشاءاللہ کہو ماشاءاللہ۔"

"اپنا شفقت بہت بڑا ڈاکٹر ہے اور بھی ترقی کرے گا۔"

کیسٹ پلیئر آن تھا۔ دھواں دھار تقریر ہو رہی تھی۔ کمرے میں بیٹھے سبھی لوگ خاموشی سے تقریر سن رہے تھے۔ شفقت بے حد متاثر نظر آ رہا تھا۔ صدیقی بلوچ اور رفیع بھی تقریر سن رہے تھے۔

جگو نے ابا کی تقریر اور جلسے کی کارروائی ریکارڈ کروا کے کیسٹ شانی کو بھیجا تھا۔
اس تقریر میں ابا میاں نے دیہی علاقوں کی پسماندگی کے متعلق لوگوں کو بڑے درد بھرے انداز میں بتایا تھا۔ گاؤں میں رہنے والے غریب لوگوں کی حالتِ زار کا نقشہ بڑے دلدوز انداز میں کھینچا تھا۔

یہ لوگ جانوروں کی سی زندگی گزار رہے تھے۔ انہیں زندگی کی بنیادی سہولتیں بھی حاصل نہ تھیں۔ ان کے دماغ علم کی روشنی سے محروم تھے۔ انہیں پیٹ بھر کر کھانا تک نصیب نہ ہوتا تھا۔ تن پر پورے کپڑے نہ میسر ہوتے تھے۔

تقریر جس درد بھرے انداز میں کی جا رہی تھی۔ سننے والے اس درد کو اپنے سینے میں اترتا محسوس کر رہے تھے۔

تقریر ختم ہوئی۔ لوگوں کی زوردار تالیوں کی گونج کے ساتھ ہی شانی نے ٹیپ بند کر دیا۔

"بہت عمدہ انداز ہے تقریر کا۔"

"بڑا درد بھرا۔"

"ہمارے ملک میں کتنے سنگین مسائل ہیں۔ جن سے لوگ دوچار ہیں۔"

"خاص کر گاؤں کے۔"

"بالکل جہالت اور غربت۔"

"خدا رحم کرے۔"

تقریر کے حوالے سے باتیں ہونے لگیں۔ ان سب لوگوں نے بہت زیادہ اثر لیا تھا۔ وہ اپنے ملک کے غریب عوام کے لیے کچھ نہ کچھ کرنے کا سوچنے پر مجبور ہو گئے۔

آپس میں باتیں کرتے ہوئے وہ اپنے غریب عوا کی مدد کا سوچنے لگے۔

"ہم لوگ یہاں بیٹھ کر یہی کر سکتے ہیں کہ ہر ماہ اپنی آمدنی کا کچھ حصہ وہاں بھیج

دیا کریں۔ فنڈ جمع ہو تو کسی حد تک مسائل سے نپٹا جا سکتا ہے۔"

صدیقی نے بڑی سوچ بچار کے بعد کہا:

"بالکل میں تمہاری تائید کرتا ہوں۔" بلوچ بولا: ہم لوگ یہاں اللہ کے فضل سے اتنا کما رہے ہیں۔ کچھ قوم کی خدمت ہی ہو جائے۔"

"قطرہ قطرہ دریا بنتا ہے۔ ہم پہل کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے دوسرے صاحبِ استعداد لوگ بھی ہماری تقلید کریں۔"

"ضرور کریں گے۔" شفقت نے کہا۔

سب نے معقول چندہ ہر ماہ دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ سب نے اپنی خوشی سے کیا تھا۔ میاں صاحب کی تقریر نے دلوں میں گداز جو بھر دیا تھا۔

ہر تقریر کا کیسٹ جگو خطوں کی طرح بڑی باقاعدگی سے بھائی کو بھیجنے لگی۔ شانی تقریر خود سنتا' دوستوں کو سناتا اور پھر سب ہزاروں میل دُور بیٹھے اپنے ہم وطن غریبوں کی فلاح و بہبود کے بارے میں سنجیدگی سے منصوبے بنانے لگتے۔

شانی کے ابا میاں سعادت علی اب خاصی جانی پہچانی شخصیت بن گئے تھے۔ تقریر کے فن میں ماہر ہو چکے تھے۔ اتنے درد بھرے انداز میں تقریر کرتے کہ سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔

اس دفعہ جو کیسٹ آیا تھا اس نے شانی کو تو بری طرح متاثر کیا تھا۔ وہ کیسٹ کا وہ حصہ جس میں ابا جی نے پڑھے لکھے جوانوں سے اپیل کی تھی بار بار سن رہا تھا۔

سن رہا تھا۔

اور

سوچ رہا تھا۔

اب بھی وہ کرسی میں کھوئے کھوئے انداز میں پڑا تھا۔ ٹیپ آن تھا۔ اور میاں صاحب کی آواز گونج رہی تھی۔

"انشاءاللہ۔ انشاءاللہ"

"ہم لوگ تو اسے باہر جانے ہی نہ دیتے تھے۔ اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کتنا غلط رویہ تھا ہمارا۔"

"تھا تو ——— لیکن مجبوری تھی۔ ورنہ ہمیں پتہ نہیں تھا کیا؟ کہ باہر جا کر وہ بہت

زیادہ کمائے گا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ خدا کا شکر ہے اس نے ہمارے بیٹے کو اتنی کامیابی دی۔"

"جی ہاں۔ اسی کا احسان ہے اور شانی کی محنت۔"

"یہاں ہوتا تو اتنے پیسے کمانے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔"

"بالکل — کیا ملتا ہے یہاں ڈاکٹروں کو۔ پریکٹس بھی کریں جب بھی اتنی آمدنی نہیں ہوتی۔ نوکری میں تو اتنی رقم کا سوچ بھی نہیں سکتے۔"

شفقت کا خط آیا تھا۔ امی ابا خط پڑھنے کے بعد خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ پچھلے ہفتے اس کی تنخواہ میں اضافہ ہوا تھا۔ اس نے یہ خوشخبری ماں باپ کو خط میں سنائی تھی۔

"کچھ آنے کا بھی لکھا ہے؟" امی نے خط ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا۔

"اس سال چکر لگائے گا۔"

"صدقے جاؤں۔ آنکھیں ترس گئی ہیں۔"

"اب فکر نہ کرو۔ ہر سال چکر لگایا کرے گا۔ اتنی آمدنی ہے۔ ماشاء اللہ۔ کیا مشکل ہے پاکستان آنا۔"

"میں تو یہی لکھوں گی کہ ہر سال مل جایا کرو۔"

"اپنی اداسی کا زیادہ ذکر نہ کیا کرو خطوں میں۔ کہیں اس کا دل وہاں سے اچاٹ نہ ہو جائے۔"

"لو جی۔ مجھے بے وقوف سمجھ رکھا ہے۔ اول تو خط لکھتی ہی کون سا ہوں۔ جگو ہی لکھتی ہے۔ کبھی لکھوں بھی تو اداسی کا اظہار نہیں کرتی —"

"شکر ہے اس نے دل لگا لیا ہے۔ اس کی اور ہماری بہتری اسی میں ہے کہ وہ وہاں ہی رہ کر خوب دولت کمائے۔"

"ہمارے دن بھی تو پھر گئے ہیں۔"

"ابھی تو اور پھریں گے جگو کی ماں۔ موٹر بھیجے گا شفقت۔ کوٹھی بنوا کر دے گا۔ جگو کی شادی دھوم دھام سے کرے گا۔"

"اللہ اسے زندگی دے اور اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ اب بھی جو ٹھاٹھ باٹھ ہیں اسی کے دم سے ہیں وہ پیسے نہ بھیجے تو سمجھ آ جائے سب کو۔ آپ کی لیڈری دھری کی دھری رہ جائے۔"

"اوہ بیگم صاحبہ — لیڈری اسی کے طفیل ہی تو ہے۔ اس نے غم معاش سے آزاد کر دیا ہے۔ ہم نے وقت گزاری کے لیے یہ مشغلہ اختیار کر لیا۔ ویسے اب موٹر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور کوٹھی بھی ضرور ہونی چاہیے۔ بڑے بڑے لوگ ہمارے حلقے میں آ رہے ہیں۔ ان سے ملتے ہوئے ذرا جھجک سی ہوتی ہے۔ اپنے پاس گاڑی ہے نہ بنگلہ اور لیڈر بنے ہوئے ہیں۔"

"گاڑی تو بیٹا بھیج رہا ہے۔"

"جیتا رہے کوٹھی بھی بنوا دے گا۔"

دونوں خوشی کا بے پناہ اظہار کرتے ہوئے شفقت کی باتیں کرتے رہے۔

"جگو۔"

"جی امی۔"

"کہاں ہو؟"

"کمرے میں۔"

"کیا کر رہی ہو؟"

"کوئی کام ہے امی۔"

"ہاں ذرا باہر آ ابا کے کپڑے استری کر دے انہوں نے جلسے میں جانا ہے۔"

"اچھا آئی یہ صفحہ لکھ لوں۔"

"خط لکھ رہی ہو گی شانی کو۔"

"جی۔"

امی دروازہ کھول کر کمرے میں آ گئیں۔ جگو میز پر جھکی جلدی جلدی خط لکھ رہی تھی۔

"جانے کون کون سے قصے کہانیاں لکھتی رہتی ہے۔" امی نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔

"بے چارے اتنی دور بیٹھے ہیں میں بھی انہیں ایسے خط نہ لکھوں تو جی نہ لگے ان کا وہاں!"

"کہتی تو ٹھیک ہے تو۔ میری طرف سے محبت بھرا پیار لکھنا۔"

"اچھا جی۔"

"اور ہاں۔ یہ ابا کی لیڈری کے قصے بھی لکھنا۔ یہ بھی لکھ دینا گھر بار سے بیگانہ ہو بیٹھے ہیں۔ صبح شام ملنے جلنے والوں کا تانتا رہتا ہے اور——"

"بس امی—— میں خود ہی سب کچھ لکھ دوں گی۔ بھائی جان کو میں سب کچھ پوری پوری تفصیل سے لکھا کرتی ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ ابا جی کی مصروفیات کا تو میں نے پورے تین صفحوں پر لکھا ہے۔"

امی کو کاغذ دکھاتے ہوئے جگو مسکرائی۔ امی بھی مسکرا دیں۔

"چل پہلے کپڑے استری کر دے ابا کے۔ شور مچا دیں گے ابھی۔ خط رات کو لکھ لینا۔ آج کے جلسے کی کارروائی بھی تحریر کر دینا۔"

"اُوں ہُوں۔" جگو نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ پھر قلم کاغذ رکھتے ہوئے اٹھی۔ "آج کے جلسے کی کارروائی ٹیپ ہو گی امی۔ بھائی جان کو وہ کیسٹ بھیجوں گی۔"

"لو اور سنو۔" امی نے پیار بھری نظروں سے جگو کو دیکھا۔

"کتنے خوش ہوں گے بھائی جان۔" جگو نے آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھوں کو زور سے ملایا۔ پھر امی کو دیکھا وہ بھی خوش نظر آ رہی تھیں۔

"آج کا جلسہ بڑا زوردار ہے امی۔ ابا جی ماشاء اللہ بہت ہی مقبول ہو گئے ہیں۔ دیکھا نا آپ نے لوگ کیسے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ کتنی عزت ہوتی ہے۔ آپ تو ہمیشہ ابا جی سے جھگڑا کیا کرتی تھیں۔ اب تو آپ بھی خوش ہیں۔ ہیں نا امی؟"

"خوشی کی بات تو ہے ہی۔"

"ابا جی اسی طرح کام کرتے رہے تو سماجی لیڈر سے سیاسی لیڈر بھی بن جائیں گے۔"

"خدا کرے!"

"اور آپ؟ سیاسی لیڈر کی بیگم صاحبہ۔" جگو نے ہنستے ہوئے ماں کی ٹھوڑی کو چھوا۔

"چل جلدی سے ابا کے کپڑوں پر استری پھیر دے۔ یہ باتیں بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔" امی نے کہا۔

جگو مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ امی نے میز پر نگاہ ڈالی۔ اخباروں کے

تراشے' لمبا چوڑا خط اور ابا کی تصویریں دیکھ کر مسکرا دیں۔

ہمارے ان پڑھ 'سادہ لوح' غریب دیہاتی آپ کی مدد اور توجہ کے مستحق ہیں۔ ان لوگوں کو علم کی روشنی دیجیے۔ علاج معالجے کی سہولتیں فراہم کیجیے۔ میں اساتذہ اور ڈاکٹروں سے خاص طور پر اپیل کرتا ہوں کہ وہ شہروں میں نوکری کو ترجیح دینے کی بجائے دیہاتوں میں جا کر کام کریں۔ یہ قربانی وہ ضرور دیں۔ خدا صلہ دے گا۔

تقریر کا یہ حصہ کئی بار شفقت سن چکا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ابا نے اس سے اپیل کی ہے۔ دیہاتوں کی کسمپرسی کا واسطہ دیا ہے۔ سسکتی انسانیت کو سکون دینے کے لیے پکارا ہے۔ وہ بہت بے چین اور مضطرب ہو رہا تھا۔

"ہم لوگ صرف اپنی ذات کے خول میں مقید ہیں۔" شفقت نے سب دوستوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا لیکن میرے ابا کے افکار نے میری ذات کا خول توڑ دیا ہے۔"

"تو کیا تم نے واقعی واپس جانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟" صدیقی نے پوچھا۔

"فیصلہ ہی نہیں کیا پورا بندوبست بھی کر لیا ہے۔" بلوچ بولا۔

"وہاں جا کر کیا کرو گے۔" رفیع نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ایسی جاب وہاں کہاں ملے گی۔"

"تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" صدیقی بولا "پچھتاؤ گے جا کر۔ یہ سہولتیں یہ آسائشیں وہاں کہاں۔"

"سہولتوں اور آسائشوں کے حصار میں گھرے ہوئے ڈاکٹر بلوچ ذرا اس حصار سے باہر نکل کر دیکھو۔ اپنوں پر نظر ڈالو۔ کتنے مضطرب کتنے بے چین اور کتنے سسکتے لوگ تمہاری طرف آس بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ میں نے اپنی ذات کا حصار توڑ ڈالا ہے۔ اب آسائشوں اور سہولتوں کا چارم میرے قدم نہیں روک سکتا۔ میں واپس جاؤں گا اور اپنے دیس کے غریب' جاہل اور سسکتے بلکتے لوگوں کی خدمت کروں گا۔ تم پاکستان جانے سے کتراتے ہو۔ میں پاکستان کے کسی بھی گاؤں میں جا کر ڈیرہ جماؤں گا۔ خدمتِ خلق کا سرور میں ابھی سے محسوس کر رہا ہوں۔" شفقت نے ڈوب کر کہا۔

"تمہارے خیالات نیک ہیں۔" بلوچ نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔

"میں ان کی قدر کرتا ہوں لیکن یہاں رہ کر بھی تو ہم مدد میں معاون ہو سکتے ہیں۔"

"بالکل۔" صدیقی نے کہا "خدمت کے جذبوں کو تقویت دینے کے لیے پیسے کی بھی تو ضرورت ہوتی ہے۔ ہم یہاں سے ان لوگوں کی مالی امداد کر سکتے ہیں۔ ہمارا تعاون کئی منصوبوں کو آگے بڑھانے میں مددگار ہو سکتا ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" شفقت بولا۔ "اپنا اپنا خیال ہے۔ میں واپس جانے کا تہیہ کر چکا ہوں۔ میں عملی طور پر ان لوگوں کی مدد اور خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ میں عنقریب واپس جا رہا ہوں۔"

"تم بہت بڑی قربانی دے رہے ہو۔ خدا تمہیں اجر دے۔" رفیع نے بالآخر کہا۔

"اس قربانی کی راہ مجھے میرے عظیم باپ نے دکھائی ہے۔" شفقت بولا۔

"واقعی۔ ہم ان کی عظمت کو سلام کرتے ہیں۔" رفیع اور صدیقی بولے۔ رفیع نے عظمت کو سلام کرتے ہوئے سر قدرے خم کر لیا۔

گھر میں جیسے صفِ ماتم بچھی تھی۔

اباجی تخت پر سر پکڑے بیٹھے تھے۔ شفقت کا خط سامنے کھلا ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔

اماں باورچی خانے کے باہر تخت کے سامنے پیڑھی پر بیٹھی تھیں۔ چہرہ حزن و ملال سے بے رنگ ہو رہا تھا۔ پلکیں جھپکا جھپکا کر کبھی خط کو اور کبھی میاں جی کو دیکھ رہی تھیں۔

ان کے قریب ہی دیوار سے ٹیک لگائے جگو کھڑی کبھی ماں کو اور کبھی اباجی کو دیکھ رہی تھی۔ اسے سمجھ نہ آ رہا تھا کہ آخر شفقت کے واپس آنے کی خبر نے ماتمی صورت کیوں اختیار کر لی ہے۔

"پھر سے خط پڑھو۔" امی نے اباجی سے کہا۔ "کیا یہی لکھا ہے کہ وہ نوکری چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے واپس آ رہا ہے؟"

"ہاں ہاں۔ یہی لکھا ہے۔" اباجی سر اٹھاتے ہوئے بلند آواز میں بولے۔

"بے وقوف کہیں کا۔ لکھتا ہے خدمتِ خلق کا جذبہ مجھے کھینچ رہا ہے۔ میں دیہات میں ملازمت کروں گا۔ دیہاتیوں کی خدمت کروں گا۔ ہونہہ!"

اباجی نے سر اِدھر اُدھر ہلاتے ہوئے مایوسی سے ڈوبتی آواز میں کہا۔ "میں سوچ رہا تھا اس سال موٹر آ جائے گی تو اگلے سال کوٹھی بھی شروع کروا دوں گا۔"

امی غصے سے غرائیں۔ "یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔"

"میری وجہ سے؟" ابا پریشانی سے بولے۔

"تو اور کیا؟" وہ تلملا اٹھیں۔ "اور کرو تقریریں۔ غریبوں کی مدد کے لیے پکارو۔ دیہاتیوں کی کسمپرسی کے رونے روؤ۔"

"لیکن ان کے شفقت کے واپس آنے کا کیا تعلق؟ میں اسے تھوڑے ہی بلا رہا تھا۔"

"تمہاری آواز تو اس تک پہنچ رہی تھی۔"

"میری آواز؟ وہ کیونکر؟"

امی نے انتہائی ناگواری سے جگو کو دیکھا اور بولیں۔

"یہ ناشدنی پل پل کی خبریں جو اسے بھیجتی تھی۔ تمہاری تقریروں کے کیسٹ بھجواتی تھی—— اثر تو لینا ہی تھا اس نے—— اس نے لکھا بھی تو ہے کہ تمہاری تقریروں سے متاثر ہو کر اس نے واپس آنے اور گاؤں گاؤں جا کر لوگوں کی خدمت کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"تو کیا غلط کیا ہے؟" جگو کے لبوں سے نکل گیا۔

اباجی نے پھر ماتھا ہتھیلی پر ٹکا لیا۔ اماں کھا جانے والی نظروں سے جگو کو دیکھنے لگیں۔

جگو کو جو

دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ حیران حیران ' پریشان پریشان نظروں سے کبھی امی کو تک رہی تھی۔

اور

کبھی ابا کو

اور جس کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا کہ جوشیلی دھواں دھار تقریروں سے لوگوں کی خدمتِ خلق پر آمادہ کرنے والے ابا اپنے بیٹے کے اس جذبے کو سراہنے کی بجائے ماتم کناں کیوں ہیں۔

"کیا ان کے قول و فعل میں——"

وہ اس سے آگے کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

◆◆◆◆◆◆◆

ستم ظریفی

درد کی لہر اٹھتی تو اسے یوں لگتا لیبر روم کی دیواریں سمٹ کر اس کے اوپر آ رہی ہیں۔ چھت جھک آئی ہے اور چوڑے دودھیا شیشوں والی کھڑکیوں کے پار سے آنے والی روشنی اندھی ہو گئی ہے۔

ایک لمبی سی چیخ اس کے اندر سے اٹھتی جسے دانتوں میں ہونٹ دبا کر وہ بکھرنے سے پہلے ہی ختم کر دیتی۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں تھیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں برف کی طرح ٹھنڈے تھے۔ زندگی کی حدت سمٹ کر پیٹ میں آ گئی تھی۔

وہ تخلیق کے عمل کے آخری مرحلے سے گزر رہی تھی۔ ذات کی تقسیم کا عمل آسان تو نہیں ہوتا۔ کرب و اذیت کی منزل کو چھونا پڑتا ہے۔ وجود آری سے کتنا محسوس ہوتا ہے۔ کند چھری کی کاٹ تڑپاتی ہے لیکن پھر بھی تخلیق کا یہ عمل اور ذات کی اس تقسیم پر عورت خوش ہوتی ہے۔ عدم سے وجود میں آنے والے ننھے سے وجود کا احساس و خیال اتنا حسین اور اتنا پیارا ہوتا ہے کہ ساری اذیت' ساری تکلیف بھول جاتی ہے۔ عورت کرب کی محرابوں تلے سے گزر کر زندگی کی معراج کو چھو لیتی ہے۔ وہ بچے کو وجود میں لا کر دنیا میں ایک خوبصورت اضافے کا باعث بنتی ہے۔

لیکن

یہ خوش بختی' یہ خوشی و تفاخر کا احساس اسے نہیں ہو رہا تھا۔ وہ تخلیق کے اس خوبصورت عمل سے تڑپ رہی تھی۔ وجود کی اس تقسیم سے مسرت کی بجائے دُکھ کا

احساس جاگ رہا تھا۔

جوں جوں منزل قریب آ رہی تھی اشتیاق کی لہریں منجمد ہوتی جا رہی تھیں۔ سسٹر جینا ٹیبل کے قریب کھڑی تھی۔ وہ اسے تسلی دے رہی تھی۔

"بس—— زیادہ گزر گئی۔ تھوڑی رہ گئی۔ ہمت سے کام لو۔" درد ختم ہونے پر جب وہ بے دم سی ہو جاتی تو سسٹر جینا اس کے ماتھے کے ٹھنڈے پسینے پونچھتے ہوئے چمکارتی۔ ادھیڑ عمر جینا کو اس سے بڑی ہمدردی ہو گئی تھی۔ تین ہفتے سے وہ ہسپتال میں ایڈمٹ تھی۔

وہ ڈاکٹر ظہیرہ کی پیشنٹ تھی۔ باقاعدگی سے چیک اپ تو نہیں کروایا تھا۔ کبھی کبھی ماں کے کہنے پر دکھانے آ جاتی تھی۔

تین ہفتے پہلے وہ دکھانے آئی تو ڈاکٹر ظہیرہ نے معائنے کے بعد پوچھا:

"آپ دوائیاں لے رہی ہیں؟"

وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اس کی ماں نے کہا۔ "نہیں کبھار ہی ڈاکٹر صاحبہ۔ کھانے پینے کی طرف سے بھی غافل ہی ہے۔"

"آپ انہیں ایڈمٹ کرا دیں۔ بچہ بہت کمزور ہے اور خود ان کی صحت بھی اچھی نہیں۔ پہلا بچہ ہے نا؟"

"ہاں۔"

"شادی کو کتنی دیر ہوئی؟"

"ابھی گیارہ مہینے بھی پورے نہیں ہوئے۔"

"شادی سے پہلے بھی اتنی ہی کمزور تھیں؟"

"نہیں ڈاکٹر!"

اس کی ماں نے اک گہری ٹھنڈی آہ بھر کر کہا تھا۔

ڈاکٹر کچھ اور پوچھ نہ سکی تھی۔ دوسرے پیشنٹ نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

ماں بیٹی اٹھنے لگیں تو ڈاکٹر نے تاکیداً کہا۔ "انہیں ہوسپٹل میں ایڈمٹ کرنا ہے۔"

"آج ہی؟"

"آج یا کل۔ بہر حال تین ہفتے ابھی ہیں ڈلیوری میں۔ تین ہفتے ہوسپٹل میں ہماری زیرِ نگرانی رہیں گی۔"

"ٹھیک ہے ہم کل آجائیں گے۔"

اس کی ماں نے کہا تھا۔

اور دوسرے دن انہوں نے ہوسپٹل کا ایک اسی وقت خالی ہونے والا سنگل بیڈ کا کمرہ لے لیا تھا۔

اس وقت سسٹر جینا ڈیوٹی پر تھی۔

وہ ڈاؤن سے بیڈ شیٹ لے کر دوسری نرس کو ساتھ لائی۔ بستر کی چادر بدلتے ہوئے اس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی شفقت سے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"ارم —— رما۔" وہ اداس تھی۔

"گھبرا رہی ہو۔" سسٹر نے پیار سے پوچھا۔ پھر خود ہی بولی "اوں ہوں۔ گھبرانے کی بات نہیں۔"

پھر وہ اسے بچوں کی طرح بہلانے لگی۔ دردِ زہ کو معمولی قرار دیا۔ بچے کا خوبصورت تحفہ ساری دردوں اور تکلیفوں پر حاوی ہوگا۔

وہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اس کی ماں ضرورت کی چیزیں لے آئی تھی۔ اس کے کپڑے، تھرماس، پلیٹیں، گلاس، چمچ اور پیالیاں وہ الماری میں رکھنے لگی۔

وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ باہر سردیوں کی نکھری ہوئی صبح پھیلی ہوئی تھی۔ نیلا آسمان مسکرا رہا تھا۔ اور پرندوں کی چہکار پھولوں کے رنگوں میں اتر رہی تھی۔ باہر جتنی روشن صبح تھی اس کے اندر اتنی ہی اندھیری رات جاگ رہی تھی۔ اداسی کی کٹار اندر ہی اندر اتر رہی تھی۔

گھبرا کر وہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔ بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔ اس کا دم جیسے گھٹ رہا تھا۔ چھت نیچی ہو رہی تھی اور دیواریں سمٹ رہی تھیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اسے اینٹوں کی دیوار میں چن رہا ہے۔ اس کا جی چاہا بھاگ جائے۔ اس کمرے سے بھاگ جائے۔ ہوسپٹل سے بھاگ جائے۔

لیکن

اس کا کیا ہوتا۔ بھاگنا تو شاید وہ تقسیم کے عمل سے چاہتی تھی۔ تخلیق کے مرحلے سے فرار اختیار کرنا چاہتی تھی۔

اس کے چہرے پر ماں بننے کی خوشی کا پرتو نہیں تھا۔ سچے تخلیق کار کا نُور نہیں

تھا۔ وہ بہت پریشان تھی۔ اس کے اندر کے اندھیرے اس کے چہرے پر پھیل رہے تھے۔ اس کی خوبصورت سنہری رنگت ان اندھیروں میں ڈوب کر کچھ اور ہی ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ آنکھوں میں چمک کی بجائے یاس کے دھندلکے پھیلے تھے۔

ڈاکٹر راؤنڈ لینے آئی تو وہ بیڈ میں نڈھال پڑی تھی۔ خوش خلق سی ڈاکٹر نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ "اتنی سہمی ہوئی کیوں ہو۔ تم پہلی تخلیق کار تو نہیں ہو۔ ساری دنیا اسی عمل سے گزر کر وجود میں آئی ہے۔"

وہ چُپ رہی۔

ڈاکٹر نے سسٹر جینا سے کہا۔ "ان کی دوائیوں کے علاوہ ان کی خوراک کا بھی خیال رکھا کرو۔ ان کی کمزوری رفع ہونی چاہیے۔ بہت دھان پان سی ہیں۔ فکرمند بھی لگتا ہے بہت ہیں۔"

پھر اس نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "تم ایک خوبصورت بچے کی ماں بنو گی تو سب کچھ بھول جاؤ گی۔"

ڈاکٹر اس کا کندھا تھپتھپا کر کمرے سے نکل گئی۔ سسٹر جینا نے اک مسکراتی نگاہ اس پر ڈالی۔ اس کا کام ہر مریض سے شفقت سے ہی پیش آنا تھا لیکن اس ناتواں سی لڑکی سے اسے کچھ انس سا ہو گیا تھا۔ فارغ وقت میں وہ ضرور اس کی احوال پرسی کے لیے آجاتی۔

اس دن وہ آئی۔ "رما کیا سوچتی رہتی ہو۔ بچے کے خدوخال کے بارے میں۔ یا اس وقت کے بارے میں جب ننھے منے ہاتھ پاؤں ہلانے والا گول مٹول سا بچہ تمہاری گود میں ہوگا۔"

وہ کچھ نہیں بولی۔ اس نے اک گہری سانس لی۔ شدتِ کرب سے اس کی آنکھیں پھٹنے کو تھیں۔

"کیوں رما —— بیٹی لوگی یا بیٹا؟" سسٹر نے اسے بہلانے کے خیال سے پوچھا۔

وہ چند لمحے چُپ رہی۔ پھر بیڈ میں تکیے کے سہارا اٹھتے ہوئے بولی۔ "اچھی تو مجھے بیٹی لگتی ہے۔ لیکن —— مجھے بیٹا چاہیے۔"

اس کے انداز سے سسٹر نے چونک کر اسے دیکھا۔ غصہ اور درد مل جل کر اس کے چہرے کی ساخت بدل رہے تھے۔

وہ حیرانگی سے بولی۔ "تمہارے میاں کیا چاہتے ہیں۔"

"بیٹا۔"

"خدا کرے تمہارے بیٹا ہی ہو۔ میاں خوش ہو جائیں۔"

رما نے جلدی سے کہا۔ "یہ وقت گزر چکا ہے۔"

"کیا؟" سسٹر حیرانگی سے بولی۔

اور بڑے کٹھور لہجے میں رما نے کہا:

"مجھے طلاق ہو چکی ہے۔"

"کیا؟" سسٹر جینا کی آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں۔

"ہاں سسٹر۔ میں مطلقہ ہوں۔" وہ مصنوعی سکون سے بولی۔

سسٹر جینا شاید ابھی تک اس حقیقت کو ذہنی طور پر تسلیم نہ کر پائی تھی۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے سر کو نفی میں ہلائے گئی۔

رما بیڈ سے اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ وہ مضطرب و بے چین تھی۔ لیکن یہ اضطراب و بے چینی وہ اپنے اندر ہی اتار لینا چاہتی تھی۔

سسٹر جینا اٹھ کر اس کی پشت پر آ گئی۔ اس کے کندھے پر آہستگی سے ہاتھ رکھا۔ حیرانگی اور ہراس کے سائے اس کے چہرے پر اب تک لرزاں تھے۔

رما کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس اجنبی عورت کی ہمدردی پر اسے ہنسی آ گئی۔

یہ دنیا بھی عجیب ہے۔ ہمدردی اور محبت کی توقع ہوتی ہے۔ وہ آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ اور جن کی ہمدردی اور ہمت بے فائدہ ہوتی ہے وہ یوں ٹوٹ کر اظہار کرنے لگتے ہیں۔

رما نے منہ پھیر لیا۔ اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اس کے ہونٹوں سے ہنسی غائب ہو چکی تھی۔ اور بھربھری چٹانوں کی سی سختی ابھر آئی تھی۔ اس نے سسٹر کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "سسٹر جینا۔ مجھے اس بچے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن میں اسے پیدا کروں گی۔ دعا کرو کہ میں ایک لڑکے کو جنم دوں!"

وہ زور سے ہنسنے لگی۔ "لڑکا۔ بیٹا۔ لڑکا۔"

اس کی ہنسی میں وحشت کا رنگ تھا۔ سسٹر جینا نے اسے کندھے سے پکڑا اور آہستہ آہستہ بیڈ تک لے آئی۔ "تم آرام کرو۔ تمہیں سکون کی ضرورت ہے۔ بہت زیادہ سکون و آرام کی۔ تم نے بہت بڑے مرحلے سے گزرنا ہے۔"

"اس بڑے مرحلے سے میں گزر چکی ہوں۔ کچھ نہیں ہوگا۔ میں زندہ رہوں گی سسٹر اور ایک لڑکے کو جنم دوں گی۔"

"خدا بابرکت ہے۔ وہ تمہیں ضرور اپنی رحمت سے نوازے گا۔" سسٹر جینا نے سینے پر ہاتھ باندھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

رما بستر میں لیٹ گئی۔ اس کی ماں برابر والے کمرے میں بیٹھی کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ بیٹی کے ساتھ وہ بھی ہوسپٹل کی قیدی تھی۔ فرصت کے وقت ادھر اُدھر گھوم پھر کر لوگوں کا حال احوال پوچھتی پھرتی تھی۔ یوں بھی بیٹی دکھ کی سل کی طرح سینے پر رکھی تھی۔ اس کے قریب ہوتی تو دکھ کا احساس زیادہ ہی جاگنے لگتا۔

سسٹر جینا نے رما کی طرف دیکھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کمزور سی لڑکی پر اسے بڑا پیار آ رہا تھا۔ ہمدردی کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ کتنی بدقسمت تھی یہ لڑکی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ اسے طلاق کیوں ہوئی۔

لیکن رما کے چہرے پر دکھ اور مایوسی کی چھاپ دیکھ کر اسے کچھ پوچھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ وہ اس کی ماں سے بھی اس کی رام کہانی سن سکتی تھی۔ اس لیے وہ چپ چاپ کمرے سے نکل گئی۔

رما

آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ وقت کے پرت اٹھ رہے تھے۔ اور اس کی نگاہوں میں لپک جھپک ماضی کے کئی واقعات لہرا رہے تھے۔

وہ ایم۔اے فائنل میں تھی۔ امتحان ہو رہے تھے۔ وہ کیمسٹری کا پیپر دے کر یونیورسٹی سے لوٹی تو گھر میں کچھ گہما گہمی کا احساس ہوا۔ وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ جوتے اتار رہی تھی کہ اس کی چھوٹی بہن کرن بھاگی بھاگی آئی۔ آتے ہی اس کے قریب بیٹھ کر گلے میں باہیں ڈال دیں اور جھول جانے کے انداز میں بولی۔ "باجی پتہ ہے کون لوگ آئے ہیں؟"

وہ بہن کے خوش اور جذباتی رویے ہی سے سمجھ گئی کہ کون لوگ آئے ہیں۔ ہنس کر بولی۔ "وہی موٹی ناک والی بھدی سی عورت اور اس کی بانس ایسی لمبی بہو۔" کرن ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔ "ہاں باجی۔ وہی۔ وہی لیکن ان کا بیٹا بڑا اسمارٹ ہے۔"

"ہونہہ۔ ماں کی طرح ہوا نا۔ تو میری طرف سے انکار کر دینا۔" وہ ہنسی۔

"ہائے اللہ۔ باجی کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ اتنا اچھا رشتہ ہے۔"

"اچھا ہے یا برا۔ یہ کون جانتا ہے۔"

"کیوں؟"

"شکیلہ چچی نے کیا کہا تھا۔"

"کیا؟ اوہ ہاں۔ وہ تو ایسے ہی بے پر کی اڑاتے ہیں۔ جلتے ہیں باجی ہم سے' جلتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ آپ کا رشتہ اتنی اچھی جگہ ہو۔"

"یہ مفروضہ ہی ہے۔ ہو سکتا ہے شکیلہ باجی نے ٹھیک بات ہی کہی ہو۔"

"یعنی لڑکا بڑا اکھڑ اور ضدی مزاج کا ہے۔"

"ہاں۔ بڑا رعونت پسند!"

کرن ہنسنے لگی۔ "چھوڑیں باجی یہ باتیں۔ اتنا امیر ہے۔ اتنا سمارٹ اور یہ لوگ اتنے خواہشمند ہیں۔ امی کو تو امید ہی نہ تھی کہ دوبارہ یہ لوگ آئیں گے۔"

"آج خوش ہیں کہ وہ آگئے ہیں۔"

"خوشی کی بات تو ہے ہی۔ آج تو ہاں کروا کے ہی اٹھیں گے۔ تصویر لاؤں؟"

کرن نے جواب سنے بغیر جست بھری اور چند لمحوں بعد ایک تصویر اٹھا لائی۔

"یہ دیکھیں!"

رما نے تصویر دیکھی۔ وہ اچھی شکل و صورت کا بے حد سمارٹ آدمی تھا۔ رما نے شوخی سے منہ بنایا۔

"کیا خیال ہے۔" کرن کی ہنسی چھوٹ رہی تھی۔

"چلو تم کہتی ہو تو ٹھیک ہی ہے۔" رما نے جواب دیا۔ کرن نے قہقہہ لگایا اور وہ بھی مسکرانے لگی۔ اس کی مسکراتی نظروں میں پسند کی چمک تھی۔

پھر

ہر جوان لڑکی کی طرح اس کی آنکھوں میں بھی سپنوں کی دھند چھا گئی۔ اس دھند میں ایک ہی چہرہ نمایاں تھا۔ ایک ہی صورت روشن تھی۔

آنکھوں میں رنگین و حسین سپنے سجائے خوبصورت جذبات سے بھرا دل لیے وہ دلہن بنی اور بابل کی دہلیز چھوڑ کر عمران کے حجلۂ عروسی میں آگئی۔ اس وقت اس کے تعاقب میں ماضی تھا نہ سامنے سے ٹکرانے والا مستقبل۔ وہ صرف اور صرف حال میں جی رہی تھی۔ حال جو بڑا حسین' بڑا رنگین اور بڑا ہی معطر و مترنم تھا۔

ہر جوان لڑکی کی طرح اس نے اپنی ازدواجی زندگی خلوص' اعتماد اور محبت کے سہارے شروع کی تھی۔ اس کی دنیا پر صرف اور صرف عمران چھایا تھا—— وہ اس کی مسحور کن شخصیت کے سحر میں کھو گئی۔ محبتوں اور چاہتوں کی یلغار میں وہ جیسے اپنا آپ بھی بھول گئی۔ ان دنوں وہ کتنی خوش رہتی تھی۔ کتنی اتراتی تھی۔ اپنے آپ پر رشک آتا تھا۔

پھر انہی دنوں اسے احساس ہوا کہ اس کے وجود میں کچھ تبدیلی آرہی ہے۔ تخلیق کا مرحلہ شروع ہو گیا ہے اور وہ دنیا کی عظیم ترین تخلیق کار بننے لگی ہے۔ اس احساس و خیال سے ہی وہ شرما گئی۔ خوفزدہ بھی ہوئی لیکن یہ خوف مسرت بھرا تھا۔

اور

جب اس نے یہ حسین انکشاف عمران پر کیا تو اس نے اسے بانہوں میں بھر کر اس کے کان میں سرگوشی کی—— "مجھے خوبصورت سا بیٹا چاہیے۔"

"ہائے اللہ۔" وہ شرما کر سمٹ گئی۔ اس کی چھاتی میں منہ چھپا لیا۔ اپنے پیٹ میں اسے گدگدی سی محسوس ہونے لگی۔ ماں بننے کا پہلا احساس کتنا انوکھا اور حیران کن تھا۔

پہلے مہینے ہی وہ نڈھال ہو گئی۔ ہر وقت جی متلاتا رہتا۔ کوئی چیز ہضم نہ ہوتی۔ ابکائیاں آتیں اور کھایا پیا الٹ دیتی۔

وہ بے حد نڈھال ہو گئی۔ ہر وقت طبیعت خراب رہنے لگی۔ رنگ پھیکا پڑ گیا۔ سستی کی لہر اس کے وجود پر چھائی رہنے لگی۔ مزاج میں چڑچڑاپن آگیا۔ وہ اکثر سوچتی بچہ دنیا کی خوبصورت ترین شے ہے۔ اولاد خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ لیکن اس کی تخلیق کا مرحلہ اتنا بھیانک' اتنا تکلیف دہ ہے۔ کیوں؟ کبھی کبھی تو اپنے پیٹ میں پرورش پانے والے ننھے سے وجود پر اسے بے طرح غصہ آجاتا۔ جھلاہٹ ہونے لگتی۔

ایسے میں عمران اسے پیار کی انتہاؤں پر لے جاتا۔ تسلی دیتا' پیار کرتا اور مسکرا کر کہتا۔ "جب تمہاری گود میں پیارا سا بیٹا ہو گا تو تم سب کچھ بھول جاؤ گی۔ اپنے آپ پر ناز کرو گی۔ بیٹے کی ماں بن کر۔"

"بیٹا بیٹا—— بیٹا۔" وہ چڑچڑے پن سے چیخ کر بولی۔ "مجھے اپنی جان کی پڑی ہے اور آپ کو بیٹے کی۔"

وہ ہنس پڑا۔ پھر مستحکم آواز میں بولا۔ "مجھے بیٹا چاہیے رما۔"

"بیٹا ہو یا بیٹی مجھے اپنی پڑی ہے۔ آپ!"

"اوں ہوں۔ بیٹی نہیں۔ صرف بیٹا!"

وہ اس سے لڑ پڑی۔ ازدواجی زندگی کے تین مہینوں میں پہلی بار عمران سے الجھ پڑی۔ اتنی بری طرح بولی کہ عمران ششدر سا کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا۔

وہ دو تین دن اس سے روٹھا رہا۔ وہ بھی جھلائی ہوئی تھی اسے بالکل نہیں منایا بلکہ وہ تو چاہتی تھی کہ عمران اس کو منائے۔ معذرت کرے۔ اسے پیار سے کہہ دے "بیٹی ہو یا بیٹا کوئی پروا نہیں۔ مجھے تو تمہاری صحت و سلامتی کی ضرورت ہے۔"

لیکن

اس نے ایسا نہیں کہا۔ مجبوراً اسے ہی عمران کو منانا پڑا۔ خواہ مخواہ کی بدمزگی پیدا کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

اور

پھر اسے تو اپنی پڑی تھی۔ دن کا چین تھا نہ رات کا آرام۔ مضمحل طبیعت، ابکائیاں، جی متلانا اور کمزوری۔ اسے تو ہر وقت انہی سے نبرد آزما ہونا پڑتا تھا۔

وہ ڈاکٹر کے پاس جاتی اور پوچھتی —— "ایسا کیوں ہوتا ہے ڈاکٹر؟"

ڈاکٹر مسکرا کر کہتی۔ "تمہارے وجود سے ایک نیا وجود تخلیق ہو رہا ہے۔ کسی چیز کے بننے کے مرحلے میں کچھ دشواریاں بھی تو ہوتی ہیں۔ لیکن فکر نہ کرو۔ چند ماہ میں یہ تکلیفیں رفع ہو جائیں گی۔"

"کیا سب عورتوں کو ایسی ہی تکلیفیں ہوتی ہیں؟"

"ہاں تقریباً —— کسی کو کم کسی کو زیادہ۔ تم لگتا ہے کچھ زیادہ ہی حساس ہو —— کوئی بات نہیں۔ ابتدائی دن ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

لیکن

یہ ابتدائی دن اتنے طویل ہو گئے تھے۔ تیسرا مہینہ بھی ختم ہو رہا تھا اور طبیعت کی گراوٹ ایسی ہی تھی۔ وہ تو اپنے آپ سے بیزار ہو گئی تھی۔ عمران کی قربت بھی اب اسے اچھی نہ لگتی تھی۔

لیکن عمران اس کا شوہر تھا۔ اس کا مالک۔ طبیعت کی خرابی اپنی جگہ۔ بیوی تو تھی۔ عمران کی جائز ناجائز خواہش اسے پورا کرنا پڑتی تھی۔

وہ کر بھی رہی تھی

لیکن

جب وہ اسے اپنے بازوؤں میں دبوچ کر اپنی اس خواہش کا اظہار کرتا۔ "مجھے بیٹا دو گی نا۔ مجھے بیٹا چاہیے۔"

تو وہ اندر ہی اندر کھول جاتی۔ ایسے میں عمران انسان نہیں وحشی جانور لگتا۔ جسے صرف اور صرف اپنی ذات کی خبر تھی۔ اپنے جذبات کا خیال تھا۔ اپنی خواہش کا احترام تھا۔

الجھاؤ اور کھولن اندر ہی اندر آگ بن رہے تھے۔ بہہ رہے تھے۔ وہ گرد و پیش سے متنفر سی ہوتی جا رہی تھی۔

لیکن عمران کب خاطر میں لاتا تھا۔ اس نے بھی ہمدردی کا اظہار نہ کیا تھا۔ جب اس کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہوتی اور وہ رو رو کر دل کا غبار نکالتی۔ تو عمران غصے سے بھر جاتا۔ "کیا نحوست پھیلا رہی ہو۔ تم اکیلی تو نہیں۔ نہ ہی تم دنیا کی پہلی اور آخری عورت ہو جو بچہ پیدا کرنے کا انوکھا اور اچھوتا فرض انجام دے رہی ہے۔ کچھ ہمت بھی کرنا چاہیے۔ آخر ہمیں بھی تو ہماری ماؤں نے جنا ہے —— اپنے آپ کو اتنا نازک اندام بھی مت سمجھو۔ اچھی بھلی لڑکی ہو۔ حوصلہ نہیں رکھ سکتیں۔"

وہ اور زور سے رونے لگتی۔ اسے تو ہمدردی کے دو بولوں کی ضرورت تھی۔

لیکن جوں جوں وقت گزر رہا تھا ہمدردی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ قصوروار وہ تھی یا عمران؟ وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ اتنا جانتی تھی کہ عمران بیٹے کی خواہش میں مرا جا رہا ہے۔ اسے میری نہیں آنے والے بیٹے کی ضرورت ہے۔

لیکن ضروری تھوڑا ہی تھا جو بیٹا ہو۔ یہی سوچ سوچ کر وہ بے حد چڑچڑی ہو رہی تھی۔

اور

اسی بات پر آئے دن تکرار ہونے لگی۔

اس دن بھی وہ عمران کے پہلو میں اپنے ڈبل بیڈ پر لیٹی تھی۔ طبیعت بے حد خراب تھی۔ دو تین دن سے اس نے کھانا بھی ٹھیک طرح سے نہیں کھایا تھا۔ لکوئیڈ چیزوں پر ہی گزارہ کر رہی تھی۔ کسی وقت ایک آدھ نوالہ کھا لیتی تھی۔ ذات کا دکھ گمبھیر تھا۔ وہ اسے جھیلنے پر مجبور تھی۔

"رما۔" عمران نے اپنا بازو اس کی گردن تلے کرتے ہوئے کروٹ لے کر

اسے لپٹا لیا۔

"ہوں!"

"ہم اپنے بیٹے کا نام کیا رکھیں گے؟"

وہ غصے سے تلملا گئی لیکن ضبط کرتے ہوئے بولی۔ "عمران — بیٹا بیٹا ہی کرتے رہتے ہو۔ کبھی بیٹی کا نام بھی لے لیا کرو۔"

"نہیں — " وہ بڑی رعونت سے اس کا سر جھٹک کر اپنا بازو نکالتے ہوئے بولا:

"بیٹی نہیں چاہیے مجھے!"

وہ ششدر سی اسے تکنے لگی۔ غصہ اسے بھی آ گیا۔ لیکن تحمل سے بولی۔ "خدا کے کاموں میں کوئی دخل دے سکتا ہے۔"

"میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ کان کھول کر سن لو کہ مجھے بیٹا چاہیے۔"

وہ کانپنے لگی۔ حیران ہو کر عمران کو دیکھا۔ پھر بستر میں اٹھ بیٹھی۔

"عمران کبھی تو ریزن ایبل ہوا کریں۔"

"بکواس بند کرو۔" وہ دھاڑا۔

رما کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں وہ بستر سے نیچے اتر آئی۔ سخت مضطرب و بے چین تھی۔ کمرے میں ٹہلنے لگی۔

عمران کروٹ بدل کر تکیہ میں منہ دے کر سو گیا۔

وہ رات جیسے اس نے انگاروں پر کاٹی۔ عمران کا مطالبہ کس قدر احمقانہ تھا۔ کیا وہ انسان نہیں تھا۔ کیا اسے خدا کی دین پر یقین نہیں تھا۔ وہ اپنی ضد بزور منوانا چاہتا تھا۔ اگر

ایسا نہ ہو سکا — تو — تو — وہ سوچ سوچ کر پاگل سی ہو گئی۔

پھر یہی تکرار آئے دن ہونے لگی۔ جب بھی بات ہوئی عمران کہتا۔ "کان کھول کر سن لو میں بیٹا چاہتا ہوں۔"

وہ سہم جاتی۔ چھپ چھپ کر روتی۔ کبھی غصے میں آ کر دو چار سنا بھی دیتی۔

اک ایسے ہی دن عمران نے کہا۔ "میں تمہاری تکرار سے تنگ آ چکا ہوں۔"

"تو پھر چپ چاپ دیکھتے رہو۔ جو نعمت بھی خدا نے دے دی قبول کر لینا۔"

"تمہارے منہ سے ہمیشہ یہی بات نکلتی ہے۔ تم نہیں چاہتیں کہ میری خواہش

پوری ہو۔ تم میری ضد بنتی جا رہی ہو۔"

"اس کے ذمہ دار تم ہو۔"

عمران بھڑک اٹھا۔ گرج کر بولا۔ "میں کچھ نہیں سنوں گا۔ تمہیں بیٹا پیدا کرنا ہو گا۔"

رما کی آنکھوں میں شعلے سے ناچے۔ اس کا سارا وجود لرز گیا۔ غصے سے کپکپاتی آواز میں بولی۔ "تم انسان نہیں حیوان ہو جنگلی جانور وحشی۔"

اور

وحشی اس پر پل پڑا۔ ایک دو تین تھپڑ اس نے رما کے منہ پر جڑ دیئے۔ رما بھی غصے سے باؤلی ہو رہی تھی۔ اس نے عمران کی کلائی پر اپنے دانت گاڑ دیئے۔ وہ درد سے بلبلا اٹھا۔

گھریلو فضا میں اتنا تناؤ آ گیا تھا کہ ہلکے سے جھٹکے سے ہر چیز تہس نہس ہو سکتی تھی۔ رما روتے دھوتے سوچتی رہتی تھی کہ کیا کرے۔ ایک طبیعت کی بیزاری اس پر عمران کا یہ رویہ۔ کبھی کبھی تو جی چاہتا گھر بار چھوڑ کر بھاگ جائے۔ کسی کنوئیں میں چھلانگ لگا دے۔ سلیپنگ پلز کی پوری شیشی حلق میں انڈیل لے۔

عمران کی تو شکل سے اسے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ اسے مشفق، پرخلوص اور ٹوٹ کر پیار کرنے والے شوہر کی بجائے اب شیطان کا کوئی روپ لگتا تھا۔ احمق، جاہل اور اکھڑ آدمی کے ساتھ ایک ایک لمحہ جیسے وہ سولی پر لٹک کر گزار رہی تھی۔

گھر میں اور کوئی تھا نہیں جو دونوں میں سے کسی کو سمجھاتا۔ چپ رہنے کی تلقین کرتا۔ بوڑھے خانساماں نے دو ایک بار صاحب جی کو سمجھانے کی کوشش کی تو عمران اس پر برس پڑا۔ ضد میں تو وہ بھی جیسے نفسیاتی مریض بنتا جا رہا تھا۔ بوڑھا خانساماں رما کی منتیں کرنے لگا۔ میری بچی فکر مند نہ ہو۔ صاحب ضد میں آ جاتے ہیں تو آگے پیچھے کچھ نہیں دیکھتے۔ اللہ کی رضا جو ہو گی وہی ہو گا۔ آپ ہی کہہ دیا کریں کہ بیٹا ہو گا۔

"بابا۔ میں کیسے کہہ دیا کروں۔" وہ جز بز ہو کر چیخی۔

"صاحب کی تسلی کے لیے۔"

"میں غلط بات سے اس کی تسلی نہیں کروں گی۔"

"معاملہ اور بگڑ جائے گا۔"

"بگڑ جائے۔"

"گھر بنتے دیر لگتی ہے بیٹا۔ اجڑتے دیر نہیں لگتی۔"

"یہ بات صاحب کو سمجھاؤ۔"

خانساماں تھک ہار کر چپ ہو جاتا۔ دونوں میں ٹھنی تھی۔ وہ بے چارہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

رما بیشک حق بجانب تھی۔ اس کے اختیار سے جو چیز باہر تھی' عمران اسی پر ضد کر رہا تھا لیکن چیخ چیخ سے کوئی فائدہ بھی تو نہیں تھا۔

خانساماں بھی جانتا تھا کہ عمران ناحق رما کو تنگ کر رہا ہے۔ لیکن اس کا بھی یہ خیال تھا کہ اگر رما خاموش ہو جائے یا اس کی تسلی کے لیے یہی کہہ دے کہ بیٹا ہو گا تو حالات سُدھر سکتے ہیں۔ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ اگر بیٹی ہو بھی گئی پھر عمران کچھ نہیں کر سکے گا۔ مجبوراً اُسے قبول کرنا پڑے گا۔ کم از کم بچے کی آمد تک تو چیخ چیخ بند ہونا چاہیے تھی۔

لیکن

حالات کسی اور رُخ ہی موڑ کھا رہے تھے۔ روز ہی بک بک ہونے لگی تھی۔

اس روز عمران اور رما میز کے گرد بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ دونوں 'یوں لگ رہا تھا جیسے اجنبی ہوں۔ ایک دوسرے کی صورت سے بھی بیزار نظر آ رہے تھے۔ اور گھونٹ گھونٹ چائے حلق تلے اتار رہے تھے۔ جیسے کوئی کڑوی کسیلی چیز پی رہے ہوں۔ چائے کے ساتھ مٹھائی کی پلیٹ بھی رکھی تھی۔

"یہ مٹھائی میر صاحب کے ہاں سے آئی ہے؟" عمران نے پوچھا

"شاید۔" وہ روکھائی سے بولی۔

"ان کی بیٹی کے بیٹا ہوا ہے۔"

"ہوا ہو گا۔"

"تم بیٹے کے نام سے چڑتی کیوں ہو؟"

"اس لیے کہ میں جانتی ہوں ہمارا بیٹا نہیں ہو گا۔"

"رما۔" عمران نے چائے کی پیالی پرچ پر دے ماری۔ پیالی ٹوٹ گئی اور گرم چائے کے چھینٹے رما پر پڑے۔

وہ تلملا اٹھی۔ وہ غصے سے لال پیلا ہو کر اسے کھا جانے والی نظروں سے تکنے لگا۔ جواباً اس نے بھی لال پیلے ہو کر عمران کو دیکھا۔

"بیٹا نہ ہوا۔ تو— تو۔" عمران غصے سے کانپتا ہوا بولا۔

"تو کیا ہو گا؟" رما نے میز کو ٹھوکر ماری۔ چائے دانی گرتے گرتے بچی۔

"بتا دوں گا کیا ہو گا۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔

"ابھی بتا دو۔" وہ غرائی۔

"میں تمہیں برداشت نہیں کروں گا۔"

"کیا؟"

"ہاں!"

"پھر کہنا ذرا۔"

"کہہ دیا۔"

"یعنی مجھے گھر سے نکال دو گے!"

"ہاں۔ یہی ہو گا۔ بیٹی ہوئی تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔"

رما نے میز کو پوری قوت سے دھکا دیا۔ برآمدے کے فرش پر برتن چھنا کے سے گر کر ٹوٹ گئے۔

وہ چیخ کر بولی۔ "ٹھیک ہے مجھے ابھی طلاق دے دو۔ میں تمہارے پاس ایک لمحہ نہیں رہ سکتی۔ نہیں رہوں گی۔"

وہ غرّایا "یہ عمل بچہ ہونے کے بعد ہو گا۔ تمہیں بیٹا پیدا کرنا ہے۔"

"بیٹا ہو یا بیٹی— اب میں تمہارے پاس نہیں رہوں گی۔ بعد میں جو کچھ کرنا ہے۔ ابھی کر لو۔ میں تم جیسے ذلیل جانور کے ساتھ ایک منٹ نہیں رہ سکتی۔"

شعلہ بداماں عمران چیخا۔ "ذلیل عورت۔ جا میں تجھے طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔ طلاق— دے۔ تا ہوں۔"

گھر بنتے دیر لگی تھی۔

گھر

اجڑتے دیر نہ لگی۔

رما لُٹ پٹ کر ماں کے گھر آ گئی۔

قصوروار کون تھا۔ فیصلہ یہ نہیں کرنا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ رما کو طلاق مل گئی اور اس طلاق پر ملال نہ ہوا۔ بلکہ وہ غصے سے پیچ و تاب کھاتی رہی۔ وہ تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔

ذہن صیقل تھا۔ عمران جیسے ضدی اور اکھڑ انسان کے ساتھ گزارہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی احمقانہ باتوں پر وہ جاہلوں کی طرح سر نہ جھکا سکتی تھی۔

وقت گزرتا ہی چلا جاتا ہے۔ یہ بھی غنیمت ہی ہے۔ تکلیفوں اور مصیبتوں سے نبرد آزما بھی شاید اسی لیے ہوا جا سکتا ہے کہ وقت کے گزر جانے کا احساس شعور و لاشعور میں موجود ہوتا ہے۔

رما وقت گزار رہی تھی۔ پیٹ میں اک ننھا وجود پل رہا تھا۔ اس وجود سے اسے کبھی کبھی شدید سی نفرت محسوس ہوتی۔ اس کا جی چاہتا اپنے غبارے ایسے پیٹ کو اس طرح مسل دے‘ اس طرح کوٹے پیٹے کہ اس ننھے سے وجود کے ریزے ریزے ہو جائیں۔ یہ وجود ہی اس کی تباہی کا باعث بنا تھا۔

لیکن

اس نے ایسا کیا کبھی نہیں۔ اپنے وجود کی تقسیم و تفریق تھی۔ اسی میں سے کچھ گھٹ کر اسی میں جمع ہو رہا تھا۔ اپنا خون‘ اپنا گوشت پوست۔

ڈاکٹر کے کہنے پر وہ ہوسپٹل میں ایڈمٹ ہو گئی تھی۔ وہ بے حد کمزور تھی۔ ڈلیوری کا مرحلہ کٹھن تھا۔ ڈاکٹر ٹانک دوائیوں اور خوراک سے اسے اس قابل بنانا چاہتی تھی کہ اس کٹھن مرحلے سے وہ بخیر و خوبی گزر جائے اور ننھی سی جان جو اس کے پیٹ میں پل رہی تھی عدم سے وجود میں آئے تو زندگی کا بار سنبھالنے کے قابل ہو۔ اس کا بچہ بھی تو بہت کمزور تھا۔ ڈاکٹر کے لیے یہ بات تشویشناک تھی۔

اب وہ لیبر روم میں تھی۔ درد کی لہریں تیز ہو رہی تھیں۔ وجود کو کوئی اندر ہی اندر کند چھری سے کاٹ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا پھیل جاتا۔ اسے یوں لگتا لیبر روم کی دیواریں سمٹ رہی ہیں اور چھت نیچے ہوئی جا رہی ہے۔ اور بڑے بڑے دودھیا شیشوں والی کھڑکیوں کے پار سے آنے والی روشنی اندھی ہو گئی ہے۔

باہر

طویل ٹھنڈے برآمدے میں اس کی ماں ماہئ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی اور اس کی شوخ اور چنچل بہن ستون کے سہارے چپ چاپ کھڑی تھی۔ نرسیں بار بار اندر آ جا رہی تھیں۔ دوسرے کمروں اور نرسری میں آنے جانے والے لوگ تھوڑی دیر کو ان کے پاس رک جاتے۔

”کیا ہوا؟“ وہ پوچھتے۔

”ابھی کچھ نہیں۔“ ماں مضمحل انداز میں کہتی۔

”خدا اپنا رحم کرے۔“ لوگ دعا کرتے۔

رما نے موت سے ٹکرا ٹکرا کر بچے کو جنم دیا۔

بیٹے کو جنم دیا۔

وہ لڑکا عدم سے وجود میں لائی

بیٹا

لڑکا

جس کے لیے اس کا گھر اجڑا تھا۔ وہ برباد ہوئی تھی۔

ڈاکٹر نے خوشخبری سنائی تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں لیکن جلد ہی وہ آنکھیں صاف کر کے ڈاکٹر سے بولی۔ ”میں بیٹا ہی چاہتی تھی ڈاکٹر۔ بیٹا۔ لڑکا۔ لڑکا۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔

اور

پھر ہنستی چلی گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ بے اختیارانہ ہنسے جا رہی تھی۔

ڈاکٹر نے انتہائی کمزور اور ناتواں بچے کو کپڑے میں لپیٹ کر سسٹر جینا کے حوالے کیا۔ بچے کو نرسری میں لے جا کر آکسیجن ٹینٹ میں رکھنے کی تاکید کی۔ چائلڈ سپیشلسٹ کو فوری طور پر فون کرنے کا بھی کہا۔

اور

خود رما کی طرف متوجہ ہو گئی۔

دو دن رما کی حالت مخدوش رہی۔

تیسرے دن اس نے بچہ دیکھنے کی خواہش انتہائی خنک طریق سے ظاہر کی۔ ماں نے سسٹر اور سسٹر نے ماں کی طرف دیکھا۔

”کیا کریں؟“ سسٹر ہولے سے بولی۔

”ایک نظر دکھا دو۔“ ماں نے کہا۔

”ڈاکٹر سے پوچھ لوں۔“ اس نے سرگوشی کی۔

"ہاں۔"

سسٹر جینا چلی گئی۔ چند لمحوں بعد وہ کپڑے میں لپٹے بچے کو لے آئی۔ ماں نے اپنے آنسو چھپانے کے لیے منہ موڑ لیا۔

رما نے بے اختیارانہ بے تابی سے بچہ نرس کے ہاتھوں سے لے لیا۔ سسٹر منہ لٹکائے بیڈ سے قدرے پرے ہٹ گئی۔

وہ رما کی تسلی کے لیے کچھ کہنا ہی چاہتی تھی

کہ

کمرے کا دروازہ کھلا

اور رما بچے کو پوری طرح دیکھنے اور برف کی طرح ٹھنڈے ننھے منے وجود کو محسوس کر کے جان بھی نہ پائی تھی کہ حقیقت کیا ہے کہ دروازے میں عمران کھڑا نظر آیا۔

وہ کھلی آنکھوں سے اسے تکنے لگی۔

"تم—— تم" اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔ آنکھیں بند کر لیں اور بچے کو سینے سے لگا لیا۔

عمران ندامت سے سر جھکائے تھا' آہستگی سے بولا۔ "میں اپنا بیٹا" اور اچانک ہی رما پر اک کھلی حقیقت منکشف ہو گئی۔ اس نے جلدی سے بچے کو دیکھا۔ برف کا ٹکڑا نیلا پیلا ہو رہا تھا۔

پیشتر اس کے کہ ایک لمبی چیخ اس کے منہ سے نکلتی۔ عمران تیزی سے آگے بڑھا—— "میں اپنا بیٹا دیکھوں گا۔ مجھے آج ہی خبر ملی ہے۔ مجھے اسے دیکھنے کا حق ہے۔"

رما نے ایک بار پھر بچے کو دیکھا۔

پھر اسے جانے کیا ہوا۔ دانت پیستے ہوئے شعلہ بار نظروں سے عمران کو دیکھا اور بچے کو یوں اچھال کر اس کی طرف پھینکا۔ جیسے بچہ نہیں پلاسٹک کا گڈا ہو۔ "لے لو—— بیٹا لے لو—— لڑکا لے لو—— لے لو—— لے جاؤ۔" وہ زور زور سے چیخنے لگی۔

عمران نے ہراساں ہو کر ننھے منے ٹھنڈے وجود کو دیکھا۔ گھبرا کر دیکھا نظروں سے ٹٹولا۔ ہاتھوں سے چھوا—— رما نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

اور—— پھر قہقہہ پر قہقہہ لگائے گئی۔

عمران کے ہاتھوں میں مردہ بچہ تھا—— بیٹا!—— لڑکا!

◆◆◆◆◆◆◆

خدا کی لاٹھی

تقدیر کی طرح بل کھاتی ڈنڈی پر وہ بڑے سہل طریق سے اُوپر چڑھتی چلی آرہی تھی۔ اس کے سر پر گاگر تھی جس سے دودھ بڑی ملائمت سے کبھی کبھی چھلک جاتا تھا۔ اس کے قطرے پیتل کی گاگر پر سے پھسل پھسل پڑتے۔ اس نے سرخ چھینٹ کی شلوار پر ملگجا سا سبز کرتہ پہن رکھا تھا۔ دوپٹہ کبھی سفید ہو گا لیکن بوسیدہ ہونے کی وجہ سے رنگدار لگ رہا تھا۔ پھٹے پرانے کپڑے شاید مہینوں سے دھلے بھی نہ تھے۔ پاؤں سے ننگی تھی۔ اس کی ایڑیوں اور پاؤں کی انگلیوں پر میل کی تہ پکی ہو چکی تھی۔ اس کے جسم کی اٹھان بتاتی تھی کہ وہ جوان ہے۔ پہاڑی پتھریلے علاقے کی بلندیوں اور پستیوں میں ڈوبنے اُبھرنے سے جسم کی ساخت بے حد متوازن تھی۔ اس کا چہرہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ شاید خوبصورت ہو لیکن محنت' غربت اور نامساعد حالات کی گہری چھاپ نے خوبصورتی کو پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا۔

موسم بے حد خوشگوار تھا۔ سرمئی پہاڑوں پر سبزے اور رنگارنگ پھولوں کی فراوانی تھی۔ جگہ جگہ چشمے اُبلتے تھے۔ ان کا شفاف پانی قلقل کرتا پتھروں پر بہتا۔ پتلی پتلی لکیروں کی صورت پستیوں کا رُخ کیے آلودہ ہونے کو بے کل دبے قرار لگ رہا تھا۔

تاشی سبزے سے گھری پہاڑی کے سینے پر بنے خوبصورت ریسٹ ہاؤس کے بیرونی برآمدے میں کھڑا قدرتی نظاروں سے محظوظ ہو رہا تھا۔ دُور—— بہت دُور گھاٹی میں بادل جمع ہو رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کوئی بڑا سا پیالہ سفید اور سرمئی غبار سے بھرا جا رہا

ہے۔ یہ احساس اس کے من میں خوشی کے ولولے پیدا کر رہا تھا کہ یہاں وہ ان بادلوں سے جو شہری زندگی کو نیچا دکھانے کو سروں پر تنے رہتے ہیں۔ اونچے ہی اونچے اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں اس سے نیچے تھے۔

بہت نیچے

اُبھرتے سورج کی نارنجی کرنیں قدم چوم رہی تھیں۔ چمکیلی صبح تازہ دم تھی اور مست خرام ہوائیں خوشبوؤں سے لدی تھیں۔

وہ چوبی جنگلے پر بازو لٹکائے قدرے جھکا۔ دُور تک پھیلے پہاڑی سلسلوں اور ان کی آغوش میں لاڈلے اکلوتے بچوں کی طرح دبے 'ڈھلانی چھتوں والے مکانوں کو دیکھ رہا تھا۔

کبھی اس کی نگاہیں نیچے گھاٹی میں دھواں دھواں بادلوں پر پڑتیں۔ کبھی دور پہاڑ کے سینے میں دراڑیں ڈالتی تیز رو ندی پر پڑتیں۔ اور کبھی جھک کر پہاڑوں کی چوٹیوں کے منہ چوم لینے والے مہربان آسمان کو وہ تکنے لگتا۔

وہ کل ہی یہاں آیا تھا۔ یہاں اسے سرکاری کام کے لیے تقریباً دس ماہ قیام کرنا تھا۔ یہاں آتے وقت وہ کچھ زیادہ خوش نہیں تھا۔ اس کی زندگی بڑی رنگین تھی۔ دفتری کاموں کے بعد کلب' ہوٹل' ریسٹورنٹ اور نئے نئے چہرے' نئے نئے دوست' اس کے حسین ترین مشاغل تھے۔

اس کی نظر پگڈنڈی پر پڑی۔ گاگر اٹھائے وہ اتنی آسانی سے چڑھائی چڑھتی آ رہی تھی۔ وہ حیرانگی سے اسے تکنے لگا۔ کل یہاں تک آتے آتے اس کا سانس پھول گیا تھا۔ راستے میں کئی جگہ دم لینے کو اسے رکنا پڑا تھا۔

لیکن

وہ دیکھتے ہی دیکھتے ریسٹ ہاؤس کی طرف مڑنے والی سڑک پر آ گئی۔ وہ جنگلے کو پکڑ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس حسین اور مہکتے ویرانے میں اس لڑکی کا وجود رنگ و بو میں اضافہ تھا۔۔۔ وہ شوق و تجسس سے اسے دیکھنے لگا۔

اور

وہ

تاشی رنگین مزاج نوجوان تھا۔ کئی لڑکیوں سے بیک وقت دوستی اور رومانس چلانے کا عادی تھا۔ لیکن مزاج میں تلون تھا۔ تیز رو راہی تھا۔ کسی مقام پر چند لمحے رکتا تھا

اور پھر بھاگ دوڑ شروع ہو جاتی تھی۔ اس کی جوانی منہ زور اور بے لگام سی ہوئی جا رہی تھی۔ ماں اور بہنیں متفکر تھیں۔ اسے جلد از جلد ازدواجی بندھن میں جکڑ دینا چاہتی تھیں۔ اسے ایک مرکز پر لانا چاہتی تھیں۔ ایک کھونٹے پر باندھ دینا چاہتی تھیں۔

لیکن

وہ ابھی قابو میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ ہنس کر ٹال دیتا۔ ماں کی تسلی کے لیے ہمیشہ کہتا۔ "کچھ بن تو لینے دو ماں۔ شادی ضرور کروں گا لیکن اپنا آپ تو بنا لوں۔ ابھی ابھی تو نوکری شروع کی ہے۔ کچھ بن لینے دو۔ بن لینے دو۔

ماں کی دانست میں وہ سب کچھ بن چکا تھا۔ یہی کہتی۔ "کیا بنانا ہے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ گھر ہے' گاڑی ہے' اچھی نوکری ہے اور کیا چاہیے تجھے؟"

وہ مسکرا کر کہتا۔ "تلاش جاری رکھیں۔ جب مجھے پسند کا رشتہ نظر آیا نا تو فوراً شادی کر لوں گا۔"

پسند کا ماں اور بہن دونوں کو ہی علم تھا۔ حسین اور دولت مند لڑکی اس کی پسند تھی۔

یہ بھی اک بہانہ ہی تھا۔ فی الحال وہ آزاد پنچھی کی طرح ڈالی ڈالی اڑنے پھرنے کا متمنی تھا۔ جوان تھا۔ سمارٹ تھا۔ لڑکیوں کو دام میں لانے کا گُر جانتا تھا۔ بیک وقت کئی کئی محبتیں کرنے کا فن بھی جانتا تھا۔

لڑکی اب ریسٹ ہاؤس کے قریب آ گئی تھی۔

وہ ہمہ شوق اسے تک رہا تھا۔

وہ میلے کچیلے کپڑے پہنے' پاؤں سے ننگی' سر پر گاگر اٹھائے چلی آ رہی تھی۔

تاشی کو یہ لڑکی بہت اچھی لگی۔ بنی سنوری لپی پتی لڑکیوں کے برعکس یہ لڑکی اسے من میں اترتی محسوس ہوئی۔

لڑکی ریسٹ ہاؤس کے پہلے گھماؤ پر چڑھ گئی۔

تاشی جنگلے سے کودا اور اونچے نیچے پتھروں پر سے پھلانگتا اس گھماؤ پر آ گیا۔

"اے لڑکی!" اس نے آواز دی

لڑکی کے قدم رک گئے۔ تاشی کو یوں لگا جیسے زمین کی گردش رک گئی ہے۔

لڑکی نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں سپاٹ تھیں۔

تاشی نے دیکھا معمولی خدوخال کی لڑکی تھی۔ پہلی نظر میں تو اسے وہ بدصورت سی لگی۔ لیکن پھر اسے اچھی لگی۔

لڑکی اسے دیکھ کر ڈری نہ سہمی۔

"کیوں بابو؟" اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا

تاشی کو اس کی آواز میں نغمگی سی محسوس ہوئی۔

"کون ہو تم؟"

"دیکھ نہیں سکتے؟"

تاشی اس کے جواب سے محظوظ ہوا۔ مسکراتے ہوئے بولا۔ "دیکھ تو رہا ہوں۔ پوچھنا یہ تھا کہ تم ادھر——"

"اس ڈاک بنگلے میں ہم دودھ دیتے ہیں۔"

"اوہ۔ اچھا۔"

"آج میری ماں کو بخار ہے۔ دُودھ میں لائی ہوں۔"

"اچھا۔"

"ہاں!"

وہ آگے بڑھی تو تاشی بولا۔ "اے سنو!"

"ہاں۔" وہ پھر مڑی اور اکھڑ لہجے میں بولی۔ "کیا ہے؟"

"روز دُودھ لاتی ہو؟"

"ہاں بابو۔ یہاں اور وہاں دیتی ہوں۔" اس نے اوپر کی کوٹھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"اچھا اچھا۔ جبھی—— میں حیران تھا کہ ڈاک بنگلے میں اتنا دُودھ کس لیے۔"

وہ ہنس پڑی۔ "اُوپر ان کوٹھیوں میں بھی دیتی ہوں۔"

"دودھ تمہاری ماں لاتی ہے؟"

"ہاں۔ کبھی میں۔ کبھی ماں۔" پھر بولی۔ "لگتا ہے تم یہاں آج ہی آئے ہو۔"

وہ تیزی سے قدم اٹھاتی پچھلی طرف چلی گئی۔ تاشی آہستہ آہستہ چلتا واپس آگیا۔

انسان ہمیشہ سے تنوع پسند رہا ہے۔ یہ تنوع پسندی ہی اسے غاروں سے اٹھا کر جدید دنیا تک لائی ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں آدمی ہمیشہ مارا مارا پھرا ہے۔

تاشی میں یہ فطری جذبہ کچھ زیادہ ہی تھا۔ نیاپن اس کی کمزوری تھی۔ ماڈرن نئی تہذیب کی دلدادہ لڑکیاں اس کے لیے عام سی شے بن چکی تھیں۔ یہ لڑکی انوکھی اور نایاب سی لگی۔

وہ اسی کے متعلق سوچنے لگا

اور

دوسری صبح وہ جلد بیدار ہوگیا۔ تیار ہو کر جنگلے کے قریب آکر پگڈنڈی پر نظریں جمادیں۔

انتظار کی کیفیت بھی عجب تھی۔ کتنا لطف آرہا تھا اسے۔ جھنجھلاہٹ بھی ہو رہی تھی۔ اور کوفت بھی۔ لیکن پھر بھی یہ سب طرب انگیز تھا۔

وہ اپنے وقت پر پگڈنڈی پر نظر آئی۔

اس نے وہی میلے کچیلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ گاگر سے آج بھی دودھ چھلک رہا تھا۔ سفید سفید قطرے پیتل کی گاگر پر جمے جا رہے تھے۔

وہ ریسٹ ہاؤس کے گھماؤ پر آئی تو تاشی نے آگے جھک کر کہا۔

"اے۔"

لڑکی کے قدم رک گئے۔ اس نے تاشی کی طرف دیکھا۔

"کیوں؟"

"دُودھ لائی ہو؟"

"دیکھ نہیں رہے۔"

"دیکھ رہا ہوں۔"

"تو پھر؟"

"یونہی۔ ذرا تم سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔"

"کیوں؟"

تاشی مسکراتے ہوئے جنگلا پھلانگ کر باہر آگیا۔ مسکراتے ہوئے لڑکی کی طرف دیکھا اور بولا۔ "میں پرسوں سے یہاں آیا ہوں۔ کوئی بندہ بشر نظر ہی نہیں آرہا۔"

"کیوں بابا کہاں گیا؟"

"کونسا بابا؟"

"ڈاک بنگلے والا۔"

"اوہ —— وہ بوڑھا آدمی ہر وقت کچن ہی میں گھسا رہتا ہے۔"

"اس کی عورت بھی تو ہے۔"

"ہاں بوڑھی سی۔"

"تو میں کیا کروں؟"

"میرے ساتھ باتیں کرو۔ آخر ہم انسان ہیں۔ ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں کوئی حرج ہے؟"

لڑکی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ پھر ان میں اک غیر محسوس سی چمک ابھری۔ اس کے بے رنگ ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

یہ دوستی کا پیغام تھا۔

تاشی بولا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

اس نے گاگر سر سے اتار کر پتھر کے قریب رکھ دی۔ اور چہرے کو دوپٹے کے پلّو سے صاف کرتے ہوئے سادگی سے بولی "کیوں بتاؤں؟"

تاشی کا دل مچل گیا۔ بولا "حرج کیا ہے؟"

"نہ بابا۔ ماں نے منع کیا ہوا ہے۔"

"کیا؟"

"کسی کے ساتھ باتیں کرنے اور اپنا نام بتانے سے۔"

"تو پھر باتیں کیوں کر رہی ہو مجھ سے؟"

وہ ڈر گئی جلدی سے گاگر اٹھائی اور بڑے بڑے قدم اٹھاتی آگے بڑھ گئی۔

یہ ڈری سہمی ہرنی سی لڑکی تاشی کو اپنی دسترس سے باہر محسوس نہ ہوئی۔

وہ خاصا گھاگ تھا۔ شیشے میں پری اتارنے کے فن میں ماہر تھا۔ نیلی اسے بھا گئی تھی۔ یوں بھی اسے مہکتے ویرانے میں کسی وجود کی قربت ضروری تھی۔ وقت گزاری کے لیے چند گھنٹوں کی ڈیوٹی کافی تو نہ تھی۔

نیلی کو اس نے دو دنوں ہی میں رام کر لیا۔ بھولی بھالی لڑکی جو ماں کی تربیت سے بھی کسی سانچے میں ڈھل نہ سکی تھی' خام مال ہی کی طرح تھی۔ تاشی کی محبت کا دم بھرنے لگی۔

"نیلی!" اس شام وہ ریسٹ ہاؤس کے جنگلے پر جھکا کھڑا تھا۔ نیلی پتھر پر بیٹھی خودرو گھاس اکھیڑ اکھیڑ پھینک رہی تھی۔

"ہاں۔"

"اندر آجاؤ!"

"نہ۔"

"کوئی نہیں ہے۔"

"اسی لیے تو نہیں آتی۔"

"مجھ پر اعتبار نہیں؟"

"ہے۔"

"پھر آجاؤ۔"

"نہ —— نہ۔"

"جاؤ میں تم سے نہیں بولتا۔"

"بابو۔"

وہ جنگلے سے ہٹ گیا۔ نیلی بے تاب ہو گئی۔

"آتی ہوں بابو۔"

وہ تیزی سے جنگلے کا چوبی تختہ ہٹا کر اندر آگئی۔

تاشی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "بہت اچھی ہو تم۔"

"بابو مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"مجھ سے؟"

"پتہ نہیں کس سے۔"

"کھا نہیں جاؤں گا تمہیں۔ میں تمہارا ہوں نیلی۔ تم میری ہو۔"

"کیا —— کیا بابو؟"

"یقین کرو۔ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔"

"سچ!"

"نہیں تو کیا جھوٹ۔"

"تم۔ تم۔ تم مجھے بہت اچھے لگنے لگے ہو بابو۔ اسی لیے تو ماں سے بہانہ کر کے

آ جاتی ہوں!"

"روز آیا کرو گی نا؟"

"ہاں۔"

تاشی اسے سامنے بٹھائے تکتا رہا اور وہ نا سمجھ سی لڑکی اپنے من میں اپنے آپ پر اترانے لگی۔

پھر وہ روز ہی آنے لگی۔ اب وہ اپنے میلے کچیلے کپڑے دھو کر پہنتی تھی۔ بالوں میں کنگھا کرتی تھی اور پاؤں میں اسفنجی چپل بھی ڈالتی تھی۔

"بابو۔" ایک دن وہ اس کے قریب بیٹھی تھی۔ بڑی افسردگی سے بولی۔

"ہاں!"

"تم چلے جاؤ گے نا؟"

"ابھی کہاں۔ بہت سارے دن یہاں رہوں گا۔"

"پھر۔"

"پھر کیا۔"

"آخر تو چلے ہی جاؤ گے۔"

"جانا تو ہے۔"

"میں کیا کروں گی؟"

"میرا انتظار۔ پھر آؤں گا تو تمہیں دلہن بنا کر لے جاؤں گا۔"

"جھوٹ تو نہیں کہتے؟"

"تم سے جھوٹ بولوں تو مر جاؤں۔"

"اللہ نہ کرے۔"

نیلی تاشی کے بہلاووں میں آ جاتی۔ اک حسین مستقبل کے خواب اس کی آنکھوں میں بسنے لگے۔ شہری زندگی کو اس نے دو ایک بار دیکھا تھا۔ گہما گہمی، رونق، ہلچل، دوڑ دھوپ اسے بے حد پسند آئی تھی۔ پھر شہری لوگ جو یہاں گرمیاں گزارنے آتے تھے اسے کتنے پسند تھے۔ خوبصورت لباسوں اور نفیس زیورات والی عورتیں اس کی آنکھوں میں تصوّرات کی دھند بکھیر دیا کرتی تھیں۔ وہ سوتے جاگتے ان کے متعلق سوچتی رہتی تھی۔ اور اپنے وجود پر سنہری روپہلے لباس سجا کر تصور کی آنکھ سے دیکھتی رہتی تھی۔ اسے شہر

پسند تھے۔ شہری زندگی پسند تھی۔ شہر کے لوگ پسند تھے۔

تاشی نے جو وعدے دیئے وہ ان پر ایمان لے آئی۔

اور

پھر

ان وعدوں کے سحر میں ڈوب کر وہ اپنا آپ کھو بیٹھی۔

کھو جانا بھی کتنا مسحور کن ہوتا ہے۔ کچھ بھی باقی نہیں بچتا۔ پھر بھی سرفروشی کا سا عالم ہوتا ہے۔ پالینے کے احساس میں سب کچھ لٹ جاتا ہے۔

تاشی نے نیلی کے جذبات کی دُنیا میں آگ لگا دی تھی۔ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی تھی۔ ماں کا خوف رہا تھا نہ لوگوں کا احساس۔ اس کی آنکھوں میں تو تاشی کے جلوے بسے تھے۔ اس کے جسم میں تاشی کے لمسوں کے پُر کیف اور لذت آمیز احساس رچے تھے۔ تاشی کے پیار کے جال میں وہ پھنستی چلی گئی تھی۔ اس کے حواس پر ہر وقت تاشی چھایا رہتا تھا۔ وہ اس کے پاس ہوتی تو اس کی بانہوں میں بے خود سی جھول جاتی۔ اس سے دُور ہوتی تو خیالوں میں اس لذت سے آشنا ہوتی رہتی۔

اور پھر

رنگ رلیاں، رنگ لائیں۔

اور

ایک دن

نیلی

اس احساس سے سر تاپا کانپ گئی کہ اس کے وجود اندر اک غیر محسوس سی تبدیلی ہو رہی ہے۔ اس کی ذات کے حصار میں ایک اور ذات محصور ہو گئی ہے۔

وہ گھبرائی

اور

تاشی کے پاس آتے ہی بدحواسی کے عالم میں بولی۔ "تاشی۔ تاشی اب کیا ہو گا؟"

"کیوں؟" تاشی نے حیرانگی سے اُسے دیکھا

وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھا، لب کانپے اور اس نے تاشی کے گلے میں بازو حمائل کر دیئے۔

"نیلی—— جان—— کیا ہُوا ہے' ماں کو پتہ چل گیا ہے کیا؟" تاشی نے اسے دبوچ کر پیار کر لیا۔

وہ رو دی۔

تاشی قدرے گھبرا لیا۔

"کیا ہوا۔ بتاؤ نا بولتی کیوں نہیں ہو؟"

وہ رو دی گئی۔

تاشی پر جھلاّہٹ سوار ہو گئی۔ اپنے سے الگ کر کے اسے بیڈ پر بٹھاتے ہوئے بولا۔ "کیوں رو رہی ہو؟"

بڑی مشکلوں سے نیلی اسے بتا پائی۔

ایک لمحہ کو تو وہ بھی چکرا گیا۔

"اب کیا ہو گا تاشی' میں کیا کروں؟" وہ سخت مضطرب تھی۔

وہ سوچوں میں ڈوب گیا۔

"بتاتے کیوں نہیں؟" نیلی نے اسے گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ "ابھی تو ہماری شادی بھی نہیں ہُوئی۔ اور۔ یہ۔ یہ۔"

"فکر نہ کرو۔ فکر نہ کرو۔" تاشی نے اس کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

پھر دونوں سنبھلے۔

نیلی سخت مضطرب اور بے چین تھی۔ اسے خوف ڈس رہا تھا۔ گاؤں کی شامی یاد آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ بھی پردیسی نے ایسا ہی کیا تھا۔ چھوڑ کر گیا تو واپس ہی نہ آیا۔ شامی کو ماں اور بھائیوں نے مار مار کر اَدھ موَا کر دیا۔ بدنامی کا داغ ماتھے پر سجا تو کوئی ہاتھ تھامنے کو بھی تیار نہ تھا۔ سامنے والی پہاڑی سے لڑھک کر اس نے جان دے دی تھی۔

"تاشی۔" نیلی نے بے اختیارانہ اسے پکارا۔

"کیوں میری جان۔" گھاگ آدمی معصومیت کو چکر دینے کا سوچنے لگا۔

"شادی کر لو نا۔"

"کر لوں گا۔ کر لوں گا۔"

"کب؟"

"ذرا مہلت تو دو۔"

نیلی کی اس نے ڈھارس بندھائی' لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے۔ اس کی پریشانی بڑھتی گئی۔ نیلی روز ہی اس کے پاس آتی۔ اپنی مصیبت کا حل مانگتی۔

آخر ایک دن وہی ہُوا جو اکثر ہوتا ہے۔ نیلی تاشی کے سامنے بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ اسے شادی کر لینے پر آمادہ کر رہی تھی۔ محبت کی قسمیں دے رہی تھی۔ وعدے یاد دلا رہی تھی۔ تاشی اب اس سے سخت بیزار رہنے لگا تھا۔ جھنجھلاہٹ اعصاب پر مسلط رہتی تھی۔ نیلی بلائے جان تھی۔ وہ اسے کئی بار سمجھا چکا تھا وہ پیچھا نہ چھوڑتی تھی۔

اس دن وہ بیزاری سے بولا۔ "بس کرو نیلی۔ دماغ چاٹ لیا ہے تم نے۔"

"تاشی میں کیا کروں گی۔ کچھ تو بتاؤ۔ تم نے مجھے برباد کر دیا ہے۔ اب کچھ حل بھی نہیں بتاتے۔"

اور

تاشی کمال سفاکی سے غرّایا۔ "بکواس بند کرو۔" آوارہ لڑکی۔ جانے کس کا گناہ میرے سر تھونپ رہی ہو۔"

"تا—— شی۔" نیلی کے وجود کی عمارت جیسے بھک سے اڑ گئی۔

"شور مت کرو۔ دفع ہو جاؤ۔" وہ دھاڑا۔

"تاشی۔ تم۔ تم۔ بابو تم۔ یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"نکل جاؤ یہاں سے ورنہ بابا کو بلا کر دھکے دلواؤں گا۔ ساری دنیا کو تمہارے کرتوت پتہ چل جائیں گے۔"

نیلی گھبرا کر اس کا منہ تکنے لگی۔ اور پھر پُھوٹ پُھوٹ کر رو دی۔ تاشی اٹھ کر چلا گیا۔ پریشان اور بدحواس ہو کر وہ بھی اٹھ گئی۔

لیکن

وہ کرتی کیا۔ ہر پھر کر اس کے پاس آتی۔ تاشی تو اب نگاہیں پھیر چکا تھا۔ اس افتاد سے بچنے کے لیے اس نے ریسٹ ہاؤس سے چلے جانے کا چپکے چپکے پروگرام بنا لیا۔ پیشتر اس کے کہ نیلی اور اس کے تعلقات کی گھناؤنی خبر مشتہر ہو جائے وہ چپکے سے یہ ریسٹ ہاؤس چھوڑ دینا چاہتا تھا۔

نیلی کی پریشانی بڑھ رہی تھی۔ وہ اس دن اس کے پاؤں پڑی۔ "تاشی خدا کے واسطے میرا کچھ کرو۔"

تاشی نے ٹھوکر ماری۔ "ذلیل آوارہ—— مجھے کیا کہتی ہو۔"

"تم—— تم نے مجھے تباہ کر دیا ہے۔ اب۔"

"بکواس بند کرو۔"

"تاشی——!"

"تم بد چلن اور آوارہ لڑکی ہو۔"

"ذلیل۔ کمینے۔" تاشی کے منہ پر نیلی کا زوردار طمانچہ پڑا۔

لیکن

یہ طمانچہ اس کے ضمیر کو جگا نہ سکا۔

وہ بپھر سا گیا اور ٹھوکریں مار مار کر نیلی کو کمرے سے نکال کر دروازہ بند کر لیا۔

نیلی دروازے سے سر پٹخنے لگی۔ وہ شاید سر پٹخ پٹخ کر مرجانا چاہتی تھی۔

تاشی پر اس کی آہ و بکا اور یوں سر پھوڑنے کا مطلقاً اثر نہ ہوا۔ اسے اس پر اتنا غصہ آرہا تھا کہ اٹھ کر گلا گھونٹ دینے کی خواہش محسوس ہو رہی تھی۔

اور

جب

نیلی تھک گئی، بے حال ہو گئی تو دونوں ہاتھ پھیلا کر آسمان کی طرف دیکھا——

اور بے بس عاجزی سے بولی—— "میرے خدا۔ تیری لاٹھی بے آواز ہوتی ہے جس ظالم نے مجھے تباہ کیا ہے تو اسے آباد نہ کرنا۔"

"ہونہہ۔" تاشی حقارت سے پھنکارا۔ "گناہ تو دونوں ہی نے کیا تھا نا۔"

دوسرے دن صبح سویرے تاشی نے ریسٹ ہاؤس چھوڑ دیا۔

وہ اب نیلی سے جان چھڑانے کے لیے یہی کر سکتا تھا۔

نیلی آخری بار پھر ریسٹ ہاؤس آئی۔ اس نے اپنی زندگی ختم کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ وہ رسوائی اور بدنامی کے نشان کو پھلنے پھولنے نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ معصوم تھی۔ شیطانی بہکاوے میں آ گئی تھی۔

لیکن

اب وہ اس کی سزا بوڑھی ماں کو نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ آخری بار مجسم التجا بن کر آئی تھی۔

اور

اگر تاشی نے اب بھی اسے اپنانے سے انکار کر دیا تو وہ مرجانے کا مصمم ارادہ کر چکی تھی۔

پہاڑی ندی کے زوردار پانیوں میں کود کر بلندی سے پستی کی طرف آتے پتھروں سے ٹکراتے وہ جان دے دینے کا تہیہ کر چکی تھی۔

تاشی جا چکا تھا۔ وہ مایوس ہو گئی۔

اور ان باتوں سے بے خبر تاشی ہوٹل میں اٹھ آیا۔

پندرہ دن اس نے ہوٹل میں قیام کیا۔

اور

پھر

کراچی چلا گیا۔

پہاڑ اور پہاڑی لڑکی کی پہاڑ ایسی مصیبت سے اسے جیسے کوئی سروکار ہی نہ رہا۔ چند دن ضمیر نے ملامت کی—— وہ پریشان رہا۔ ذہن پر بوجھ لیے پھرتا رہا۔ گناہ کا احساس ستاتا رہا۔ نیلی کو بے یار و مددگار چھوڑ آنے کا دکھ بھی ہوا

لیکن پھر زندگی معمول پر آ گئی۔

نیلی اور اس کے ساتھ بیتنے والا سانحہ ذہن سے نکل گیا۔ لپے پتے چہروں میں ہمہ سپردگی لیے وجودوں کی دنیا میں کھو گیا۔

پھر

ایک وقت آیا کہ اس کی ماں اور بڑی بہن اسے ازدواجی بندھن میں جکڑنے میں کامیاب ہو گئیں۔ وہ بھی شاید ڈال ڈال پھر کر تھک چکا تھا۔ مصنوعی چہرے سجا سجا کر اکتا گیا تھا۔ محبتوں کے رُوپ بدل بدل کر جھنجھلا گیا تھا۔

رشتہ دُور دراز تلاش بھی نہ کرنا پڑا۔ بہن کی نند پر نظر انتخاب پڑی۔ جدید تہذیب کی دلدادہ روبیہ کے لیے جب اس سے پوچھا گیا تو اس نے انکار نہیں کیا۔

دبے دبے لفظوں میں صرف یہی کہا۔ "لڑکی ذرا تیز ہے۔"

"سب لڑکیاں تیز ہوتی ہیں۔" بہن نے اس کی بات رد کر دی۔

روبیہ اس کی جیون ساتھی بنا دی گئی۔ خاصے پیسے والے لوگ تھے۔ جہیز کی

صورت میں وہ اتنا کچھ لائی کہ تاشی کا گھر تنگ معلوم ہونے لگا۔

حجلۂ عروسی روبیہ کے سامان ہی سے سجایا گیا۔ جگمگاتی روشنیوں میں نیا قالین' نئے پردے' نیا فرنیچر اور سنہری روپہلی لڑیوں اور پھولوں سے سجی خواب گاہ میں جب تاشی داخل ہوا تو اس کے من میں خوشیوں کے سُوتے اُبل رہے تھے۔

روبیہ بھاری عروسی ٹشو کمخواب کے جوڑے میں سنہری کامدانی دوپٹے کا گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی۔

کمرے میں پھولوں اور پرفیومز کی خوشبوئیں ملی جلی تھیں۔ یہ خوشبوئیں حواس پر نشہ سا بن کر چھا رہی تھیں۔ وہ بہکے بہکے قدموں سے کسی بدمست شرابی کی طرح چلتا بیڈروم میں آ گیا۔ کمرے کی چٹخنی چڑھائی اور اپنے ناہموار ہوتے سانسوں کو درست کرنے کے لیے صوفے پر بیٹھ گیا۔

روبیہ جوں کی توں بیٹھی رہی۔ اس کی آمد سے اس سنہری گٹھڑی میں ذرہ بھر بھی ہلچل نہ ہوئی۔

تاشی نے صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے پاؤں سے سنہری کھُسہ اتارا۔

پھر شیروانی کے بٹن کھولے

اور

اور

بالکل اچانک اسے وہ لفافہ یاد آ گیا جو کسی اجنبی چہرے نے حجلۂ عروسی میں آتے آتے کاریڈور میں اسے پکڑا دیا تھا۔ اور جسے اس نے سلامی کے روپوں سے بھری جیب میں ہی رکھ لیا تھا۔

یہ لفافہ کس کا ہو سکتا ہے؟ سوچتے ہوئے اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ لفافہ نکالا ہاتھ سے ٹٹولا۔ لفافے میں یقیناً سلامی کے پیسے نہ تھے۔

اس نے جلدی سے لفافہ چاک کیا۔

اب چھوٹا سا پُرزہ اس کے ہاتھ میں تھا۔

اس نے سطور پر نگاہ ڈالی۔

چونکا۔ آگے کو جھکا اور

آنکھیں پُوری طرح کھول کر سطور کو پڑھا۔

رُقعہ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر گر گیا۔

ایک لمحہ کو اس پر جیسے سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

پھر

یوں لگا کہ وزنی بم پھٹ گیا ہے اور اس کے وجود کے پرخچے اڑ گئے ہیں۔

کئی لمحے

وہ نہ ہونے کی کیفیت میں پڑا رہا۔

اور

جب نہ ہونے کی کیفیت ہونے سے دوچار ہوئی تو اک دھاڑ اک گرج اور اک چنگھاڑ بلند ہوئی۔

"روبیہ — !"

بے حس و حرکت بیٹھی روبیہ نے ایک دم اپنا گھونگھٹ الٹ کر اسے دیکھا۔

کف اڑاتے پانیوں کی طرح تاشی بیڈ کے قریب کھڑا جیسے سب کچھ بہالے جانے کو کھڑا تھا۔

روبیہ بالکل سپید پڑ گئی۔

پھٹی پھٹی آنکھوں سے تاشی کو دیکھا۔

تاشی نے رقعہ اس کی طرف اچھالتے ہوئے شعلہ بار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا:

"آصف کون ہے؟"

روبیہ کا وجود پتھرا گیا۔

"کون ہے آصف۔" وہ غصے سے دھاڑا۔

"وہ — وہ۔" روبیہ کے سانس غیر ہموار ہو گئے۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔

تاشی کے سارے بدن میں سوئیاں چبھنے لگیں۔ اس کی انگلیوں میں اینٹھن ہونے لگی۔ غصے سے تھر تھر کانپتے ہوئے وہ بیڈ کے کنارے بیٹھا اور روبیہ کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے چیخا۔ "بتاتی کیوں نہیں ہو؟"

وہ روئے گئی۔ اس کا انداز شکستگی تاشی کو بوکھلائے جا رہا تھا۔

اس نے سختی سے اس کو جھنجھوڑ ڈالا۔ پھر اس کے بالوں میں مٹھی بھر کر جھٹکے سے اس کا سر اونچا کیا اور چیختے ہوئے بولا۔ "ذلیل' آوارہ کہیں کی۔"

روبینہ نے مزاحمت نہ کی۔ اس کا انداز پکار پکار کر رقعے میں لکھے الفاظ کی تائید کر رہا تھا۔

رقعہ کسی آصف نامی شخص نے لکھا تھا۔ چند الفاظ سے جو خودکار بموں سے کم نہ تھے‘ تاشی کی ذات‘ وجود اور دنیا کے پرخچے اڑ گئے تھے۔

روبینہ اور آصف کی رنگ رلیاں بھی رنگ لا چکی تھیں۔ رقعے میں یہی لکھا تھا۔

”اوہ خدایا۔“ تاشی دھکے سے روبینہ کو پرے ہٹاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جیسے ننگے پاؤں دہکتے انگاروں پر کھڑا تھا۔

اس سے کھڑا نہ رہا جاسکا۔
تیورا کر صوفے پر گر گیا۔
اس نے آنکھیں سختی سے میچ لی تھیں۔
کانوں میں انگلیاں ٹھوس رکھی تھیں۔
کچھ پتہ نہ تھا کہ
کیا ہوا ہے؟
کیوں ہوا ہے؟

اسے تو روبینہ کا آنسوؤں سے رندھا ٹوٹے پھوٹے بکھرے بکھرے لفظوں کا اعتراف بھی سنائی نہ دے رہا تھا۔

وہ بے خود‘ بے سدھ پڑا تھا۔
ہاں
اس کی بند آنکھوں میں کہیں سے
نیلی گھس آئی تھی
اور
اس کے کانوں میں
نیلی کے الفاظ قطرہ قطرہ تیزاب کی طرح اتر رہے تھے:

”خدایا تیری لاٹھی بے آواز ہے جس ظالم نے مجھے برباد کیا ہے تو اسے آباد نہ کرنا۔“

کیسے مناؤں؟

”میں کیا کروں؟“
”اسے کیسے مناؤں؟“
”اسے کیونکر مناؤں؟“

اللہ جی میں کیا کروں۔ کیسے مناؤں اسے۔ کیسے مناؤں۔ کوئی بتائے میں اسے کیسے مناؤں‘ کوئی بتائے۔ اللہ۔ میں کیا کروں۔ کیا کروں؟“ دونوں ہاتھ سے چھاتی پیٹتے ہوئے جینا بار بار کہے جا رہی تھی۔ اس نے اپنے بال نوچ لیے تھے۔ کپڑے پھاڑ ڈالے تھے۔ چیخ چیخ کر حلق سوکھ گیا تھا۔ آواز بیٹھ گئی تھی۔ وہ صرف رو نہیں رہی تھی۔ ماہئ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔

کمرہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ عورتیں مرد سبھی جمع تھے۔ چہرے ویران اور آنکھیں اشکبار تھیں۔ جب جینا تڑپ تڑپ کر چیختی تو سب کے سینے فرطِ غم سے جیسے پھٹنے لگتے۔ اونچی آوازوں میں نالہ و شیون شروع ہو جاتا۔ جینا کی اماں اور ابا تو پہلے ہی غم سے ادھ موئے ہو رہے تھے۔ اس کے یوں واویلا کرنے پر تڑپ تڑپ جاتے۔ کوئی ہمت کر کے انہیں سہارا دینے کی کوشش کرتا تو خود بھی بے سہارا سا ہو جاتا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ تسلی کے الفاظ حلق میں ہی اٹک جاتے۔

جینا کی ساس نے جینا کو بازوؤں میں لے رکھا تھا۔ اس کا شوہر راشد بھی مرقع یاس بنا اس کے قریب بیٹھا تھا۔ جب جینا بے تابی سے تڑپ تڑپ کر کہتی:

"میں اسے کیسے مناؤں۔ کیسے مناؤں امی؟" جینا نے ساس کی طرف دیکھ کر فریاد کی۔ تو ساس کا دل جو پہلے ہی بھر بھر آرہا تھا سینے میں زخمی پرندے کی طرح پھڑکنے لگا۔ اس کی پیشانی چومتے ہوئے رو دیں۔ پھر بھرائی ہوئی آواز میں صرف اسی قدر کہہ سکیں۔

"صبر—— صبر میری بچی۔"

جینا ان کے بازوؤں سے نکل کر سیدھی ہو بیٹھی۔ چاروں طرف نگاہ دوڑائی' کمرہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ کمرے سے باہر بھی لوگ جمع تھے۔ آنسوؤں سے بھیگے گہری گہری آہیں بھرتے چہرے۔ وہ ایک لمحہ کو چپ ہو گئی۔

پھر ایک دم چیخ اٹھی۔ "اتنے لوگ جمع ہیں کوئی نہیں بتاتا۔ میں کیسے مناؤں اسے۔ کیسے مناؤں—— کیسے منا......ؤ......ں؟"

وہ چیختے چیختے بے دم ہو کر گری۔ راشد نے جلدی سے اسے بازوؤں میں تھام لیا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

"پانی لاؤ' دودھ لاؤ۔ کچھ لاؤ۔ جینا بے ہوش ہو گئی اسے پانی کے چھینٹے دو۔" کئی آوازیں بیک وقت آئیں۔ کئی لوگ پانی اور دودھ لینے دوڑے۔

"اماں انہیں دوسرے کمرے میں نہ لے چلیں؟" راشد نے ماں سے پوچھا۔

"ہاں ہاں لے چلو۔" ساتھ بیٹھی عورتیں بولیں۔ "غش پہ غش کر رہی ہے۔ اسے ہی کچھ نہ ہو جائے۔"

جینا کی ساس نے بھی تشویش محسوس کرتے ہوئے جینا کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے کٹے بال پیچھے ہٹائے۔ وہ بے سُدھ تھی۔

"راشد بیٹے اسے پرے کمرے میں لے جاؤ۔" جینا کی اماں نے اپنے زانوؤں پر بے بسی سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا—— "ایک تو گیا کہیں یہ بھی——"

جینا کے ابا کو لوگ سہارا دے کر باہر بیٹھک میں لے گئے۔ تعزیت کے لیے لوگ آئے ہوئے تھے۔ ابا کی تو کمر ہی ٹوٹ گئی تھی۔ آواز بھی نہ نکل رہی تھی۔

راشد نے جینا کو بازوؤں میں لیا اور اٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔

اس کی ساس اور جینا کی چچا زاد بہن رافعہ بھی ساتھ ساتھ کمرے سے نکلیں۔ بہت سی عورتیں بھی ساتھ جانے کے لیے اٹھیں لیکن رافعہ نے ہاتھ جوڑ کر سب کی

منت کی۔ "خدا کے لیے ادھر نہ آئیے۔ جینا کی حالت آپ دیکھ ہی رہی ہیں۔"

"ہاں بھئی نہ جاؤ۔ اسے ہوش آجائے تو وہیں لیٹا رہنے دیں۔ بیچاری۔" عورتیں آپس میں باتیں کرنے لگیں۔

ماتم پرسی کو کچھ اور لوگ آگئے۔ چیخ و پکار سے سارا گھر گونج اٹھا۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو اشکبار نہ تھی۔ چوبیس سالہ ریحان کی ناگہانی موت کا سانحہ بھی تو ایسا تھا کہ اپنوں تو اپنوں دوسروں سے بھی برداشت نہ ہو پاتا تھا۔

پرسوں صبح اچھا بھلا گھر سے نکلا اور شام لہو لہان لاش گھر آگئی۔ ٹریفک کے بے رحم حادثے نے ایک چراغ گُل کر دیا۔ اسی سے گھر روشن تھا۔ یہی والدین کے مستقبل کی نورانی شمع تھی۔ آناً فاناً ایسی آندھی چلی کہ شمع بجھ گئی۔ اور چاروں اُور گھور اندھیرا چھا گیا۔ اس اندھیرے میں ماں اور باپ ڈوب گئے۔ گھربار کا ہوش نہ رہا نہ کسی اور کام کا۔ وہ تو محلے داروں اور عزیزوں دوستوں کی بروقت اعانت تھی جو جوانمرگ لاش کی تجہیز و تکفین کی۔ اور اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچا دیا۔ ورنہ ماں باپ پر ہوتا تو لہو لہان لاش سے جس طرح لپٹ لپٹ کر آہ و فریاد کر رہے تھے ویسے ہی کرتے رہتے۔ ان کا اور تھا بھی کون۔ ریحان تھا اور جینا——

جینا پچھلے چھ ماہ سے دوبئی میں راشد کے ہمراہ رہ رہی تھی۔ شادی کے بعد وہ دوبئی چلی گئی تھی۔

جینا آج صبح پہنچی تھی۔ راشد بھی اس کے ساتھ آیا تھا۔ غیر متوقع حادثے نے تو جینا کے ہوش و حواس ہی گم کر دیے تھے۔ وہ باؤلی سی ہو رہی تھی۔ اسے تو راشد نے صرف یہی بتایا تھا کہ ریحان ٹریفک کے حادثے میں زخمی ہو گیا ہے۔

امید و بیم میں بے سہارا سی لٹکتی وہ دوبئی سے آئی تھی۔ راستے میں بار بار راشد سے پوچھتی۔ "آپ نے فون ٹھیک سُنا تھا نا؟"

"ہاں۔" راشد بمشکل اپنے آپ کو قابو میں رکھ سکا۔

"تشویش والی بات تو نہیں؟"

"اتنی زیادہ نہیں۔ بس اللہ سے دُعا مانگو۔"

"آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔" وہ اپنی چھٹی حس کے بارسے کہہ اٹھی۔

سارا راستہ راشد اسے جھوٹے بھروسے کے سہارے تسلی دیتا رہا۔ وہ جانتا تھا

اسے اپنے ایک اکلوتے بھائی سے کتنی شدید محبت ہے۔

اور

اسے یہ بھی پتہ تھا کہ دونوں بہن بھائی ایک عرصے سے ایک دوسرے سے روٹھے ہوئے ہیں۔

دوبئی سے پنڈی اور پنڈی سے لاہور کی فلائیٹ کے درمیان بھی جینا ماہئ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ وہ فرطِ غم سے نڈھال ہو جاتی تو سختی سے راشد کا کندھا پکڑ لیتی۔

پھر

راشد کے تسلی و تشفی دینے پر خدا کے حضور آنکھیں بند کر کے دُعائیں مانگنے لگتی۔

راشد رات بھر ذہنی کرب میں مبتلا رہا۔ اس کا کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ آنسو تڑپ تڑپ کر بہنے کو مچل رہے تھے۔ ہُوک سی اٹھتی تھی۔ جینا کی دعائیں سن سن کر اس کا دل خون ہو رہا تھا۔

لیکن

مجبوری تھی۔ ایسا نہ کرتا تو جینا دوبئی سے لاہور پہنچ ہی کیسے سکتی تھی۔ بات صرف یہی تو نہ تھی کہ ریحان اس کا انتہائی پیارا اور اکلوتا بھائی تھا۔

ظلم تو یہ تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے روٹھے ہوئے تھے۔ اور روٹھے روٹھے ہی ریحان اس سے ہمیشہ کے لیے روٹھ گیا تھا۔

"گھر پہنچ کر جینا پر کیا بیتے گی؟ وہ اس صدمے کو سہار بھی پائے گی یا نہیں؟" غم و اندوہ میں ڈوبا راشد اس سوچ سے بھی پریشان ہو رہا تھا۔

ایئرپورٹ پر کچھ عزیز گاڑی لے کر آئے تھے۔ جینا کے رشتہ کے چچا اور دو کزن تھے۔ خالہ زاد بہن سلمیٰ بھی تھی۔ پروگرام تو یہی تھا کہ ایئرپورٹ پر جینا کو کچھ نہ بتایا جائے۔

لیکن

سوجی ہوئی آنکھیں، زردی کھنڈے چہرے، بے ترتیب لباس اور سب پر چھائی پژمردگی تو پکار پکار کر اس سانحے کا اعلان کر رہی تھی۔ جو بیت چکا تھا۔

جینا کو کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ بتانے کی نوبت ہی نہ آئی۔ بھرائے ہوئے لہجے اور خون ہوتے دلوں سے کچھ کہا نہ جا سکا۔ یہ تو جینا کی چھٹی حس تھی جس نے سب کچھ بھانپ

لیا۔ مرگ کی اداس و سوگوار فضا تھی جو سب کچھ بتا گئی۔

"میرا بھائی—" جینا کے فق چہرے پر بالکل سپید پڑے ہونٹوں سے صرف اسی قدر نکلا۔

کوئی کچھ نہ بولا۔ حلق میں اترتے آنسو کو نگلنے کی کوشش کرتے ہوئے سلمیٰ نے اسے گلے سے لگا کر گاڑی میں بٹھانا چاہا تو جینا بازو جھٹک کر سب کے چہرے تکتے ہوئے بولی۔

"تو کیا— کیا ریحان—؟"

سب کے سر جھک گئے۔

"مر گیا؟" جینا چیخی۔ "چلا گیا؟ روٹھے روٹھے چلا گیا؟"

اس پر ہذیانی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ بمشکل اسے گاڑی میں ڈال کر گھر لایا گیا۔

پھر ایک کہرام مچ گیا۔ اک قیامت ٹوٹ پڑی۔ ماں نے پیٹ پیٹ کر سینہ زخمی کر لیا۔ باپ نے دھاڑیں مار مار کر پچھاڑیں کھائیں۔ رشتہ دار عزیز و اقارب محلے والے اپنے پرائے سب تڑپ تڑپ کر روئے۔

جینا کی حالت مخدوش تھی۔ غش پہ غش کر رہی تھی۔ ذرا کی ذرا جو ہوش میں آتی تو تڑپ تڑپ کر یہی کہتی۔

"میں اسے کیسے مناؤں؟"

"لوگو مجھے بتاؤ میں اسے کیسے مناؤں؟"

"اللہ جی— میں اسے کیسے مناؤں؟"

"روٹھا روٹھا چلا گیا۔ میں کیسے مناؤں گی اسے؟"

"میرے مولا— میں کیا کروں؟"

جینا اور ریحان اوپر تلے کے تھے۔ ریحان تین سال بڑا تھا۔ جینا چھوٹی تھی۔ ان کے بعد دو بچے اور پیدا ہوئے تھے لیکن چھ اور آٹھ ماہ کی عمروں ہی میں فوت ہو گئے تھے۔

رشید احمد اور جمیلہ کی آنکھوں کے یہی دو تارے تھے۔ آخری بچے کی پیدائش پر جمیلہ بیمار ہو گئیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے بچے کی پیدائش سے سختی سے منع کر دیا کیونکہ بچے کا ہونا ماں کی زندگی کے لیے خطرہ تھا۔

رشید احمد مطمئن تھے۔ وہ جمیلہ کو تسلی دیتے۔ "اور بچے نہیں ہو سکتے تو نہ سہی۔

خدا کا شکر ہے بیٹی بھی ہے بیٹا بھی۔ یہی جیتے رہیں اور لائق ہو جائیں تو بہت ہے۔"

جمیلہ مسکرا دیتی۔ واقعی خدا نے بیٹے اور بیٹی کی نعمت تو دے ہی دی تھی اور ان کی تربیت اور پرورش کے لیے ان کے پاس کافی کچھ تھا۔ دونوں بچے ماں اور باپ کی آنکھوں کا تارا تھے۔

بہن بھائی میں شروع ہی سے مثالی پیار تھا۔ لیکن اس پیار کے ساتھ ساتھ دونوں کی آپس میں لڑائی بھی بہت ہوتی تھی۔ کبھی کبھی تو ان کی لڑائی جمیلہ کے لیے بیحد تشویش کا باعث بن جاتی۔

لیکن

جب مار دھاڑ کے بعد دونوں کو اکٹھے کھیلتے اور دوڑتے بھاگتے دیکھتی تو۔۔۔ مسکرا دیتی۔

وہ دونوں کو اپنے پاس بٹھا کر نصیحتیں بھی کرتی، سمجھاتی بھی۔

"ریحان تم بڑے ہو۔ جینا تمہاری چھوٹی بہن ہے، چھوٹوں سے ہمیشہ پیار کرنا چاہیے۔"

"جینا! ریحان تمہارے بڑے بھائی ہیں۔ ان کا ادب کیا کرو۔ اللہ میاں نے بڑوں کا ادب کرنے کا حکم دیا ہے۔۔"

دونوں متاثر ہوتے لیکن نصیحتیں سنتے سنتے ہی دونوں ایک دوسرے سے تُو تُو مَیں مَیں شروع کر دیتے۔

"سن لیا نا؟" ریحان جینا سے کہتا۔

"تم نے بھی سن لیا نا؟" جینا پلٹ کر غرائی۔

"دیکھا امی۔ کیسے جواب دے رہی ہے؟"

"اور آپ کیسے بول رہے ہیں؟"

"خدا تمہیں دوزخ میں ڈالے گا۔ ہمارا کیا ہے۔"

"تمہیں دوزخ میں ڈالے گا۔ جب جلو گے نا دوزخ میں تو میں خوب ہنسوں گی۔"

"جینی پھینی!"

"ریحان پان۔"

"موٹی پھپھلو۔"

"سوکھا ڈنڈا۔"

"چھپکلی۔"

"چوہا۔"

"بھینس"

"بڑ کنا۔"

ایک دوسرے کے نام ڈالے جاتے اور پھر جسے زیادہ غصہ آتا وہ پل پڑتا۔ اماں چھڑانے کی کوشش کرتیں لیکن توبہ۔ ریحان کی مٹھی میں جینا کے بال ہوتے اور جینا کے ہاتھ میں ریحان کے کان۔

وہ چھوڑتا نہ یہ۔ درد سے دونوں بے تاب ہوتے۔ روتے بھی جاتے لیکن اس وقت تک نہ چھوڑتے جب تک جمیلہ اپنی پوری طاقت استعمال کر کے دونوں کو جدا نہ کرتیں۔ وہ خود ہانپ جاتیں اور دونوں کو کوس کوس کر بے دم ہو جاتیں۔

ایک دوسرے سے چھٹ کر بھی دونوں ایک دوسرے پر جھپٹنے کی پوزیشن میں کھڑے رہتے۔ کبھی کبھی تو دوسری مرتبہ بھی طیش میں آ کر گتھم گتھا ہو جاتے۔ کبھی نوکرانی ایک کو دوسری طرف لے جاتی اور معاملہ ٹھنڈا پڑ جاتا۔

پھر دونوں ہی یہ معرکہ بھول بھی جاتے۔ چند منٹ بھی نہ گزرتے کہ دونوں ایک دوسرے سے کھیل میں مشغول ہوتے۔ جینا اپنے سارے کھلونے بڑی فراخدلی سے ریحان کے سامنے ڈھیر کر دیتی۔

اور۔۔۔ ریحان بڑی خوشی سے جینا کو اپنی ٹرائی سائیکل کے پیچھے بٹھا کر صحن میں چکر لگا رہا ہوتا۔

وقت دبے قدموں سے بغیر کسی آہٹ کے گزر رہا تھا۔ جینا اور ریحان بڑے ہو رہے تھے۔ سکول میں داخلہ لے لیا تھا۔ ریحان عمر کے حساب سے جینا سے تین سال آگے تھا۔ بچے دونوں ہی ذہین تھے۔ پڑھائی میں بہت اچھے جا رہے تھے۔

لیکن

یہ سب کچھ اپنی جگہ۔ لڑنا اور منانا اپنی جگہ۔ اس عادت میں ذرہ بھر تبدیلی نہ آئی تھی۔ وہی سلسلہ تھا جو چل رہا تھا۔ ایک دوسرے کے نام ڈالنا بھی ویسے ہی تھا۔ مقصد چڑانا ہوتا۔

پیار و محبت کا بھی وہی عالم تھا۔ کیا مجال کہ جینا کے حلق سے ریحان کے بغیر کوئی چیز اُتر جائے۔ ریحان بھی اس وقت تک کھاتا پیتا نہ تھا جس وقت تک جینا برابر کی کرسی پر نہ آ بیٹھتی۔

یہ اور بات تھی کہ میز پر ہی لڑائی ہو جاتی اور پلیٹیں پیالیاں ٹوٹ جاتیں۔

لڑائی کی ابتداء ہمیشہ یوں ہوتی کہ جینا چڑ جاتی یا ریحان فٹ سے کہہ دیتے کہ "مر"

"تُو مر"

"تُو تُو تُو مرے!"

"تیرا جنازہ نکلے!"

"تیری قبر بنے"

یہی باتیں طیش دلا دیتیں اور جس کے ہاتھ جو چیز آتی پٹخ دیتا۔ اماں چیختیں۔

"کم بختو کیوں لڑ مر رہے ہو۔ جان کو آ رہے ہو۔ کیا بانٹنا ہے؟ بیڑا غرق تمہارا۔ کوئی دن جو چین سے گزرنے دیں—— الگ الگ بھی تو کمبخت نہیں بیٹھتے۔"

دونوں ایک دوسرے کو بھوکے شیروں کی طرح گھورتے ہوئے اِدھر اُدھر ہو جاتے۔

ریحان نے میٹرک کا امتحان بڑے اچھے نمبر لے کر پاس کیا۔ سکول میں تیسری پوزیشن آئی۔ وہ رزلٹ لے کر بھاگا بھاگا گھر پہنچا۔ سب سے پہلے اس نے خوشخبری جینا کو سنائی۔

"میں پاس ہو گیا ہوں جینی!"

"سچ؟" جینی اس سے لپٹ گئی۔

"فرسٹ ڈویژن لی ہے۔" ریحان نے اسے پیار کر لیا۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔" جینی نے کہا۔ "میرا پیارا پیارا بھیا پاس ہو گیا۔" اماں اور ابا بھی اس کی کامیابی پر بہت خوش ہوئے۔ اماں نے بیٹے کی پیشانی چوم لی۔ ابا نے لپٹا کر پیار کر لیا۔ نوکر چاکر جمع ہو گئے۔ محلے والوں کو خبر ہوئی تو مبارک دینے آ گئے۔ خوشی کا خوب خوب اظہار ہوا۔

"اماں میں اپنی سہیلیوں کی پارٹی کروں گی۔" جینا نے اس شام امی سے کہا۔

"کیوں؟" ریحان بولا۔

"آپ کے پاس ہونے کی خوشی میں۔"

"پاس میں ہُوا ہوں اور پارٹی تیری سہیلیوں کی ہو گی؟"

"ہاں!"

"ہونہہ۔"

"آپ کو کیا ہے؟"

"واہ جی مجھے کچھ نہیں۔"

"میں کروں گی پارٹی۔"

"دیکھوں گا کیسے کرتی ہو۔ بڑی آ گئیں سہیلیاں بندریاں ہوں جیسے۔"

"بندر آپ ہوں گے لنگور کہیں کے!"

"بکواس کر رہی ہو نا؟—— ماروں گا۔"

"اوہو۔ بڑے آئے۔ ہاتھ لگا کر دیکھیں۔ ریحان پان۔"

"جینی چھینی!"

"بڑ کنا"

"موٹی بھینس۔"

"لم ڈھینگ۔"

تُو تُو مَیں بڑھنے لگی۔ ریحان جینا کو مارنے لپکا تو اماں نے بیچ میں آ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "شرم کرو جوان بہن پر ہاتھ اٹھا رہے ہو۔ اب بچی تو نہیں رہی۔"

"اسے بھی تو تمیز سکھائیں نا۔ جتنی بڑی ہو رہی ہے اتنی عقل چھوٹی ہو رہی ہے۔"

"میں نے ابا سے شکایت نہ کی تو کہنا۔" جینا رونے لگی۔

"میرے منہ میں بھی زبان ہے میں بھی سب کچھ کہہ سکتا ہوں۔" وہ غرایا۔

"آج تک تو تمہاری کوئی شکایت ابا سے نہیں کی نا میں نے۔" جمیلہ بیگم غصے سے بولیں۔ "لیکن اب تم دونوں لڑے تو یاد رکھنا۔ باپ سے وہ پٹائی کرواؤں گی کہ چھٹی کا دُودھ یاد آ جائے گا۔ اب تم میرے قابو میں نہیں آتے۔ باپ ہی سے ٹھیک ہو گے۔"

لیکن باپ سے کوئی بڑی شکایت کرنے کی نوبت ہی نہ آتی تھی۔ دونوں میں جھٹ صلح بھی تو ہو جاتی۔

اُسی رات دونوں پارٹی کا مل کر پلان بنا رہے تھے۔ ایک دوسرے کو تحفہ دینے کی باتیں کر رہے تھے۔

"ریحان۔ میرے پاس پورے دو سو روپے ہیں۔ سارے لے لو اور اپنے لیے اپنے پسند کی چیز لے آؤ۔"

"میرے پاس ڈیڑھ سو روپے ہیں۔ میں تمہارے لیے اپنے پاس ہونے کی خوشی میں اچھی سی چیز لانا چاہتا ہوں۔"

"ڈیڑھ سو میں کیا آئے گا؟"

"بیوقوف پاس ہونے پر سب سے پیسے ملیں گے نا۔ بس میں نے پلان بنالیا ہوا ہے۔"

"کیا لاؤ گے؟"

"ابھی سے کیوں بتاؤں؟"

"پھر بھی۔"

"اچھا تم بتاؤ کیا لو گی؟"

"ہوں۔ ٹھہرو سوچ لوں۔"

"اچھا سوچ لو۔"

"اور تم دو سو کا کیا لو گے؟"

"میں بھی سوچ لوں۔"

دونوں نے اک مشترکہ قہقہہ لگایا اور کچن میں کام کرتی جمیلہ بے اختیارانہ مسکرا کر بڑبڑائی۔ "بھلا ہو تمہارا۔ لڑائی میں بھی پیش پیش اور صلح صفائی میں بھی۔ عجیب ہی بچے ہیں۔"

ماہ و سال کا چکر چلتا رہا۔

جینا اور ریحان اسی ڈگر پر چلتے چلتے بڑے ہو گئے۔ ریحان نے انجینئرنگ میں داخلہ لے لیا۔ جینا نے میٹرک کر لیا۔

اب دونوں سمجھدار ہو گئے تھے۔ دونوں حتی المقدور کوشش کرتے کہ ٹکراؤ نہ ہو۔

لیکن

پھر بھی عادت بن چکی تھی۔ لڑ جھگڑ نہ لیتے تو چین نہ آتا تھا۔ میٹرک پاس

کرنے کی خوشی میں ریحان نے جینا کو ننھی ننھی سونے کی بالیاں تحفہ میں دیں تو جینا خوشی سے پاگل سی ہو گئی۔ بالیوں کو بے اختیارانہ چوم کر بولی۔ "امی نے سوٹ دیا ہے۔ ابو نے ڈھیر سارے روپے دیئے ہیں۔ لیکن میرے لیے یہ تحفہ سب سے زیادہ قیمتی ہے!"

"کیوں؟" ریحان خوش ہو کر بولا۔

"اس لیے کہ یہ میرے بڑے ہی پیارے 'بڑے ہی لڑاکے بھیا نے دیا ہے۔"

"ٹھہر تو۔۔۔ لڑاکا کہتی ہے مجھے؟"

"جو ہیں وہی کہتی ہوں۔"

"اب نہ لڑا کر مجھ سے۔"

"تو گویا میں لڑتی ہوں؟"

دونوں گرما گرمی دکھانے کو تھے کہ جمیلہ اور رشید نے ان کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

ایف۔اے کے بعد جینا نے پڑھائی چھوڑ دی۔ اماں چاہتی تھیں کہ وہ کچھ گھرداری سیکھے۔ ریحان کے ساتھ تو وہ اب تک بالکل لونڈا بنی ہوئی تھی کھانا پکانا آتا تھا نہ سینا پرونا۔

ریحان اس بات کا حامی نہ تھا۔ اس نے ماں باپ دونوں سے اس سلسلے میں بہت کچھ کہا۔ "کم از کم بی۔اے تو کر لینے دیں۔ گھرداری بھی سیکھ لے گی۔ ساری عمر اسے یہی کام کرنے ہیں۔ ابھی اسے کالج لائف انجوائے کرنے دیں۔"

جینا ریحان کی اس طرف داری سے بے حد خوش تھی۔ بھائی کے صدقے واری ہوئی۔

لیکن

اماں اور ابا نے مناسب نہیں سمجھا۔ اتنی تعلیم ہی کافی تھی۔ اور پھر اب لوگ بھی تو پوچھ رہے تھے۔

"مناسب رشتہ مل جائے تو اس کے ہاتھ پیلے کر دیں گے۔" ریحان کی ساری بحث کے بعد اماں کہتیں۔ "رشتے آ رہے ہیں جو بھی نظروں میں جچ گیا ہاں کر دیں گے۔ اسی لیے تو کہتی ہوں کچھ گھر کے کام بھی سیکھ لے۔"

اماں کی بات معقول تھی۔ ریحان کو چپ ہونا پڑا۔

پھر

جینا گھر کے کام سیکھنے لگی۔ کھانا پکانا تو بالکل ہی نہ آتا تھا۔ کبھی کھانا جلا دیتی۔ کبھی

بانہوں کو داغ لیتی۔ پرانی خادمہ تھی جو اسے طرح طرح کے کھانے سکھا رہی تھی۔ اُس دن جینا نے بڑی محنت سے کھانا بنایا۔ نرگسی کوفتے' پلاؤ اور آلو گوشت بنایا۔ سویٹ ڈش بھی تیار کی۔ سارا دن کچن میں ہی گھسی رہی۔ اب وہ پہلے سے بہتر کھانے بنا لیتی تھی۔

اماں اور ابا نے میز پر اس کی خوب تعریف کی۔

لیکن

ریحان اسے چڑانے کے لیے بولا۔ "اسے پکانا آ ہی نہیں سکتا۔ کوفتے بدمزہ۔ پلاؤ میں گوشت قیمہ بن گیا ہے۔ آلو گوشت تو چکھ کر ہی منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا۔"

جینا کو غصہ آ گیا۔ بھنّا کر بولی۔ "یہ منہ اور مُسور کی دال۔ میرے ہاتھ کے پکے کھانے' کھانے کی بھی کسی کسی کو تمیز ہے۔"

"دیکھا اماں۔" ریحان نے ماں سے شکایت کی۔

"بھئی تم بھی تو خواہ مخواہ کے کیڑے نکال رہے ہو۔" ابا مسکرائے۔ "اچھا بھلا کھانا بنایا ہے ہماری بیٹی نے۔"

"آپ لوگوں نے اس کی جھوٹی تعریف کر کر کے اسے سر چڑھا رکھا ہے۔" ریحان بولا۔

جینا کھانے کے بعد سویٹ ڈش لے آئی۔ ابا کو پیش کی اور پھر اماں کو۔

"لائیے جناب۔ سویٹ ڈش میں کونسا تیر مارا ہے؟" ریحان ڈونگا لینے لگا۔

جینا نے ڈونگا اسے دینے کی بجائے اپنے آگے رکھ لیا۔

ریحان نے جھپٹ کر ڈونگا لینا چاہا۔

جینا نے ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ دونوں کی چھینا جھپٹی پر رشید احمد اور جمیلہ مسکرا رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو کوسے بھی جا رہے تھے۔ دونوں کا پارہ چڑھ رہا تھا۔

"دو مجھے۔" ریحان نے غصیلی آواز میں کہا۔

"نہیں دیتی___ نہیں دوں گی۔" وہ چلاّئی۔

"کیسے نہیں دو گی۔" ریحان نے ہاتھ بڑھا کر ڈونگا چھیننے کی کوشش کی۔ جینا نے سر جھکایا اور اس کی کلائی میں دانت گاڑ دیئے۔

ریحان درد سے بلبلایا۔ دوسرے لمحے الٹے ہاتھ سے ڈونگا چھینا اور میز پر زور سے پٹخ دیا۔

ماں اور باپ دونوں کو ششدر سے دیکھتے رہ گئے۔ ڈونگا ٹوٹ گیا تھا اور اس کی ایک کرچ اڑ کر جینا کا گال زخمی کر گئی تھی۔

"مردود۔" رشید احمد چیخے۔

"بدتمیزو۔" جمیلہ نے دونوں کی ہاتھا پائی پر حلق پھاڑا۔

بمشکل ریحان سے کلائی چھڑائی۔ دانتوں کے نشان پڑ گئے تھے اور کہیں کہیں سے خون رس رہا تھا۔ کلائی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے خشمگیں نگاہوں سے جینا کو دیکھا۔

اور ہاتھ سے گال پر آئی خراش کو ملتے ہوئے جینا کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

"ذلیل۔" جینا غرائی۔

"کمینی!" ریحان چنگھاڑا۔

رشید احمد غصے سے کرسی دھکیل کر پھینکتے اُٹھ گئے۔ دونوں پر غصہ جھاڑتے وہ کمرے سے نکل گئے۔ جمیلہ بیگم نے سر دونوں ہاتھوں پر گرا لیا۔

وہ دونوں سے عاجز آ گئی تھی۔

جینا نے گال سے ہاتھ ہٹا کر دیکھا۔ خراش سے خون نکل کر ہتھیلی کو لگ گیا تھا۔

بس پھر کیا تھا۔ زور زور سے روتے ہُوئے وہ ریحان کو کوسنے لگی۔

"اللہ کرے مر جائے تُو۔"

"تُو کیوں نہ مرے۔ جان چھوٹ جائے میری۔" ریحان نے کلائی کو پھر دیکھا۔

دونوں ایک دوسرے کو بددعائیں دینے لگے۔

"بکواس بند کرو۔" جمیلہ چیخیں۔

"پہلے اپنی صاحبزادی کو کہیں۔" ریحان جینا پر جھپٹنے کو تھا۔ "بدکلامی کر رہی ہیں۔"

"تم تو خوش کلامی کر رہے ہو نا۔" جینا نے پھر گال پونچھا۔

"چپ رہو بدتمیز کہیں کی۔"

"تم چپ رہو۔ بدتمیز تم ہو۔"

"خبردار جو میرے ساتھ کبھی کلام کیا تو!"

"میں تم جیسے ذلیل انسان کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتی!"

"جان سے مار ڈالوں گا کبھی بات کی تو۔"

"بات کرنے کی اب حسرت ہی رکھو گے دل میں' میرا نام بھی جینا ہے اور بات کی پکی ہوں۔"

"میں بھی ریحان ہوں' جو بات کہہ دی پتھر پر لکیر۔"

"بس ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے!"

دونوں چپ ہو گئے۔ جمیلہ ان کی چخ چخ سنتی رہیں۔ پہلے ریحان میز سے اٹھا۔ اس کے بعد جینا بھی اٹھ گئی۔

دونوں میں بول چال بند ہو گئی۔ دونوں ایک دوسرے سے سنجیدگی سے روٹھ گئے۔

جمیلہ نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ لڑتے مرتے رہتے تھے۔ پھر صلح بھی خود ہی کر لیتے تھے۔ ان کی بک بک میں وہ آنا ہی نہ چاہتی تھی۔

لیکن

اس دفعہ

واقعی

دونوں سنجیدگی سے روٹھ گئے۔ ایک دوسرے سے بولنا بند کر دیا۔ سامنا کرنے سے کترانے لگے۔ جہاں ریحان بیٹھا ہوتا جینا وہاں نہ آتی اور جہاں جینا بیٹھی ہوتی ریحان اُدھر نہ آتا۔ اماں نے شکر کیا۔ کان ٹھنڈے ہوئے۔ روز روز کی بک بک آپوں آپ ختم ہو گئی۔

ابا کے بھی کچھ ایسے ہی تاثرات تھے۔ چند دن کی بات تھی ان کے خیال میں۔ یہ چند دن بھی غنیمت تھے جو بغیر لڑائی جھگڑے کے گزر جاتے۔

لیکن—— چند دن پھیلتے چلے گئے۔ جینا اور ریحان میں پکی پکی کٹی ہو گئی۔ ایک گھر میں رہتے ہوئے ایک دوسرے سے قطعی فرار ممکن تو نہ تھا لیکن گریز ہو سکتا تھا۔

لیکن اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے سے غافل بھی نہیں تھے۔ ریحان گھر میں داخل ہوتا۔ کمروں میں یا صحن میں جینا نظر نہ آتی تو جلدی سے پوچھتا۔ "اماں جینا کہاں ہے؟"

اسی طرح ریحان کو کبھی گھر آنے میں دیر ہو جاتی تو جینا چکر پہ چکر ڈیوڑھی کے لگاتی۔ ہاں جب وہ آ جاتا تو چپکے سے اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ دونوں ایک دوسرے کے

کام بھی کرتے تھے۔ ہاں کام اماں یا نوکرانی کی آڑ لے کر کرتے۔

جینا دیکھتی کہ ریحان سائیکل پکڑے باہر نکل رہا ہے تو بلند آواز میں کہتی۔

"اماں فلاں چیز کی ضرورت ہے بازار سے منگوا دیں۔"

اماں وہاں ہوتیں یا نہ ہوتیں ریحان وہ چیز ضرور لے آتا اور لاپروائی سے پھینک دیتا۔ جینا بغیر کچھ کہے اٹھا لیتی۔ اسی طرح ریحان کو پینٹ استری کروانا ہوتی یا قمیص وہ اِدھر اُدھر لیے لیے پھرتا۔ نوکرانی سے کہتا۔ "تم بھی بالکل گئی گزری ہو خالہ استری کرنا ہی سیکھ لیتیں۔" کبھی اماں سے کہتا۔ "استری کر دیں—— ابھی پہننا ہے۔" وہ کپڑا رکھ دیتا۔

اور—— جینا خاموشی سے اٹھا کر لے جاتی۔ استری کر کے اسی جگہ رکھ دیتی—— ریحان اٹھا لیتا۔ ایک دو اور پھر تین ہفتے گزر گئے۔

دونوں میں صلح نہ ہوئی۔ مستقلاً دونوں ایک دوسرے سے روٹھ گئے۔ کبھی کبھی اماں دونوں کو ڈانٹتیں۔ دونوں کی خاموشی نے گھر کی فضا مکدر کر ڈالی تھی۔

لیکن

دونوں ضد کے پکے تھے۔ بولنا تو کجا ایک دوسرے کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ دونوں اپنی اپنی ذات کے خول میں مقید ہو گئے تھے۔

انہی دنوں ریحان کا انجینئرنگ کا رزلٹ آ گیا۔ وہ پاس ہو گیا تھا۔ نتیجہ دیکھتے ہی گھر کی طرف بھاگا۔

شروع ہی سے اس کی عادت تھی کہ رزلٹ کی نوید سب سے پہلے جینا کو سناتا تھا۔ وہ اس سے لپٹ جایا کرتی۔ وہ بھی اسے پیار کرتا۔ پھر باقی گھر والوں کی باری آتی۔

وہ خوشی خوشی گھر آیا۔ صحن میں تخت پر اماں بیٹھی تھیں اور ان کے پہلو میں جینا بیٹھی کسی کپڑے کی کڑھائی کر رہی تھی۔

بے اختیارانہ ریحان کا جی چاہا کہ رزلٹ کی نوید جینا کو سنا کر اسے پیار کرے۔

لیکن

اس نے ایسا نہیں کیا۔

اس سے ایسا ہو ہی نہیں سکا۔

وہ مغموم ہو گیا۔ اس کے چہرے سے خوشیوں کے پر تو جیسے کسی نے اُچک لیے۔ بے دلی سے اماں کے پاس بیٹھتے ہوئے رندھی آواز میں بولا۔ "اماں میں پاس ہو گیا ہوں۔"

جینا کو جیسے دھچکا لگا۔ سُوئی دانتوں میں دبائے وہ سُن ہو گئی۔"

"سچ؟" اماں نے اسے لپٹا کر پیشانی چُوم لی۔

"ہاں۔ اچھے نمبروں سے پاس ہوا ہوں۔" اماں نے ہاتھ پھیلا کر آسمان کی طرف دیکھا۔

پھر

جینا کی طرف مڑیں۔

جینا نے رُخ پھیر لیا۔ سُوئی کپڑے میں اٹکائی۔ اور کود کر تخت سے اُتر گئی۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی تھی۔

ریحان کا دل بُرا ہوا۔ رونا سا آگیا۔ "کیا تھا جو جینا مبارک ہی کہہ دیتی۔ اسی طرح صلح ہو جاتی۔" وہ سر جھکائے سوچ رہا تھا۔

اور

اپنے کمرے میں جینا بستر پر اوندھی گر کر ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جو ریحان نے اسے یوں نظر انداز کیا تھا۔ کیا تھا جو وہ ہمیشہ کی طرح یہ خبر اسے سنا دیتا۔ آج ہی تو موقع تھا۔ صلح ہو جاتی۔ بلک بلک کر روتے ہوئے جینا سوچ رہی تھی۔

اس واقعے نے غیر محسوس طریق سے خفگی کو اجنبیت میں ڈھال دیا۔ دونوں ایک دوسرے سے زیادہ ہی کترانے لگے۔

لیکن

جینا نے ریحان کے پاس ہونے کی منتیں مان رکھی تھیں۔ رو دھو کر دل ہلکا ہوا تو خوشی خوشی چڑھاوؤں کی تیاری کرنے لگی۔ ریحان سے چھپ چھپ کر بغیر اسے جتلائے وہ اس کی کامیابی کی منتیں پوری کرتی رہی۔ ریحان کی عدم موجودگی میں اس نے کامیابی پر خوب ہی خوشیاں منائیں۔

ریحان نے بھی حسب سابق اپنے پاس ہونے کی خوشی میں جینا کے لیے تحفہ خریدا لیکن اسے خود نہیں دیا۔ اماں کو دے دیا۔ "جینا کو دے دیں۔ میں اپنے پاس ہونے پر ضرور اسے کچھ نہ کچھ دیا کرتا ہوں۔"

اماں نے موقع مناسب سمجھا بولیں۔ "خود ہی دے دونا۔ صلح کر لو بہن سے!"

"نہیں"

"کیوں؟"

"بس"

"یہ کیا بات ہوئی۔ تمہاری چھوٹی بہن ہے۔ تم ہی منالو اسے!"

"میں نہیں مناؤں گا۔"

"یوں ہی روٹھے رہو گے؟"

"کیا فرق پڑتا ہے؟"

"حد ہو گئی۔"

اماں کے سمجھانے پر بھی وہ جینا کو منا لینے پر آمادہ نہ ہوا۔

پھر جینا نے ہمیشہ کی طرح اس کے لیے تحفہ خریدا اور اماں کو دیتے ہوئے بولی:

"ریحان کو دے دیں۔"

اماں نے اسے بھی وہی کہا جو ریحان سے کہا تھا۔ "خود دے دونا۔ منالو بھائی کو بڑا ہے تم سے۔"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"بس"

"بری بات ہے۔ یُوں تو تم ایک دوسرے سے بالکل ہی کٹ جاؤ گے۔"

"تو کیا ہُوا؟"

"اچھا تو کچھ ہوا ہی نہیں؟"

"نہیں!"

"جو مرضی ہے کرو۔"

"ٹھیک ہے!"

اماں نے دونوں کو چیزیں دے دیں۔ ریحان نے جینا کا تحفہ لے لیا۔ اور جینا نے ریحان کا۔ ہاں ان تحفوں کو آنکھوں سے لگاتے ہوئے دونوں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

دونوں ضد کے پکے تھے۔ آن کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ ریحان چاہتا تھا جینا پہل کرے اور جینا چاہتی تھی ریحان نیچا ہو جائے۔ بات لمبی ہی ہوتی گئی۔

اماں بے چاری اپنے طور پر کوشش کرتی رہیں۔ کئی بار دونوں کو قریب بٹھایا——

سمجھایا۔ بُرا بھلا کہا لیکن اثر دونوں ہی نے نہ لیا۔ وہی پہل کرنے کا مسئلہ تھا۔

انہی دنوں جینا کے لیے راشد کا رشتہ آگیا۔ اچھے گھرانے کا خوبصورت اور کماؤ لڑکا تھا۔ رشتہ موزوں تھا۔ اماں ابا اور ریحان اس معاملے میں پوری ذمہ داری سے دلچسپی لے رہے تھے۔ ریحان نے کئی جگہ سے راشد کا پتہ بھی کرایا تھا۔ پوری پوری تسلی کر لی تھی۔ روز ہی ماں بیٹا اور باپ بیٹھ کر اس رشتے کی باتیں کرتے۔ جینا چپکے چپکے سنتی۔ ریحان کے لیے اس کے دل میں بڑی عقیدت، بڑی محبت جاگ اٹھتی۔ اس کے سکھ اور سکون کے لیے وہ کتنی پیاری پیاری باتیں کرتا تھا۔

رشتہ طے ہوگیا۔

راشد دوبئی میں ملازم تھا۔ ایک ماہ کی چھٹی آیا تھا۔ شادی کر کے بیوی کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔

وقت کم تھا اور کام زیادہ۔ معاملے کو طول دینا مناسب نہ تھا۔ تھوڑے وقت ہی میں تیاری کرنا تھی۔ ریحان نے دوڑ دھوپ میں دن رات ایک کر دیئے۔ کہیں چیزیں لا رہا ہے۔ کہیں آرڈر دینے جا رہا ہے۔ کہیں پیسہ بینک سے نکلوا رہا ہے۔ کہیں کھانے پینے کا سامان اکٹھا کر رہا ہے۔

وہ سارا سارا دن بھاگ دوڑ کرتا۔ اور شام کو تھکا تھکا نڈھال سا آ کر بستر میں گر جاتا۔ ایسے میں جینا کا کلیجہ مسلا جاتا۔ جی چاہتا بھائی کی پیشانی چوم لے۔ اس کو گرم گرم چائے اپنے ہاتھوں سے پلائے۔ اس کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلائے۔

لیکن

یہ سب کچھ خیالی تھا۔ عملی نہ ہو سکا۔

اماں نے ان دنوں بھی دونوں میں صلح کروانے کی کوشش کی۔ جینا کو سمجھایا لیکن وہ بولی۔ "ریحان کیوں نہیں بلاتا مجھے۔ اسے پتہ بھی ہے کہ میں اب چند دنوں کی مہمان ہوں۔ دو ماہ سے نہیں بول رہا میرے ساتھ۔"

وہ پھپ پھپ رونے لگی۔ ماں کا دل بھی بھر آیا۔ دونوں نے رو دھو کر دل کی بھڑاس نکال لی۔

پھر

اماں نے حیلے حیلے ریحان سے بھی کہا۔ "تم ہی منا لو بہن کو۔"

"وہ کیوں نہیں بولتی پہلے۔ اسے پتہ بھی ہے کہ ہم سے جدا ہو رہی ہے۔"

ریحان نے دل گرفتہ سی آواز میں جواب دیا اور اٹھ کر چلا گیا۔

اماں بہت پریشان تھیں۔

لیکن

دونوں ہی ان کی نہ سنتے تھے۔

شادی کے دن قریب آ رہے تھے۔ جینا اداس رہنے لگی تھی۔ کبھی تو رو رو کر بے حال بھی ہو جاتی۔ ریحان دیکھتا لیکن ایسے موقعے پر اِدھر اُدھر ہو جاتا۔ اپنے کمرے میں جا کر دروازے بند کر لیتا اور بے تابی سے ٹہل ٹہل کر پریشان ہوتا رہتا۔

کبھی کبھی اس کا دل سیال سی شے بن جاتا۔ اس کا جی چاہتا چیخ چیخ کر رو دے۔

جینا تو اس سے تین سال چھوٹی تھی۔ جو اب اس سے بچھڑ رہی تھی۔ کیا تھا جو اس کا مان رکھ لیتی۔ اُسے بلا لیتی۔ اسے مخاطب کر لیتی۔ ایک بار ہی ریحان کہہ دیتی۔ ریحان پان ہی کہہ دیتی۔ بڑ کنا ہی کہہ دیتی۔

لیکن

ادھر بھی تو یہی بات تھی نا۔ جینا پہروں یہی باتیں سوچتی۔ بڑا بھائی مسکرا کر دیکھ ہی لیتا۔ جینی چھینی ہی کہہ دیتا۔ چڑانے ہی لگتا۔

شادی کا دن آگیا۔

ریحان کی دوڑ دھوپ آج انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ تھک چکا تھا۔ نڈھال ہو گیا تھا۔ لیکن کام کر رہا تھا۔ آج اس کی لاڈلی بہن کی شادی تھی۔ جو اسے دنیا میں سب سے عزیز اور سب سے پیاری تھی۔

لیکن

جو اس سے روٹھی ہوئی تھی۔

اور

جس سے وہ روٹھا ہوا تھا۔

سارے مرحلے طے ہوگئے۔ رخصتی کا وقت آگیا۔ ریحان کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ وہ کئی دفعہ اس کمرے میں گیا تھا جہاں جینا دلہن بنی بیٹھی تھی۔ لیکن وہ اس کے قریب نہ جا سکا۔ یہی امید لیے اس کے کمرے میں گیا کہ جینا آج تو کٹھور پن کو ختم کر دے گی۔ روتی

روتی اس کے گلے لگ جائے گی۔ اسے منالے گی۔ معاف کر دے گی۔ معافی مانگ لے گی۔

جینا کے آنسو بھی نہ تھم رہے تھے۔

"اللہ جینا بس بھی کرو۔ سارا میک اپ تمہارے آنسوؤں نے خراب کر دیا ہے۔"

"اتنا اچھا دولہا ملا ہے رونے کی کیا بات۔"

"سب لڑکیاں اس دن کے خواب دیکھتی ہیں۔"

"تم خوش قسمت ہو۔ راشد بہت اچھا ہے۔"

"رونا بند کرو۔"

"اس طرح رو رو کر بدشگنی نہ کرو۔"

"جینا کے گرد بیٹھی سہیلیاں اور رشتہ دار عورتیں اس کے یوں رونے پر تبصرہ کرتے ہوئے تسلیاں دے رہی تھیں۔ لیکن کوئی بھی تو نہ جانتا تھا کہ اس طرح پھوٹ پھوٹ کر وہ کیوں رو رہی ہے؟"

لیکن

ریحان ارد گرد منڈلاتا رہا۔ اس کے قریب نہیں آیا۔ قدموں کی ہر آہٹ پر جینا نے سر اٹھا کر دیکھا لیکن مایوس ہو گئی۔

وہ روتی رہی

اور

ریحان آنسوؤں کی تلخی حلق میں اتارتا رہا۔

رخصتی کے وقت جینا نے رو رو کر پچھاڑیں کھائیں۔ بمشکل ابا اور چچازاد بھائیوں نے گاڑی میں بٹھایا۔ اس وقت ریحان نے بے اختیارانہ اسے پیار کر لینے کی خواہش محسوس کی۔ وہ گاڑی کے قریب آیا۔

جینا منہ سر ڈھانپے روئے جا رہی تھی۔ رشتے دار عزیز باری باری اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دے رہے تھے۔ ڈرتے ڈرتے ریحان نے بھی اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس کے سر پر رکھ دیا۔

پھر

اس کا جی بھر آیا۔ اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ لوگوں کا بے انتہا رش تھا۔ وہ بھیڑ سے بمشکل نکلا۔ اور دُور جا کھڑا ہوا۔

گاڑی چلی گئی۔ براتی اور مہمان ابھی وہیں کھڑے تھے کہ ریحان اپنے کمرے میں بھاگ آیا۔ دروازے کی چٹخنی چڑھا کر وہ بستر پر گر گیا۔

اور

پھر

تکیوں میں منہ دے کر بلک بلک کر رو دیا۔ وہ اتنا رویا۔ اتنا رویا کہ تکیہ بھیگ گیا۔

جینا راشد کے ساتھ دوسری شام واپس آئی تو خوش تھی۔ جیون ساتھی اچھا ملا تھا۔ سہاگ رات کا حسن اس کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔ ریحان نے کچھ فاصلے سے اسے دیکھا۔ اس کی خوشی سے وہ خوش ہُوا۔ سکون اور اطمینان کا گہرا سانس لیا۔

جینا نے بھی ریحان کو دیکھا۔ آج وہ بہت خوش تھی اور اس نے دل میں عہد کر لیا تھا کہ ریحان اس کی طرف دیکھ کر صرف مسکرا بھی دیا تو وہ دوڑ کر اس سے لپٹ جائے گی۔ پرائی ہو کر ایک دن ہی گزارا تھا تو اسے احساس ہوا تھا کہ اپنا بھائی اسے کتنا پیارا اور کتنا عزیز ہے۔

لیکن

ریحان مسکرایا نہ جینا دوڑ کر اس سے لپٹی۔ دونوں کے درمیان نہ معلوم سی غیریت حائل ہو گئی تھی۔

گہما گہمی کے دن گزر گئے

پھر

راشد کی چھٹی ختم ہو گئی۔ راشد سے ریحان کی خاصی دوستی ہو گئی تھی اور اسی دوستی کے واسطے سے اس نے راشد کو بار بار ایک ہی بات کہی۔

"جینا میری لاڈلی بہن ہے۔ بڑے نازوں کی پلی ہے اسے کبھی دکھی نہ ہونے دینا۔"

اور ___ وہ دن تو دونوں کے صبر کی انتہا کا دن تھا۔ راشد اور جینا دوبئی جا رہے تھے۔ میکے اور سسرالی عزیز ایئرپورٹ پر جمع تھے۔ جینی اپنوں میں گھری تھی۔ امی اور ابا سے مل مل کر رو رہی تھی۔

ریحان کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ ویران تھا۔ اداسی اس کی آنکھوں میں اتر رہی تھی۔ حلق میں پھندے پڑ رہے تھے۔ لیکن قدم جیسے اپنی جگہ جکڑے گئے تھے۔ فلائیٹ کی روانگی کا اعلان ہُوا تو بے اختیار ریحان نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ جینی

اور راشد لاؤنج کی طرف بڑھے۔ راشد ریحان سے کئی بار گلے ملا اور ریحان نے ہر بار رندھی آواز میں یہی کہا۔ ”جینا کو کوئی تکلیف نہ ہونے دینا راشد۔ میری بڑی عزیز بہن ہے۔“

دُعاؤں کے سہارے اور آنسوؤں کی نمی میں دونوں اندر چلے گئے۔

جہاز کی طرف جاتے ہوئے جینا نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی آنسوؤں سے دُھندلائی آنکھیں ریحان پر مرکوز تھیں۔ ریحان کی آنکھیں بھی گیلی ہو رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔

جینا نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا۔ راشد اسے سہارا دیتے ہوئے جہاز کی طرف بڑھنے لگا۔

پھر

زندگی اپنی ڈگر پر چلنے لگی۔ اک لڑکی کے سہانے خواب پورے ہو گئے۔ ہر آسائش، گھر اور ٹوٹ کر چاہنے والا شوہر ملا تو خوشی سے جھوم جھوم گئی۔

لیکن

کبھی کبھی

وہ بے طرح اداس ہو جاتی۔ ساری خوشیاں جیسے ڈسنے لگتیں۔ اُداسی چھا جاتی۔ آنکھیں بھر آتیں۔ ریحان اسے بے طرح یاد آنے لگتا۔ وہ گھنٹوں چپ رہتی۔ چھپ چھپ کر روتی۔

راشد بڑی محبت سے اس اُداسی کا سبب پوچھتا۔

وہ کچھ نہ کہتی۔

لیکن جب یہ اداسی بڑھنے لگی تو راشد نے پوچھا۔ ”کیا تم یہاں خوش نہیں ہو جینا؟“

وہ اس کے کندھے سے سر لگا کر بے اختیار ہو کر رو دی۔ اور پھر ساری بات اسے بتا دی۔

راشد کے لیے یہ بات اتنی اہم نہ تھی۔ پھر بھی اس نے کہا۔ ”پگلی۔ تم چھوٹی ہو۔ تمہیں بڑے بھائی کا مان رکھنا چاہیے۔ بھائی بہنوں میں انا کا مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔“

پھر وہ اسے ملائمت سے سمجھاتا رہا۔

”اچھا۔“ وہ آنسو پونچھ کر بولی۔ ”ہم اگلے ماہ پاکستان جا رہے ہیں نا؟“

”ہاں۔“

”میں جاتے ہی ریحان کو منا لوں گی۔“

”اب کی نا عقل کی بات!“

اس نے واقعی فیصلہ کر لیا کہ جاتے ہی ریحان کو منا لے گی اس سے لپٹ جائے گی۔ اسے پیار کرے گی۔

وہ اب خوش رہنے لگی تھی۔ سارا دن چہکتی پھرتی۔

اس نے ریحان کے لیے بہت سارے تحفے خریدے۔ اس کی پسند کا اسے علم تو تھا ہی۔ ایک ایک چیز محبت، عقیدت اور شوق سے خریدی۔

وہ دن گننے لگی۔ جب وہ پاکستان جائے گی۔ اپنے بھیا کو منائے گی۔ اس سے لپٹ جائے گی۔ اسے پیار کرے گی۔ وہ دن کتنا سہانا۔ کیسا پیارا ہو گا۔

لیکن ___ لیکن ___ آج صبح ___ جب وہ پاکستان پہنچی۔ لاہور پہنچی۔ اپنے گھر پہنچی تو ___ اس کا پیارا بھائی، عزیز ترین دوست، دکھ سکھ کا ساتھی منوں مٹی تلے ابدی نیندی سو رہا تھا۔

وہ

اسے منا نہ سکی

اس سے لپٹ نہ سکی

اسے پیار نہ کر سکی۔

بڑا کٹھور، بڑا سنگدل نکلا وہ۔ ذرا سی خطا کی اتنی بڑی سزا دے گیا۔ اتنا ظالم تھا۔ ایسا سخت انتقام لیا۔ اتنا موقع بھی نہ دیا کہ وہ اسے آخری بار دیکھ ہی لیتی۔

اس کی ٹھنڈی پیشانی پر آخری بوسہ ہی دے لیتی۔

اسے دل کی تسلی کے لیے منا ہی لیتی۔

اب

اسے غش پہ غش آ رہے تھے۔ جب بھی ہوش میں آتی، اردگرد بیٹھے لوگوں سے فریاد کرتی، تڑپ تڑپ کر پوچھتی۔

”میں اسے کیسے مناؤں ___ کوئی بتائے میں اسے کیسے مناؤں ___ لوگو ___ میں اپنے روٹھے بھیا کو کیسے مناؤ ___ کیسے مناؤں ___ کیسے مناؤں؟“

اِنتقام

"کچھ سُنا آپ نے۔"

"کیا؟"

"قیصر تیسری شادی کر رہا ہے۔"

"ہاں یہ حقیقت ہے؟"

"ہائے اللہ کیا ہو گیا اس مرڈود کو؟"

"اسے کیا ہو گا ہوا تو فرحانہ کو ہے۔"

"فرحانہ—"

"ہاں وہی تو یہ شادی کروا رہی ہے—"

"فرحانہ—"

"ہاں بھئی—"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہی تو اچنبھے کی بات ہے۔ فرحانہ خود پیش پیش ہے۔"

"نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ایک سوت کم تھی جو دوسری لا رہی ہے۔ آپ نے غلط سنا ہو گا۔ کوئی عورت خوشی سے یہ کام نہیں کر سکتی۔ قیصر خود ہی کونسا کم ہے۔ رنگین مزاج ہے' روپے پیسے کی کمی نہیں' شادی پہ شادی رچا رہا ہے۔ ابھی ڈیڑھ بھی تو نہیں ہوا جو حنا کو دلہن بنایا تھا۔ اب پنکی سے شادی کر رہا ہے۔ سنا ہے بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔"

"حنا کم تھی کیا؟ امیر بھی بہت تھی—"

"خیر کم تو فرحانہ بھی نہ تھی— دو مربعے زمین تو اسے جہیز کے علاوہ ملی تھی—"

"زمینوں اور پیسوں کے لیے وہ تھوڑا ہی شادیاں رچاتا ہے۔"

"کہا نا رنگین مزاج ہے۔"

"رنگینیاں یوں بھی تو بھر سکتا ہے۔ اس کی گرل فرینڈز کی بھی تو بھرمار ہے۔ دولت کے ساتھ خدا نے شکل وصورت بھی تو دے رکھی ہے۔ لڑکیاں بھی تو پروانوں کی طرح اردگرد منڈلاتی رہتی ہیں۔"

"پنکی سے بھی عشق لڑایا ہو گا—"

"اس نے نہیں فرحانہ نے۔"

"ہائے اللہ آپ کیسی باتیں کرتی ہیں۔ یہ بھی بھلا ماننے کی بات ہے۔ فرحانہ کے لیے حنا کا وجود ہی کیا کم تھا جو وہ پنکی کو بھی لا رہی ہے۔ ماننے کی بات نہیں۔"

"مان جاؤ نا— یہ شادی فرحانہ کی ہی دوڑ دھوپ کا نتیجہ ہے۔"

"یقین نہیں آتا—"

"ہے تو ناقابل یقین لیکن حقیقت ہے— دیکھ لینا— اس کا تو پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہا۔ کل میں گئی تو مجھے ساری چیزیں دکھائیں جو پنکی کے لیے اس نے بنوائی ہیں۔"

"واقعی—"

"سچی— ایسے شاندار کپڑے اور چم چم کرتا زیور— اور تو اور وہ تو اس کا کمرہ بھی یوں سجا رہی ہے جیسے سوکن نہیں کوئی انتہائی عزیز ہستی آ رہی ہے۔"

"عجیب بات ہے۔"

"ادھر حنا کا بُرا حال ہے۔ رنگ و روپ بکھر گیا ہے۔ رو رو کر بُرا حال کر لیا ہے۔ سنا ہے قیصر سے خوب لڑائی ہوئی ہے۔"

"وہ تو ہونا ہی تھی۔ اس کم بخت کو بھی تو دیکھو شادی پہ شادی رچائے جا رہا ہے۔ ایک کے بعد دوسری تو چلو مرد کر ہی لیتے ہیں لیکن یہ دوسری کے بعد تیسری۔"

"حالانکہ دوسری بھی محبت کی شادی تھی۔"

"بالکل۔"

"محبت کا ڈھونگ ہی ہوتا ہے۔"

"لیکن اسے تو اور کوئی ضرورت بھی نہیں۔ فرحانہ کے دو بچے ہیں' پھول ایسے پیارے پیارے۔ حنا کی بیٹی بھی سال بھر کی ہے۔ خدا نے دولت' اولاد' حسن' ہر چیز سے نوازا ہے پھر تیسری شادی کی تُک۔"

"بھئی کہا ہے نا— یہ فرحانہ خود کروا رہی ہے۔"

"کیوں—؟"

اس کیوں کا جواب مختصر بھی تھا طویل بھی— عورتیں آپس میں تبادلہ خیال کر رہی تھیں۔ اس کیوں کا سرا ڈھونڈنے کی کوشش میں تھیں۔ محلے میں اس تیسری شادی کا چرچا تھا۔ جب بھی دو چار عورتیں جمع ہوتیں اس شادی کا چرچا ضرور ہوتا— یہ شادی جو اگلے جمعہ کو ہو رہی تھی اور جس کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔

اس لین میں سفید ماربل اور سنہری جنگلوں والی کوٹھی قیصر علی خاں کی تھی۔ یہ کوٹھی اپنے مکینوں کی جاہ و حشمت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ قیصر بے شمار زمینوں اور باغات کا مالک تھا۔ وجیہ و شکیل قیصر چھ سات برس پہلے لاء کی تعلیم مکمل کر کے انگلینڈ سے واپس آیا تھا۔ لاء کر کے پریکٹس کرنا مقصود نہ تھی۔ روپیہ پیسہ بہت تھا۔ یہ ڈگری تو اس نے تعلیم کا خانہ مکمل کرنے کے لیے حاصل کی تھی۔ شہر میں سکونت اختیار کر کے شغل کے طور پر امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس شروع کیا تھا لیکن قسمت یاور تھی۔ یہ کاروبار خوب چل نکلا تھا۔

فرحانہ اور قیصر چچازاد تھے۔ بچپن ہی سے دونوں منسوب تھے۔ قیصر اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ چلا گیا تو فرحانہ کی حسین آنکھوں میں انتظار کی کیفیت جمود کا روپ دھار گئی۔ چار سال وہ باہر رہا اور فرحانہ اس کی آمد کے لیے چشم براہ رہی۔ کومل سی سنہری رنگت والی اس لڑکی نے اپنے ہونے والے خدائے مجازی کو تو جیسے سچ مچ ہی کا خدا مان لیا تھا۔ اس پر اندھا دھند اعتماد تھا۔ محبتیں شاید ایسے ہی اعتماد کی متقاضی ہوتی ہیں— یہی وجہ تھی کہ جب بھی کوئی باہر سے آتا اور قیصر کے متعلق بتاتا کہ کس طرح اس کے شب و روز حسیناؤں کے جلو میں گزر رہے ہیں تو فرحانہ کو کبھی یقین نہ آتا۔

"وہ میرا ہے اور میں اس کی— ہم دونوں کے درمیان کوئی نہیں' کوئی نہیں—" وہ دل ہی دل میں کہتی۔ اسے پکا یقین تھا کہ قیصر کے من کی وہی رانی ہے۔

لوگ بے پر کی اڑاتے ہیں۔ نوجوان حسین مرد کے ساتھ لڑکیاں ہنس بول بھی لیں تو بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے۔

اعتماد کا جانے یہ کون سا روپ تھا۔ یقین کی کون سی منزل تھی جو فرحانہ بددل نہ ہوتی تھی۔

ایک بار تو بڑی وحشت ناک سی خبر آئی— "قیصر نے مس پرتھ سے شادی کر لی ہے۔"

یہ خبر بم کا ایک دھماکہ تھی جس سے والدین کے ہوش اڑ گئے۔ فرحانہ کے ابو نے بچپن کی نسبت اسی غصے اور وحشت میں توڑ دینے کا عزم کر لیا۔ اپنے بھائی کو بلایا۔

"لڑکے کے لچھن شروع سے اچھے نہ تھے۔ اب اس نے جو گل کھلایا تمہیں بھی معلوم ہے۔ ایسی صورت میں میں اس نسبت کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔"

بھائی بھلا کیا جواب دیتا— بیٹے کے متعلق کچھ کچھ سن گن تھی۔ یہ خبر خدا جانے سچی تھی یا نہیں۔ اس لیے صرف اسی قدر کہا۔ "فرحانہ میری بھی بیٹی ہے اگر تم اس کی بھلائی سوچتے ہو تو میں بھی اس کی بھلائی چاہوں گا۔"

نسبت شاید ٹوٹ ہی جاتی۔

لیکن

فرحانہ نے بڑا جرأت مندانہ قدم اٹھایا۔ اپنے اندھے اعتماد اور اپنے بھرپور یقین کے سہارے اس نے اپنی چچازاد کے ذریعے اپنے ابوامی کو کہلوا دیا۔ "قیصر جیسا بھی ہے میرا منگیتر ہے۔ میں اس منگنی کو نکاح کی طرح مضبوط و مستحکم سمجھتی ہوں—"

کافی دن گھر میں لے دے رہی۔ فرحانہ کے ابو اپنی بات پر اڑے تھے۔ فرحانہ ان کے سامنے تو بول نہ سکتی تھی۔ لیکن اپنے رویے سے اس نے جو تاثر دیا یہی تھا کہ قیصر کے سوا وہ کسی اور کو کبھی قبول نہ کر سکے گی۔

اور—

شاید اس کے معصوم اور بے لوث جذبوں ہی کی کشش تھی جو چند ماہ بعد ہی قیصر واپس آ گیا۔ وہ اکیلا ہی آیا تھا۔ دیارِ غیر کی کوئی خاتون اس کے ہمراہ نہ تھی۔

خاندان میں مسرت و انبساط کی لہریں ہلکورے لینے لگیں۔ فرحانہ کے ابو بھائی سے نادم تھے۔ بار بار کفِ افسوس مل کر ان سے معافی مانگ رہے تھے۔ فرحانہ کی خوشیوں

کا تو رنگ ہی اور تھا۔ حسین آنکھوں میں سجے سپنوں نے سنہری تعبیروں کا روپ دھار لیا تھا۔ اپنی محبت کی قوت اور استحکام پر اسے فخر محسوس ہوتا تھا۔

قیصر نے چار سال بعد فرحانہ کو دیکھا تھا۔ جب وہ گیا تھا تو وہ پندرہ سولہ سالہ الھڑ سی لڑکی تھی۔ یوں لگتا تھا وہ ایک خاکہ چھوڑ کر گیا تھا جس میں وقت نے جوانی کی پوری توانائیاں اور دلربائیاں بھر دی تھیں۔ سنہری رنگت اور حسین سیاہ آنکھوں والی یہ کانچ ایسی نازک لڑکی اس کے دل ودماغ پر اب پوری طرح مسلط ہو گئی۔ حسن پسند وہ شروع ہی سے تھا۔ فرحانہ کو ٹوٹ کر پیار کرنے لگا۔ اپنے سارے عشق اور محبتیں بھول گیا۔ اسے لگتا ہی نہ تھا کہ وہ دیارِ غیر میں ایک نہیں کئی حسیناؤں کی زلف گرہ گیر کا بیک وقت اسیر رہا ہے۔

فرحانہ پھولی نہ سماتی تھی۔ محبت عشق کی منزل کی جانب گامزن تھی۔ وہ قیصر کی پُراسرار اور خوبصورت شخصیت میں ایسی کھوئی کہ اپنے آپ کی بھی خبر نہ رہی۔ دونوں چچازاد تھے' منسوب بھی تھے اسی لیے محبت کی راہیں کٹھن تھیں نہ دشوار گزار۔ وہ جب چاہے جہاں چاہے مل سکتے تھے۔

چاندنی رات کا فسوں خیز غبار پھیلا تھا۔ لان میں مہکتے پھولوں کی خوشبوئیں ہوائیں چرائے پھرتی تھیں۔ بڑا سحر انگیز موسم تھا۔ باڑ کے قریب تناور درخت کی جھولتی شاخوں تلے قیصر اور فرحانہ کھڑے تھے۔

"فرحانہ تم نے مجھے جانے کیا کر دیا ہے— ؟" قیصر نے والہانہ انداز میں اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

فرحانہ اک اندازِ سپردگی سے بے دم سی اس کے بازوؤں میں سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "میں نے اپنے پیار کی زنجیروں میں تمہیں جکڑ لیا ہے قیصر— اگر تم چاہو بھی تو ان زنجیروں کو توڑ نہ سکو گے۔"

"کون کافر توڑے گا جانی۔" وہ بیخودی کے عالم میں بولا۔

"تمہارے متعلق بہت کچھ سنتی تھی لیکن— " فرحانہ الگ ہو کر کھڑی ہو گئی۔

"لیکن— "

"میں نے کبھی ان باتوں پر یقین نہیں کیا تھا۔ مجھے تم پر نہیں اپنی محبت پر اعتماد تھا— مجھے یقین تھا کہ تم میرے ہو اور میرے ہی رہو گے۔"

"دنیا کی کوئی طاقت اب ہمیں جدا نہیں کر سکتی۔ ہم چند دنوں تک اک مضبوط اور مستحکم بندھن میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جکڑے جا رہے ہیں— جانتی ہو نا۔"

قیصر نے اس کی ٹھوڑی کو چھوا۔ فرحانہ نے اپنی حسین آنکھوں کو اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں پھر سر جھکا لیا— وہ اس وقت بے حد مسرور تھی۔

شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ قیصر اور فرحانہ اب بھی اکٹھے ہی نظر آتے۔ شاپنگ کے لیے تو جیسے دونوں کا ساتھ جانا لازم و ملزوم تھا۔ شاپنگ کے ساتھ ساتھ ریستوران' ہوٹل اور کیفے میں بھی وقت گزرتا اور لانگ ڈرائیو بھی ہوتی—

محبتیں پروان چڑھ رہی تھیں— زندگی بھر ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کے وعدے ہوتے تھے' قسمیں کھائی جاتی تھیں' عہد و پیمان بڑے رنگین تھے۔

اس دن دونوں ریستوران میں ایک دوسرے میں کھوئے بیٹھے باتوں میں مصروف کافی پی رہے تھے۔ "فرحانہ میں تو اس تصور ہی سے جھوم اٹھتا ہوں کہ عنقریب ہم اپنی نئی زندگی کی ابتدا کر رہے ہیں۔"

"ہاں قیصر اپنی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت ہے۔ ہمارا اپنا گھر ہوگا۔ خوبصورت' شاندار— اس میں ہم دونوں اپنی رنگین و حسین دنیا بسائیں گے۔ کوئی پابندی نہیں ہوگی— کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی— میں اس گھر کو سپنوں کی طرح حسین بناؤں گی قیصر— "

"سفید ماربل اور سنہری جنگلوں والی کوٹھی ہمارے لیے ہے۔ بہت پیاری کوٹھی ہے— ہے نا— ابا جی تمہارے مہر میں لکھ دیں گے یہ کوٹھی— پیاری ہے نا— خوبصورت اور پیاری— "

"پیاری تو اس وقت لگے گی جب اس میں ہمارا پیار رنگ بھرے گا— "

"واقعی— میرا تو جی چاہتا ہے ان گنے چنے دنوں کو اپنی قوت سے دھکیل دوں اور وہ لمحہ لے آؤں جب ہم تم ایک ہو کر یہ گھر بسائیں گے۔"

"اس انتظار میں کلفت نہیں لذت ہے قیصر— "

"میں بیتاب ہوں۔"

وہ اس کی بات پر ہنس پڑی۔ قیصر کا جی چاہا ریستوران کے اسی گوشے میں اسے بازوؤں سے بھر کر پیار کر لے۔

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ جی بھر کر ارمان نکالے گئے۔ قیصر کے والدین تو خوشی کا یہ اظہار اس لیے بھی کر رہے تھے کہ ہاتھ سے نکلا

ہوا بیٹا راہِ راست پر آ کر ان کی خواہش اور مرضی کے مطابق گھر بسا رہا تھا۔

وہ حسین اور یادگار رات تھی۔ فرحانہ حجلۂ عروسی میں زرتار سی گٹھڑی بنی سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی۔ خواب گاہ قیصر نے خود سجائی تھی۔ روشنیوں اور سرخی مائل اندھیروں کا امتزاج بڑا ہی حسین تھا۔ ہر چیز چمک رہی تھی۔ ارمانوں اور تمناؤں کے رنگ نیارے تھے۔ قیصر آج بے پیے ہی مست تھا۔ قدم بہک رہے تھے۔ بڑا گھاگ بڑا تجربہ کار تھا پھر بھی معصوم اور ان چھوئے تاثرات جو فرحانہ کے دھک دھک کرتے دل میں بسے تھے ان پر دستک دیتے ہوئے وہ جھجک رہا تھا۔

سہاگ رات کا جوبن اور حسن قیصر نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ فرحانہ اس سے بے تکلف تھی لیکن آج کی رات وہ اس طرح شرما لجا رہی تھی کہ قیصر حیران ہو رہا تھا۔ لیکن یہی شرمانا لجانا رُوح کی گہرائیوں میں لطف و انبساط بن کر اتر رہا تھا۔ اس رات بھی دونوں نے زندگی کے حسین عہد و پیمان کیے۔ قیصر نے فرحانہ کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھتے ہوئے کہا۔ "جان ہم زندگی بھر ساتھ رہیں گے۔ ہم پیار کے اٹوٹ بندھن میں جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ پیار ہمیشگی کی تازگی کے لیے رہے گا — رہے گا نا — "

اور بند آنکھوں سے مسکراتی فرحانہ کا سر اثبات میں خود ہی ہل گیا۔ شادی کے چند دن بعد وہ اپنی نئی رہائش گاہ میں آ گئے۔ فرحانہ نے اس پناہ گاہ کو جس جس طرح سجانے کا سوچا تھا — وہ سوچ ہی رہ گئی — اسے قیصر کے سوا کسی بات کا ہوش ہی نہ تھا — قیصر خود بھی فرحانہ میں اس طرح کھویا تھا کہ گرد و پیش کی خبر ہی نہ رہی تھی۔ وہ اس شاندار سجی سجائی کوٹھی کی بجائے کسی جھونپڑی میں بھی ہوتے تو بھی اتنے ہی خوش ہوتے اس لیے کہ جنتیں تو ان کے اندر آباد تھیں۔ پیار و محبت کی اساس پر سچی جنتیں آباد ہوں تو ظاہری آسائشیں ہیچ ہی تو نظر آتی ہیں —

دن بیتے' راتیں ڈھلیں' رُتوں نے رُخ بدلے۔ قیصر و فرحانہ کی چہکتی مہکتی دنیا میں ایک ننھا سا پھول کھلا۔ اس پھول کی دلربائی اور مہک سے دونوں سرشار ہو گئے۔ نوید دونوں کے لیے صد ہا خوشیوں کا باعث بنا۔

پھر وقت کے ساتھ ساتھ ذمہ داریاں بٹتی گئیں۔ فرحانہ نوید کی دیکھ بھال میں لگ گئی۔ قیصر امپورٹ ایکسپورٹ کے چکروں میں کھو گیا۔ پیار کا بندھن قائم تھا۔ ہاں کبھی کبھی مصروفیات ہی کی کھینچا تانی سے اس میں تناؤ آنے لگا۔

اس شام قیصر نے کلب جانے کا پروگرام بنایا۔ وہ کئی ہفتوں سے کلب نہیں جا سکا تھا۔

"فرحانہ آج کلب چلتے ہیں۔ کھانا بھی ادھر ہی کھائیں گے۔ بہت بور ہو رہے ہیں — "

"لیکن — "

"لیکن کیا — ؟"

"نوید کو کہاں چھوڑیں گے ؟"

"آیا کے پاس۔"

"وہ آج گھر گئی ہے دو دن کی چھٹی لے کر۔"

"اور نوکر تھوڑے ہیں۔ فضلاں کے پاس چھوڑ جاؤ۔"

"نہیں قیصر — "

"کیوں۔"

"بچے کو سوائے آیا کے میں کسی کے پاس نہیں چھوڑ سکتی۔"

"حد ہو گئی — "

"تم نہیں جانتے نا — بچے کو رکھنا آسان کام تو نہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم کلب نہیں جاؤ گی۔"

"خاصے سمجھدار ہو — "

"لیکن میں جانا چاہ رہا ہوں۔"

"تو آپ چلے جائیے۔"

"تمہارے بغیر۔"

"کیا ہوا؟"

"یہ نہیں ہو سکتا۔"

"تو — "

فرحانہ قیصر کی بات پر جیسے جھوم اٹھی تھی۔ اک ادائے دلربائی سے اسے دیکھا اور بڑے فخر سے بولی۔ "جناب میرے بغیر ہل بھی نہیں سکتے۔ کیوں — "

"ہاں جانی — ہاں — " قیصر نے اسے بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگا لیا۔ پھر

گلہ کرتے ہوئے بولا۔ "تم نے تو مجھے پالتو جانور بنادیا ہے۔"

وہ قلقل کرتے چشمے کی طرح ہنس پڑی۔

اس دن قیصر کلب نہیں گیا لیکن رات کا کھانا دونوں نے باہر کھایا۔ بچے کو وہ اپنے ساتھ لے گئے۔

لیکن آئے دن یہی ہونے لگا۔ کبھی نوید کی طبیعت خراب ہوتی۔ کبھی مہمان آئے ہوتے اور کبھی فرحانہ کا موڈ ٹھیک نہ ہوتا۔

قیصر اُلجھ پڑتا۔۔۔ "تمہیں اب لگتا ہے کلب' ہوٹل سیر و تفریح سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔"

فرحانہ ادائے ناز سے کہتی۔ "یہ نہ سمجھ بیٹھنا مجھے یہ سب کچھ اچھا لگتا ہے۔"

"پھر۔۔۔"

"مہینے میں چار بار کی بجائے دوبار تو جاتی ہوں۔"

"چاروں ہفتے کیوں نہیں؟"

"بچہ۔۔۔"

قیصر نے غصیلی نظروں سے اسے دیکھا وہ ہنس پڑی۔ اس کی ٹھوڑی کو اپنی انگلی سے ہلاتے ہوئے بولی۔ "قیصر ہمارا گھر ہماری جنت ہے۔ مجھے جتنا سکون اور خوشی یہاں ملتی ہے کہیں بھی نہیں ملتی۔۔۔ کلب ہوٹل۔۔۔ ٹھیک ہے تفریح کے لیے اچھی جگہیں ہیں لیکن یہاں زندگی کتنی بناوٹی ہوتی ہے۔۔۔ اور۔۔۔"

"تقریر ختم کرو۔۔۔"

"ناراض ہوگئے۔۔۔"

"بچے کی خاطر تم نے مجھے درگزر کرنا شروع کردیا ہے۔"

وہ پھر معصومیت سے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "اللہ اپنے بچے ہی سے حسد کرنے لگے ہو۔"

وہ بڑبڑاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

فرحانہ لپک کر کوریڈور میں آئی۔ "کدھر جا رہے ہو۔"

"کلب۔"

"اکیلے۔"

"بہت ضروری ہے جانا۔۔۔"

"یہی سمجھ لو۔"

"تو رکو میں بھی چلتی ہوں تمہاری خوشی کی خاطر۔"

قیصر نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

الجھاؤ جنم لے رہے تھے۔ قیصر کی طبیعت اب الجھ رہی تھی۔۔۔ وہ آزاد پنچھی کی سی زندگی گزارنا چاہتا تھا۔۔۔ کوئی پابندی قبول نہ تھی۔۔۔ شروع شروع میں شادی کے چاؤ تھے۔ اب زندگی اصل روپ میں سامنے آرہی تھی۔ یہ بات نہیں کہ نوید قیصر کو عزیز نہ تھا لیکن وہ اکثر کہتا۔ "نوید نے ہمیں جکڑ دیا ہے اسے سال دو سال بعد آنا چاہیے تھا۔"

وہ تو نوید ہی کے جلدی دنیا میں آجانے سے کبھی کبھی برہم ہو جاتا تھا۔ اس دن فرحانہ نے اسے بتایا۔

"قیصر۔۔۔"

"ہوں۔۔۔"

"تم دس بجے گھر آسکتے ہو۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔"

"کسے۔۔۔"

"مجھے۔۔۔"

"کیوں۔۔۔"

"لگتا ہے۔۔۔"

وہ شرمگیں انداز میں مسکرا دی۔

قیصر چونکا۔۔۔ اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے تقریباً جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔۔۔ "یعنی۔۔۔ یعنی۔"

وہ ہولے سے سر ہلا کر رہ گئی۔۔۔ قیصر کا انداز اسے بھایا نہیں۔

"یعنی۔۔۔ یعنی۔۔۔ دوسرا بچہ۔۔۔" وہ بے چینی سے ہاتھ ملنے لگا۔

"اتنے پریشان کیوں ہوگئے ہو؟"

"پریشانی کی بات نہیں بھلا۔۔۔ ابھی نوید ہی کافی ہے۔۔۔"

وہ چند لمحے چپ رہی پھر اس کی طرف سے رُخ موڑتے ہوئے بولی:

"قیصر آپ کو ایسے نہیں کہنا چاہیے— دو بچے زیادہ تو نہیں۔اس کے بعد ہم پلاننگ کریں گے۔"

وہ کچھ اور نہ کہہ سکی۔

قیصر بھی چپ رہا۔ پھر جب وہ چپ چاپ دفتر چلا گیا۔وہاں سے گاڑی بھیج دی خود نہیں آیا۔ فرحانہ کے دل کو دھچکا سا لگا۔

دن گزرتے جا رہے تھے۔

فرحانہ کی طبیعت اس دفعہ کچھ زیادہ ہی خراب رہنے لگی تھی۔ کمزوری بہت تھی۔ رنگ خراب ہو گیا تھا۔ بیزاری سی رہتی۔ کھانے پینے اوڑھنے پہننے کو جی ہی نہ چاہتا۔

"یہ کیا حلیہ بنائے رکھتی ہو۔" قیصر غصے میں آ جاتا۔

"میری طبیعت بے حد خراب ہے۔" فرحانہ دکھ سے کہتی۔

"لگتا ہے اس بچے کے بعد تم بے ڈھنگی سی عورت بن جاؤ گی۔"

"کیا کہا جا سکتا ہے؟"

"تمہیں اپنے فگر کا خیال رکھنا ہو گا۔ سُست' کاہل اور بے ڈھنگی عورتیں مجھے بالکل پسند نہیں ہیں۔"

بعض اوقات وہ مذاق میں ایسی باتیں کہتا۔ فرحانہ جواب میں مسکرا دیتی۔ لیکن کبھی کبھی اس کی آواز انتہائی غصیلی ہوتی۔ فرحانہ دل مسوس کر رہ جاتی۔

قیصر فرحانہ میں دلچسپی کھو رہا تھا۔ کمزور وجود۔ بڑھا ہوا پیٹ اسے تو دیکھ کر بعض اوقات کراہت محسوس ہوتی۔ باہر آنا جانا فرحانہ نے کم کر دیا تھا۔

اور—

انہی دنوں—

قیصر نے اپنی دلچسپی کا دُوسرا مرکز تلاش کر لیا۔

حنا— جس کی شکل و صورت تو واجبی سی تھی لیکن بڑی سمارٹ' بڑی چاق و چوبند تھی— ایک بڑے باپ کی فیشن ایبل لڑکی تھی۔ گاڑی اس کے پاس تھی۔ بی اے کا امتحان دے کر فارغ تھی۔ پاس فیل ہونے کا غم نہیں تھا۔ سہیلیوں اور بوائے فرینڈز کے ساتھ گھومنا پھرنا' کلبوں ہوٹلوں میں جانا' گھر پر بڑی بڑی پارٹیاں دینا اس کا محبوب مشغلہ

تھا۔ قیصر اس کی پسند کا مرد تھا۔ دونوں جلد ہی بے تکلف ہو گئے۔

"قیصر تم جادوگر تو نہیں ہو—" ایک دن اس نے بڑے دلفریب انداز میں قیصر کو گھورتے ہوئے کہا۔

"کیوں— ؟"

"مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے— میرے کتنے فرینڈز تھے لیکن جانے کیا بات ہے ان سے ملنے کو اب جی نہیں چاہتا۔"

"اس لیے کہ اب تم میری ہو۔"

"لیکن—"

"کیا—"

"تم میرڈ ہو—"

"تو کیا ہوا۔ دوسری شادی پر پابندی تو نہیں۔"

"تمہاری بیوی—"

"مجھے اپنی بیوی کا ڈر نہیں— تمہارے والدین۔"

"اوہ۔ نہیں۔ میں جو چاہوں گی وہی ہو گا۔ میرے ڈیڈی میری راہ میں آنے کے قائل نہیں۔"

"اوہ حنا— تم نے میرے کتنے بار بانٹ لیے۔"

"سچ۔"

"ہاں۔"

قیصر نے حنا کی نازک سی کمر اپنے بازو کے حلقے میں لے لی۔ دونوں بے مقصد سڑکوں کی لمبائیاں ناپ رہے تھے۔ حنا قیصر کے دامِ محبت کی اسیر ہو چکی تھی۔ قیصر بھی اس حسینہ میں پوری طرح کھو گیا تھا

دونوں روز ہی ملتے۔ کبھی کلب میں' کبھی کہیں کافی پینے چلے جاتے۔ اب تو حنا اس کے دفتر میں اسے لینے آنے لگی تھی۔

حنا قیصر کو اپنی پسند کے معیار پر پُورا پا رہی تھی۔ شادی کرنا تھی تو قیصر سے۔ ورنہ اور کوئی آدمی اس کی نظر میں جچا ہی نہیں تھا۔ اپنا عندیہ اس نے اپنی نئی تہذیب کے دلدادہ والدین پر بھی ظاہر کر دیا۔

اس رات وہ ڈنر کھانے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں گئے۔ کھانے کے دوران حنا نے ہنس ہنس کر ساری روئیداد قیصر کے گوش گزار کر دی۔

"میں نے ڈیڈی سے کہہ دیا ہے۔" وہ اترا کر بولی۔

"کیا کہہ دیا ہے۔" قیصر چھری کانٹے کو روک کر بولا۔

"یہی کہ میں شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

قیصر کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ حنا خود ہی مسکراتے ہوئے بولی۔

"میں نے تمہارا غائبانہ تعارف کروا دیا ہے۔"

"پھر ــــ"

"ڈیڈی تم سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔"

"جوتے تو نہیں کھانا پڑیں گے؟"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر سنجیدگی سے بولی۔ "قیصر تم اپنی بیوی سے اجازت لے لو گے۔"

وہ چند لمحے چپ رہا۔ یوں لگا تھا نوالہ اس کے حلق میں اٹک گیا ہے۔ حنا سٹک لیتے ہوئے بولی۔ "کیوں ــــ ہمت نہیں ہے کیا؟"

"مجھے کچھ وقت چاہیے۔"

"کس لیے؟"

"فرحانہ کو رام کرنے کے لیے۔"

"کیا اسے میرے اور تمہارے تعلقات کا علم ہے؟"

"شاید۔"

"شاید کہ یقیناً۔"

"شاید اس لیے کہہ رہا ہوں کہ وہ الجھی الجھی تو رہتی ہے لیکن مجھ سے اس سلسلہ میں اس نے بات کبھی نہیں کی۔"

"ہم دونوں جس راہ پر چل رہے ہیں۔ بہت سے لوگ جان گئے ہیں ــــ"

"انہی میں سے شاید کسی نے فرحانہ کو بھی کچھ کہہ دیا ہو۔"

"تم خود کیوں نہیں کہہ دیتے؟"

"اسی لیے تو مہلت مانگ رہا ہوں ــــ دراصل وہ ان دنوں۔"

"ہوں ــــ"

"اس کے بچہ ہونے والا ہے۔"

"اوہ ــــ"

"لیکن ــــ تم فکر نہ کرو حنا۔ میں نے تم سے وعدہ کیا ہے اس سے کبھی نہیں پھروں گا۔"

"قیصر ــــ میں تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

"اپنا بھی یہی حال ہے۔"

"بیوی بچوں کی رکاوٹ۔"

"نہیں ہو گی۔"

"کیسے ــــ؟"

"یہ مجھ پر چھوڑ دو ــــ"

"قیصر اب معاملہ طول نہیں پکڑنا چاہیے، میں نہیں چاہتی کہ ہمارے تعلقات لوگوں کی زبان پر برے انداز میں آئیں۔ ہمیں شادی کر لینی چاہیے۔"

"ہوں ــــ"

"ڈیڈی سے کب ملو گے؟"

"جب تم کہو ــــ لیکن وہ رضامند ہو جائیں گے۔"

"میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"پھر بھی وہ ــــ"

"میری ضد کے آگے وہ نہیں ٹھہر سکیں گے۔ ویسے ڈیڈی نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا۔ ممی معترض ہوتی ہیں۔"

"معاملہ اتنا سہل نہیں ہو گا۔ حنا ڈارلنگ۔"

"لیکن ہمت ہارنا میں نے نہیں سیکھا، تم اپنی کہو۔"

"وقت درکار ہے۔"

حنا اور قیصر جب بھی ملتے یہی موضوع زیر بحث ہوتا۔ حنا کے لیے تو شاید یہ اتنا مشکل کام نہیں تھا۔ ماں باپ اجازت نہ بھی دیتے تو بھی وہ یہ کام کر گزرنے والی تھی ــــ لیکن ــــ

قیصر کے لیے اچھا خاصا دشوار کام تھا۔ فرحانہ سے بندھن توڑنا آسان کام نہیں تھا۔ پھر بھی نئے عشق کا بھوت سر پر سوار تھا۔ اس نے فرحانہ سے اجازت لینا ہی تھی۔ اس لیے اس سلسلے میں جرأت مندانہ قدم اٹھانا ہی تھا۔

اس رات اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ فرحانہ سے ساری بات کہہ دے گا۔

دونوں بیڈ پر قریب قریب لیٹے تھے۔ لیکن صدیوں کے فاصلے دونوں کے درمیان آچکے تھے۔ قیصر کچھ کہنے کی سوچ رہا تھا۔ وہ بار بار کروٹیں بدل رہا تھا۔ فرحانہ بے جان سی چت پڑی تھی۔ وہ قیصر کی بے چینی سے جانے کیا کچھ اخذ کر رہی تھی۔ اس کی حسین و اداس آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔

"فرحانہ—" بالآخر قیصر نے کہہ ہی دیا۔

وہ کچھ نہیں بولی۔

"سو گئی ہو۔"

فرحانہ کا دل بھر بھر آ رہا تھا۔ آنسو ضبط کرنے کا یارا نہ رہا۔ آج کئی دنوں کی خاموشی ٹوٹی تھی۔ قیصر اس سے مخاطب ہوا تھا۔

وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

قیصر کے حوصلے پست ہو گئے— اپنی زیادتی کا احساس ہوا— فرحانہ کے لیے دل تڑپ اٹھا۔ اس نے اسے کھینچ کر اپنے قریب کر لیا اور وہ اس کے سینے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ اس دن قیصر کوئی بات کرنے کا حوصلہ نہ کر سکا۔

اگلے کئی دن ایک جامد سی خاموشی رہی۔ فرحانہ قیصر کی پریشانیوں میں گھلی بے چینیوں کو محسوس کرتی رہی۔ وہ اس سے کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکا۔

لیکن—

قیصر حنا کے سامنے آتے ہی بھیگی بلی بن جاتا تھا۔ وہ اس حسینہ کو بھی تو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ ایک مقناطیسی کشش تھی اس لڑکی میں جو وہ خود بخود اس کی طرف کھنچا چلا آتا تھا۔

کھینچا تانی میں کئی دن گزر گئے۔ فرحانہ کو تو آنسو بہانے کے سوا جیسے کچھ آتا ہی نہیں تھا۔ وہ حنا اور قیصر کے عشق کی داستانیں سن رہی تھی۔ اڑتی اڑتی خبریں اسے بھی مل رہی تھیں۔ اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ ان باتوں پر یقین کرے۔

لیکن—

رویے اپنا آپ خود ہی سمجھا دیتے ہیں۔ احساسات کے پیمانے بڑے حساس ہوتے ہیں۔ یقین نہ کرنے کی خواہش کے باوجود اک کھلی حقیقت سے آنکھیں چار نہ کرنا حماقت تھی۔

وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ اس کا ذہن تو مفلوج ہو رہا تھا۔ رونے دھونے کے سوا جیسے عمل کا کوئی حصہ اس کے نصیب میں نہیں رہا تھا۔

اور—

قیصر چند دن تو اس کے رونے سے متاثر ہوا لیکن جب روز ہی ایسا ہونے لگا تو اس نے الگ بیڈروم میں سونا شروع کر دیا۔

جدائی کی خلیج پیدا ہو گئی تھی۔

حنا کے والدین رضامند ہو گئے تھے۔ اس نے ضد کر کے انہیں منا لیا تھا۔ کئی دن وہاں بھی رسہ کشی رہی لیکن آزاد خیال والدین کی آزاد خیال لڑکی کے لیے یہ مرحلہ طے کرنا مشکل نہیں تھا۔ ماں باپ نے سمجھایا— عزیزوں کے ذریعے مرعوب کرنے کی کوشش کی گئی۔ سہیلیوں نے اونچ نیچ سمجھائی لیکن حنا جو فیصلہ کر چکی تھی۔ وہ بدلا نہ جا سکتا تھا۔

وہ قیصر سے بھی اسی طرح دوٹوک فیصلہ کرنے کا کہتی۔ "قیصر تم عجیب آدمی ہو۔ میں لڑکی ہوں پھر بھی رکاوٹوں کو دور کر لیا ہے۔ تم مرد ہو کر مخمصے میں پھنسے ہو۔"

قیصر گہری گہری نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

وہ روٹھنے کے انداز میں بولی۔ "کہیں یہ سب کچھ تم کھیل تو نہیں سمجھ رہے۔ میں شکست ماننے والی نہیں ہوں۔ سمجھے—"

"حنا—" قیصر اس کی باتوں سے مرعوب ہو کر بولا۔ "میں اپنے فیصلے سے اِدھر اُدھر نہیں ہوؤں گا۔"

"پھر—"

"چند دن اور—"

"کیوں— ؟"

"حالات سازگار کرنا ہیں مجھے—"

حنا کو قیصر کی بات بُری لگی۔ اس نے منہ پُھلالیا اور اٹھ کر جانے لگی۔

قیصر نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ واپس کرسی پر بٹھاتے ہوئے منت کرنے لگا۔ ”حنا میرے حالات کو سمجھو میں اپنے وعدے سے نہیں پھر رہا۔ صرف چند دن اور چاہئیں۔ آخر مجھے فرحانہ سے اجازت بھی لینا ہے۔“

”جو تم اب تک نہیں لے سکے۔“

”ہاں۔“

”بزدل ہو۔۔۔ بیوی سے اتنا ہی ڈرتے تھے تو میرے ساتھ تعلقات کیوں بڑھائے۔۔۔ مجھے یہاں تک کیوں لے آئے۔ اب تم دوراہے پر ہو۔ اور فیصلہ نہیں کر پا رہے کہ قدم کس طرف اٹھانے ہیں۔“

”تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میرا فیصلہ اٹل ہے۔ تم جانتی ہو ہم دونوں پیار کی کس منزل پر ہیں۔ اب ایک دوسرے سے الگ ہونے کا تصور بھی محال ہے۔“

پھر وہ اسے پیار و محبت کے حسین و دلفریب خاکے دکھانے لگا۔ اس کی ہر ممکن طریق سے دلجوئی کی اور آخری قدم اٹھانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔۔۔

اس شام وہ جب فرحانہ کے سامنے صوفے پر بیٹھا تھا۔ فرحانہ حسرت والم کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ کپڑوں کا ہوش تھا نہ میک اپ کا۔ ملگجے سے لباس میں تصویر یاس بنی بیٹھی تھی کہ حنا کا فون آ گیا۔

فون فرحانہ ہی نے ریسیو کیا۔ حنا نے بھی فرحانہ سے کھل کر بات کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ بہت کچھ کہنے کے بعد اس نے بڑے زعم سے کہا:

”ہم ایک دوسرے کے دیوانے ہیں۔ تم ہماری شادی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتیں۔“

ریسیور فرحانہ کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

قیصر نے جلدی سے ریسیور رکھ کر فرحانہ کی طرف دیکھا۔

فرحانہ کا بدن کانپ رہا تھا۔ آنکھوں میں طوفان امڈ رہے تھے۔ قیصر نے سر جھکا لیا۔

فرحانہ جلدی سے اٹھی اور قیصر کے قدم پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ بے اختیاری کے عالم میں سسک کر بولی۔ ”قیصر کہہ دو۔ یہ سب مذاق ہے‘ جھوٹ ہے۔ تم یہ انتہائی قدم نہیں اٹھاؤ گے۔۔۔ کہہ دو قیصر۔۔۔ کہہ دو۔۔۔“

وہ مجنونانہ انداز میں اس کے قدموں کو پکڑے جھکی رہی تھی۔

قیصر چپ تھا۔

اور۔۔۔

جب فرحانہ نے بڑی تڑپ سے سر اٹھا کر پوچھا۔ ”بولتے کیوں نہیں ہو۔ کہہ دو نا یہ سب جھوٹ ہے۔“

”تو۔۔۔“

قیصر نے اسی انداز میں سر جھکائے بڑی مضبوط اور دوٹوک آواز میں کہا۔

”یہ جھوٹ نہیں ہے۔“

”قیصر۔۔۔“ فرحانہ سکتے کے عالم میں تھی جیسے۔۔۔

”ہاں فرحانہ۔۔۔ میں اور حنا شادی کر رہے ہیں۔ تم اپنی راہ خود چن سکتی ہو۔۔۔ چاہو تو اجازت دے دو۔۔۔ چاہو۔۔۔ تو۔۔۔ طلاق۔۔۔“

”قیصر۔۔۔“ وہ زور سے چیخی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

قیصر اٹھ کھڑا ہوا۔ بڑی بے دردی سے اسے پرے ہٹا تا وہاں سے چلا گیا۔

کئی دن فرحانہ سنبھل نہ پائی۔ کبھی چیخنے لگتی‘ کبھی گم صم ہو جاتی۔ اس نے حنا سے بھی رابطہ قائم کیا۔ اسے اس ارادے سے باز رکھنے کے لیے جو کچھ کر سکتی تھی کیا۔

”حنا تم اس ارادے سے باز آ جاؤ۔ تم عورت ہو۔ میرے جذبات کو سمجھو۔ میرا گھر تباہ کر کے تمہیں کیا ملے گا؟“

فرحانہ نے حنا کو فون پر کہا۔

حنا بھلا کہاں سننے والی تھی۔ بڑے طنز و تضحیک سے قہقہہ لگایا اور فون بند کر دیا۔

فرحانہ اپنے آشیانے کو آگ کی لپیٹ میں آنے سے بچانے کے لیے ہر ممکن تگ و دو کر رہی تھی۔ اس کے میکے اور سسرال میں بھی اس خبر سے کھلبلی مچ گئی۔ سب نے قیصر کو سمجھایا لیکن جب عقل پر پردے پڑ جائیں تو سمجھانا بجھانا بے سود ہی ہوتا ہے۔

فرحانہ اس کا دامن نہیں چھوڑ رہی تھی۔ وہ خود حنا سے ملنے گئی۔ اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔

”حنا تم جوان ہو۔ تمہیں ایک نہیں کئی امیدوار نگاہوں میں بسائے بیٹھے ہوں گے۔ خدا کے لیے قیصر کو چھوڑ دو۔ میں اس کی بیوی ہوں۔ نوید اس کا بچہ ہے۔ چند دنوں

بعد وہ دوسرے بچے کا باپ بننے والا ہے۔ تمہیں اس سے کہیں بہتر رشتے مل سکتے ہیں۔ بخدا مجھ پر ترس کھاؤ' میرے بچوں کا خیال کرو—— مجھ سے میرا سرمایہ حیات نہ چھینو—— "

حنا نے پھر بھی طنزو تمسخر سے کام لیا۔ فرحانہ کی کسی بات کو در خور اعتنا نہ سمجھا۔

"میں نے جو کچھ کیا ہے سوچ سمجھ کر ہی کیا ہے۔ قیصر میرا محبوب ہے اور میں اس کے بغیر ایک پل زندہ نہیں رہ سکتی۔ یہی حال قیصر کا بھی ہے۔"

فرحانہ کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ دکھ سے بولی۔ "قیصر کا یہی حال کبھی میرے لیے بھی تھا حنا—— "

"ہونہہ—— "

"اس وقت تمہاری آنکھوں میں عشق کی دھول رچی ہوئی ہے۔ تم سوچ سکتی ہو نہ سمجھ سکتی ہو۔ قیصر میرا بچپن کا منسوب ہے۔ اس سے میرا صرف سماجی رشتہ ہی نہیں خون کا رشتہ بھی ہے۔ وہ مجھے تمہاری خاطر چھوڑ رہا ہے۔ یہ نہ ہو—— "

"بس بس—— اتنا ہی کافی ہے۔ وہ تمہیں میری خاطر چھوڑ رہا ہے۔ آخر میں کوئی شے تو ہوں نا۔" وہ غرور سے بولی۔

"یہی تو میں سمجھانا چاہتی ہوں حنا—— قیصر مجھے چھوڑ سکتا ہے۔ مجھ سے آنکھیں پھیر سکتا ہے تو تم سے بھی—— "

"میں زیادہ باتیں سننا نہیں چاہتی۔ تم جا سکتی ہو—— "

اور——

فرحانہ کی انا اور خودداری پر کوڑے برسانے کے لیے حنا اٹھ کر چلی گئی۔

فرحانہ حنا کے گھر سے اپنی عزت اور خودداری کو جو ٹھیس لگوا کر اٹھی' وہ دل میں نہ بھرنے والا زخم بن گیا۔

سیلاب تندی پہ آ جائیں تو کوئی بند بھی ان کا بہاؤ نہیں روک سکتا۔ یہ کنارے توڑ کر نکل جاتے ہیں۔ قیصر اور حنا پر بھی کسی بات کا اثر نہ ہوا۔ والدین تھک ہارے' 'عزیز' دوست' رشتہ دار سبھی نے قیصر کے اس فعل کی مذمت کی۔

لیکن——

اس نے ایک نہ سنی—— اس نے فرحانہ کو سمجھا بجھا کر منت سماجت کر کے رعب و دبدبہ دکھا کر' طلاق کی دھمکی دے کر نئی شادی کی اجازت حاصل کر ہی لی۔

اور

جس رات فرحانہ موت و زیست کی کش مکش میں ایک نئے وجود کو دنیا میں لا رہی تھی' اسی رات قیصر کی آغوشِ محبت میں حنا آ بسی تھی۔

فرحانہ ٹوٹ پھوٹ گئی۔

بکھر گئی——

اعتماد بری طرح مجروح ہوا۔

وفا بے معنی سی چیز بن گئی۔

اور——

محبت سے اسے نفرت ہو گئی۔

کئی ماہ تو وہ نارمل نہ ہو سکی۔ اجڑے دیار میں باؤلی ہو کر رہ گئی۔

حنا اور قیصر گردوپیش سے بے خبر سے ہو گئے تھے۔ دونوں کو ایک دوسرے کے سوا کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ ہنی مون کے لیے وہ یورپ چلے گئے۔ اس کے بعد چند ہفتوں کے لیے فار ایسٹ کا ٹور کیا۔

اب حنا بھی اسی گھر میں تھی جس میں فرحانہ تھی۔ وہ گھر جو فرحانہ کی امیدوں کا گہوارہ اور محبتوں کا امین تھا' اب حنا اس میں برابر کی شریک تھی۔ محبت میں شراکت کسے گوارا ہوتی ہے۔ یہ تو مجبوریاں اور حالات کی بندشیں ہوتی ہیں جو انسان کو بے بس کر دیتی ہیں۔ فرحانہ کی بے بسی بھی اسی نوعیت کی تھی۔ حنا اس کے سینے پر مونگ دل رہی تھی۔ قیصر جو کبھی اس کا اور صرف اس کا تھا۔ اب حنا کے ہاتھوں میں کھلونا تھا۔

حنا کچھ زیادہ ہی ہوشیار تھی۔ فرحانہ نے بھولپن اور اندھے اعتماد سے جو کچھ گنوایا تھا وہ اس کی نوبت ہی نہ آنے دینے والی تھی۔ وہ قیصر پر چھا جانا چاہتی تھی۔ وہ اس کی محبوبہ بھی تھی۔ دوست بھی اور خدمت گار بیوی بھی۔

دن گزرتے چلے گئے' رتیں بدلیں' وقت ایک جگہ تھم نہیں جاتا' یہ تو اپنی مخصوص روانی سے کسی ندی کی طرح بہتا ہی چلا جاتا ہے۔

انہونی ہو چکی تھی۔

فرحانہ نے سوکن کے روپ میں حنا کو تسلیم کر لیا تھا۔ اس کے وجود کو تسلیم کیے بغیر چارہ بھی تو نہ تھا۔ اک حقیقت تھی جس سے آنکھیں بند کر لی جاتیں' تب بھی وہ اپنی

جگہ قائم تھی۔

لیکن وہ محسوس کرتی تھی کہ حنا کو اس کا وجود گوارا نہیں' جلن اور حسد کے مارے وہ جلی بھنی رہتی تھی۔ وہ جتنا جلتی فرحانہ کو اتنا ہی سکون ملتا۔

قیصر نے حنا سے شادی کی تھی۔ وہ اس کی بیوی تھی جسے وہ ٹوٹ کر چاہتا تھا۔ فرحانہ کو بے شک نظر انداز کیے ہوئے تھا لیکن فرحانہ کے وجود کے وہ حصے جو نوید اور منّے کے رُوپ میں نظر آتے تھے ان سے چشم پوشی کرنا شاید اس کے بس میں نہیں تھا۔

وہ اکثر دونوں بچوں کو گود میں بٹھا لیتا اور بے تحاشا پیار کرنے لگتا۔ یہ اگر حنا دیکھ لیتی تو اس کے ماتھے پر بل پڑ جاتے۔

اور ـــ

یہ بل فرحانہ کے دل کے بل نکال دیتے۔ اس کے لبوں پر بڑی مسحور کن مسکراہٹ پھیل جاتی۔ حنا کو جلا کر ہی تو لطف ملتا تھا۔

حنا نے پہلے تو یہی پلان بنایا تھا کہ وہ پانچ سال بعد بچے پیدا کرے گی لیکن بچوں میں قیصر کی دلچسپی دیکھتے ہوئے اس نے بچہ پیدا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگلے ماہ ہی وہ بڑی مسرور و شاد تھی۔ گنگناتے ہوئے اس نے قیصر کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے بہت خوش نظر آ رہی ہو۔" وہ بولا۔

"تم بھی سنو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔"

"واہ وا ـــ ایسی کون سی بات ہے؟"

"کان ادھر کرو ـــ"

"لو ـــ"

بڑے ناز و ادا سے حنا نے قیصر کے کان میں مسحور کن سرگوشی کی ـــ

لیکن

قیصر یوں تڑپ کر ہٹا جیسے حنا نے کوئی زہریلی اور گرم گرم شے اس کے کان میں انڈیل دی ہے۔

حنا ہراساں سی ہو گئی۔

قیصر خوش نہیں ہوا تھا۔ بچوں کے جھنجھٹ تھے جن سے وہ گریزاں تھا۔ حنا کی کائنات ڈول گئی۔

گو بعد میں قیصر نے اسے بانہوں میں بھر لیا اور پیار بھی کر لیا۔ مبارک بھی دی۔ خوشی کا اظہار بھی کیا لیکن حنا کے دل میں جو کانٹا چبھ گیا تھا وہ اذیت دینے سے نہ رہا۔

فرحانہ تک بھی یہ خبر پہنچی۔ اس نے خوشی کا اظہار کیا نہ دکھ کا۔

ہاں جب اسے کسی طرح یہ معلوم ہو گیا کہ حنا غمزدہ اس لیے رہتی ہے کہ قیصر کو بچے کی آمد سے کوئی خوشی نہ ہوئی تھی تو وہ اندر ہی اندر پھول کی طرح کھِل اٹھی۔

دکھ' حسد اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے فطری جذبے تھے جو حنا اور فرحانہ کے دلوں میں مچلتے رہتے تھے۔ ایک نیام میں دو تلواریں بھی کبھی سما سکی ہیں۔ آئے دن چھوٹے موٹے واقعات ہوتے رہتے جو کبھی حنا کی تسکین کا باعث بنتے' کبھی فرحانہ کی ـــ اور کبھی قیصر کے لیے باعثِ اذیت بن جاتے۔ حنا فرحانہ کو زک دینے کی کوشش میں رہتی اور فرحانہ حنا سے انتقام لینے کے لیے تومند جذبے دل میں کسک بن کر چھپتے محسوس کرتی۔ دونوں میں اکثر تُو تُو مَیں مَیں بھی ہو جایا کرتی تھی۔ جلاپے کے ہاتھوں دونوں مجبور تھیں۔ جب لڑائی ہوتی تو کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ وہ اتنے بڑے خاندانوں کی پڑھی لکھی لڑکیاں ہیں۔

فرحانہ نے قیصر سے وابستگی یا کوئی امید باندھ نہیں رکھی تھی۔ وہ تو اس کے دل سے جیسے اتر ہی گیا تھا۔ کرچی کرچی اعتماد ہر وقت چبھن کا احساس دیتا رہتا تھا لیکن حنا کے لیے اس کے دل میں غیظ و غضب کی آگ بھڑکتی رہتی تھی۔ اس عورت نے اس کی منت سماجت کے باوجود اس کی دنیا میں آگ لگا دی تھی۔ اسے مستقل آزار دے دیا تھا۔ وہ اسے کسی صورت معاف کرنے کو تیار نہ تھی۔ حنا نے اسے جس طرح ذلیل کیا تھا اور عین ڈلیوری کے دن شادی رچالی تھی۔ فرحانہ جب بھی سوچتی تلملا اٹھتی۔ مایوسی کے انہی دنوں میں اس کی ملاقات پنکی سے ہوئی تھی۔ تیئس چوبیس سالہ بے انتہا خوبصورت پنکی متوسط طبقے کی لڑکی تھی۔ باپ فوت ہو چکا تھا۔ گھر میں بڑی ہونے کے ناطے سارے گھر کا بوجھ اس کے کندھوں پر آن پڑا تھا۔ وہ ایک مقامی دفتر میں کلرک تھی۔ ساتھ ہی سلائی کڑھائی کا کام بھی کرتی تھی۔ چھوٹے چھ بھائی بہنوں کی کفالت اس کے کندھوں پر تھی۔ اس کے خاندان نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے۔ رکھ رکھاؤ ابھی بھی باقی تھا۔ چھوٹی دو بہنوں کی شادی بھی کر دی تھی۔ اب چار بھائیوں اور ماں کا بوجھ تھا۔ بڑا بھائی اسی سال تعلیم سے فارغ ہو کر اس کا ہاتھ بٹانے والا تھا۔

فرحانہ کی پنکی سے ملاقات مسز ناصر کے ہاں ہوئی جو پنکی سے اکثر سلائی کڑھائی

کا کام کرواتی تھی۔

"فرحانہ تم بھی ان سے کپڑے سلوا لیا کرو۔ بچوں کے کپڑے تو بے حد خوبصورت بناتی ہیں۔ کڑھائی بہت پیاری کرتی ہیں۔"

"ہاں۔ یہ چیزیں انہی کی بنائی ہوئی ہیں نا——" فرحانہ پنکی کی حسین صورت سے مرعوب ہو رہی تھی۔

"بہت عمدہ کام کرتی ہیں۔" مسز ناصر نے کہا۔

فرحانہ نے پنکی کی بنی ہوئی چیزیں دیکھیں۔ بہت پسند کیں۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے اسے اپنے گھر کا پتہ دیا۔

"کسی دن آنا—— میرے تو بے شمار کام اُدھورے پڑے ہیں۔"

"ضرور آؤں گی۔"

تیسرے دن پنکی فرحانہ کے ہاں تھی۔ اس نے کڑھائی کی نادر چیزیں' سلائی کے لاجواب نمونے بھی فرحانہ کو دکھائے۔ فرحانہ نے بہت تعریف کی اور ڈھیر سارا کام اسے دیا۔ پنکی فرحانہ کے مزاج و عادات سے بڑی متاثر ہوئی۔ پھر وہ ہفتے میں ایک دو بار آنے لگی۔ دونوں بے تکلف سہیلیاں بن گئیں۔

اس دن دونوں بیٹھی چائے پی رہی تھیں کہ قیصر فرحانہ کے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ پنکی سمٹ گئی اور قیصر کی آنکھیں حسن کے اس مجسمے میں گڑ گئیں۔ فرحانہ زیر لب مسکرائی۔ پھر دونوں کا تعارف کرایا۔

قیصر وہیں بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں کے ساتھ چائے پی اور بڑی خوشدلی سے گپ شپ لڑائی۔ فرحانہ کو اک گونا خوشی محسوس ہونے لگی۔

پنکی نے واپس جانے کی اجازت چاہی تو قیصر بھی اٹھا۔ فرحانہ جلدی سے بولی۔

"قیصر آپ پنکی کو ڈراپ کر دیں۔ اس نے بھی ادھر ہی جانا ہے۔" فرحانہ نے پتہ بتایا۔

قیصر جانے کہاں جانے والا تھا۔ فرحانہ کی بات سن کر اس کے من میں لڈو سے پھوٹ پڑے۔ اس بُتِ ہوشربا کی قربت میں چند ساعتیں گزارنے کے تصور سے جھوم گیا۔

پنکی جلدی سے بولی۔ "نہیں نہیں۔ میں رکشا لے لوں گی فرحانہ۔ انہیں خواہ مخواہ کی زحمت نہ دیں۔"

"کوئی بات نہیں میں ادھر ہی جا رہا ہوں——" وہ بڑی شرافت کا مظاہرہ کرنے لگا۔

پنکی اس کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی۔ لیکن دونوں طرف سے اصرار زبردست تھا اسے جانا ہی پڑا۔

پھر یوں ہونے لگا کہ پنکی جب بھی فرحانہ کے ہاں آتی' قیصر بھی سارے کام چھوڑ کر آ جاتا۔ فرحانہ خود ہی اس کی آمد سے بہانے بہانے قیصر کو مطلع کر دیتی۔ کبھی ناشتے کی میز پر کہتی۔ "آج پنکی نے تین بجے آنے کا تو کہا ہے۔ آ جائے تو نوید کے کپڑے سلنے دے دوں۔"

کبھی قیصر کے دفتر جاتے جاتے کہتی۔ "آج پنکی نے آنا ہے۔ مجھے گاڑی کی ضرورت پڑے گی۔"

قیصر بھی پہنچ جاتا۔ وہ اکٹھے چائے پیتے' گپ شپ لگاتے۔ اب پنکی بھی کچھ بے تکلف ہو چکی تھی۔

فرحانہ دانستہ ان دونوں کو تنہائی کا موقع دیتی۔ "تم چائے پیئو' میں ذرا نوید کے کپڑے بدل لوں۔"

کبھی کہتی۔ "مجھے بابا کو فون کرنا ہے تم باتیں کرو میں ابھی آئی۔"

پنکی جیسی حسینہ اور قیصر جیسا حسن پرست۔ تنہائی رنگ لانے لگی۔ قیصر ماہر تھا۔ گھاگ تھا۔ اس جیسی سیدھی سادی لڑکیوں کو شیشے میں اتارنے کا فن جانتا تھا۔ اس نے پیار کے وار کرنا شروع کر دیئے۔ پنکی کے قدم ڈول گئے۔

پیار کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔ محبت کا مرحلہ درپیش تھا۔ اور عشق کی دیوانگی کا امکان تھا۔ اب قیصر پنکی کو صرف چھوڑنے ہی نہیں جاتا تھا' دفتر سے لینے بھی جاتا تھا۔ اور گھر چائے پینے کی بجائے ہوٹلوں اور ریستورانوں کا رخ بھی کر لیتا تھا۔

فرحانہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

وہ خوش تھی۔

بے حد خوش۔

قیصر کے نئے عشق کی داستانیں چرچے بننے لگیں تو حنا جل کر کباب ہو گئی۔ وہ قیصر سے ٹکرائی۔ پھر غصے سے لال بھبھوکا ہو کر فرحانہ کے کمرے میں آ گئی۔

"آؤ کیسے آئی ہو۔۔۔ ؟" فرحانہ نے اس کے چہرے سے ہی حالات کا اندازہ کر لیا۔ اس لیے بڑے اطمینان سے بولی۔

"یہ لڑکی کون ہے؟" وہ چیخی

"کون سی؟"

"جو تمہارے پاس اکثر آتی ہے۔"

"کیا تمہیں یہ پوچھنے کا کوئی حق ہے۔ میرے پاس کوئی بھی آسکتا ہے۔۔۔ ؟"

فرحانہ کے ٹھنڈے مزاج نے حنا کو اور بھڑکا دیا۔ تیزی سے بولی۔ "تم جانتی ہو کیا ہو رہا ہے؟"

"کیا۔۔۔ ؟"

"قیصر اس لڑکی میں دلچسپی لے رہا ہے۔"

فرحانہ کے کلیجے میں جیسے ٹھنڈک پڑ گئی۔ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔۔۔

"تم ہنس رہی ہو۔"

"بہت رو چکی ہوں۔"

حنا سٹپٹائی۔۔۔ پھر غصے سے لال پیلی ہو کر بولی۔ "وہ لڑکی اس گھر میں نہیں آئے گی۔"

"حنا یہ میرا گھر ہے۔ میرے مہر میں لکھا ہے۔ اس گھر میں اسے آنے سے تم نہیں روک سکتی ہو۔"

"وہ۔۔۔ لڑکی قیصر کو ہتھیائے گی۔" وہ بیچارگی سے بولی۔

فرحانہ نے اک قہقہہ لگایا۔۔۔ پھر بولی۔ "مجھے کیا فرق پڑے گا۔ مجھ سے تو قیصر کو پہلے ہی ہتھیایا جا چکا ہے۔"

حنا سے کوئی بات نہ بن پڑی پاؤں پٹختے کمرے سے نکل گئی۔

پھر روز ہی لڑائیاں ہونے لگیں۔ حنا ہاتھ دھو کر قیصر کے پیچھے پڑ گئی۔ ان لڑائیوں، دھمکیوں اور ہر وقت کی چخ چخ سے تنگ آ کر شاید قیصر پنکی کا پیچھا چھوڑ ہی دیتا۔

لیکن۔۔۔

فرحانہ ہمیشہ ایسے موقعے پر قیصر کی طرف داری کرتی۔ قیصر دل ہی دل میں اس عورت کی عظمت کو سلام کرتا جو اس کی خوشنودی کی خاطر اس حال میں بھی سینہ سپر تھی۔

معاملہ طول پکڑ گیا۔ پنکی فرحانہ سے شرمندہ تھی۔ لیکن فرحانہ نے اسے سینے سے لگا کر تسلی دی۔ اور کہا۔ "میں سب کچھ جانتی ہوں۔ میں تمہیں رسوا نہیں ہونے دوں گی۔ قیصر تم سے ضرور شادی کرے گا۔"

"لیکن فرحانہ تم۔۔۔"

"میری پروا نہ کرو مجھے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔"

پنکی نے ندامت سے سر جھکا لیا تو فرحانہ اسے تسلی دینے لگی۔

"پنکی تم نے بھی تو شادی کرنا ہی ہے اور اس عمر میں جانتی بھی ہو کہ تمہیں کیسا بَر مل سکتا ہے۔ تمہارے لائق تو قیصر جیسا امیر، خوبصورت اور سٹیٹس والا آدمی ہے۔ تم نے کون سا گناہ کیا ہے جو عمر بھر محنت ہی کرتی رہو اور چار لمحے عیش و عشرت کے بھی نصیب نہ ہوں۔"

پنکی کچھ نہ بولی بس فرحانہ سے لپٹ گئی۔

پھر فرحانہ نے خود ہی قیصر سے بات کی۔ اسے پنکی سے شادی پر آمادہ کرنے کے لیے طویل تقریر کی۔ دونوں کے تعلقات اور ان سے پیدا ہونے والے خدشات، رسوائیاں پنکی کا مقدر بن سکتی تھیں۔

قیصر شرمندہ ہو گیا۔

فرحانہ زور دے کر بولی۔ "تمہیں اس سے شادی کرنا ہی پڑے گی۔ ایک غریب لڑکی سے تم صرف کھیل نہیں سکتے۔ اس کی بیوہ ماں ہے۔ اس کے بھائی ہیں۔ اسے اس دنیا میں رہنا ہے۔ تم نے پنکی کو صرف رسوائیاں ہی دیں تو یہ انتہائی شرمناک فعل ہو گا۔ کچھ بھی ہو تمہیں اس سے شادی کرنا پڑے گی۔"

قیصر حیران تھا۔ فرحانہ دوسری سوت لانے کا اتنی شدومد سے تذکرہ کر رہی تھی۔

"قیصر سارے واقعات کا مجھے علم ہے۔ پنکی مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتی۔ میں اسے بھی قول دے چکی ہوں۔ اب یہ شادی ہو کر رہے گی۔ کوئی بات نہیں تم مالی طور پر اتنے مضبوط و مستحکم ہو کہ تیسری بیوی کا بار اٹھا سکو۔"

"یہ بات نہیں۔۔۔" وہ بمشکل کہہ سکا۔

"تو اور کوئی بات بھی نہیں۔۔۔ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔"

فرحانہ کا فیصلہ کن جواب تھا۔

اور—

پھر—

اس نے بڑی تگ ودو کی۔ پنکی کی ماں کو منایا اور اس شادی پر آمادہ کیا۔ یہ شادی ہی پنکی اور اس کے گھر والوں کو بدنامی سے بچا سکتی تھی۔

فرحانہ کے پاس یہی حربہ تھا جو اس نے کامیابی سے آزمایا۔

شادی کی بات پکی کر کے وہ اٹھلاتی پھری۔

خوشی خوشی تیاریوں میں مصروف ہو گئی— حنا جل بھن کر راکھ ہو رہی تھی۔

انہی دنوں اس نے ایک بچی کو جنم دیا۔

فرحانہ نے تو بہت کوشش کی کہ جس دن حنا بچی کو جنم دے اسی دن پنکی کو قیصر کے پہلو میں لا بٹھائے۔

لیکن کچھ باتیں تاخیر کا باعث بن گئیں۔

لیکن—

جس دن حنا بچی کو لے کر واپس گھر آئی' اسی دن فرحانہ نے پنکی کو دلہن بنا کر قیصر کے بیڈ روم میں لا بٹھایا۔

حنا پر تو جیسے قیامتیں ٹوٹ پڑیں۔ نقاہت' غم' غصے اور دکھ سے وہ نڈھال ہو گئی۔ اس کی تڑپ دیدنی تھی۔

اور

اس کی یہی تڑپ دیکھ کر فرحانہ کو اتنی تسکین' طمانیت اور خوشی مل رہی تھی۔

کہ

اب تک اس نے جتنے غم جھیلے تھے گویا ان کا مداوا ہو گیا تھا۔ وہ اونچی آواز میں ہنس رہی تھی۔ قہقہے لگا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا اس نے ذہنی توازن کھو دیا ہے۔

لیکن وہ پاگل نہیں ہوئی تھی۔ اس نے تو اپنی ذات پر کرب کے پہاڑ ڈھا کر حنا سے انتقام لیا تھا۔

اس نے اچھا کیا تھا یا برا اس بات سے وہ بے نیاز تھی۔

◆◆◆◆◆◆◆

آدھی کہانی

دونوں ٹوکریاں اور تھیلے اس نے کچن میں داخل ہوتے ہی دے مارے۔ گرمی سے بُرا حال تھا۔ وہ پسینے میں نہا گئی تھی۔ چہرہ سرخ تھا اور پیاس کے مارے دم نکلا جا رہا تھا۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی فریج کی طرف بڑھی اور ٹھنڈی بوتل نکال کر پانی گلاس میں ڈالنے کا تکلف بھی نہ کیا۔ بوتل ہی سے منہ لگا کر غٹا غٹ پانی پی گئی۔

ٹھنڈے پانی سے حواس کچھ بجا ہوئے۔ تھوڑی دیر اندر آ کر پنکھے کے نیچے بیٹھی پسینہ سوکھا تو اٹھ کر کچن میں آ گئی۔ آٹھ دس دن کا سودا لائی تھی۔ اب اسے ٹھیک ٹھاک کرنا تھا۔ گوشت اور قیمے کے حصے بنا کر پولی تھین کے تھیلوں میں ڈال کر فریج میں رکھنا تھا۔ سبزی بھی بنانا تھی۔ اور لہسن پیاز ٹماٹر وغیرہ بھی الگ الگ کرنا تھے۔ مرغی کاٹنا تھی۔ اور پسندوں کو مصالحہ لگانا تھا۔ بیزار بیزار سی وہ سبزی کی ٹوکریوں اور تھیلوں کو الٹنے لگی۔

ناشتے کے برتن ابھی سنک میں پڑے تھے۔ کوکنگ رینج پر دودھ کی دیگچی پڑی تھی۔ اسے یاد آ گیا کہ دودھ کچا ہی ہے۔ سبزی ترکاری چھوڑ کر وہ جلدی سے چولہے کی طرف بڑھی۔ دودھ واقعی ابلا ہوا نہیں تھا۔ اسے گھبراہٹ سی ہوئی۔ دودھ خراب ہو گیا تو کون بازار سے لینے جائے گا۔ گرمیوں میں تو دودھ کی بہت قلت ہو جاتی تھی۔ نہ ملا تو بچے شام کو کیا پئیں گے۔ کوئی مہمان آ گیا تو چائے کیسے بنے گی۔

گھبراہٹ میں وہ یہی سوچتے ہوئے بڑھی اور دیگچی تلے چولہے کو آگ لگا دی۔ پھر سبزی گوشت ٹھکانے سے لگانے کی بجائے وہ سنک کی طرف بڑھی تاکہ ناشتے

کے برتن دھوڈالے۔

وہ دم سے برتن مانجھنے لگی۔ اسے اپنے خوبصورت ہاتھوں کو دیکھ کر رونا آرہا تھا۔ ناخن تو بالکل ہی ٹیڑھے میڑھے ہوگئے تھے۔ انگلیاں کیسے سخت سخت لگنے لگی تھیں۔ اور ہتھیلیوں پر تو لکیریں ہی لکیریں نظر آنے لگی تھیں۔ برتن چھوڑ کر وہ اپنے ہاتھ تکنے لگی۔ اسے بے طرح غصہ آرہا تھا۔

"اماں کرمو— تو جا کر ہی مر گئی جو واپس نہ آئی۔" اس نے غصے سے کوسا اور "وہ بدبخت شارا بھی ٹانگ توڑ بیٹھا— ہونہہ— نوکروں کا قحط پڑ گیا ہے کوئی ملتا ہی نہیں۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے بے دلی اور غصے سے برتن کھنگالنے لگی۔

برتن دھو بھی نہ پائی تھی کہ شوں کی زوردار آواز پر چونکی پلٹ کر دیکھا تو دودھ کی دیگچی ابل رہی تھی۔ ساری ملائی چولہے میں گر گئی تھی۔ ہاتھ میں پکڑی پلیٹ جلدی سے رکھ کر چولہے کی طرف پلٹنے لگی تو پلیٹ کھسک کر فرش پر گری اور چکنا چور ہو گئی۔

"اوہ— خدایا— " اتنی خوبصورت‘ نازک اور ڈنر سیٹ کی کوارٹر پلیٹ ٹوٹ گئی تھی۔ جہیز کا یہ ڈنر سیٹ وہ بڑی احتیاط سے استعمال کرتی تھی۔ اماں کرمو یا شارے سے یہ پلیٹ ٹوٹتی تو جانے وہ کتنا شور مچاتی۔ کتنا کوستی اور تنخواہ سے پیسے کاٹ لینے کی کتنی دھمکیاں دیتی۔

وہ پلیٹ کی کرچیاں اٹھانے لگی۔

اور—

دودھ ابل ابل کو چولہے میں گرنے لگا۔

ہائے اللہ۔ وہ کرچیاں وہیں رکھ کر چولہے کی طرف لپکی۔ صافی کہیں نظر نہ آرہی تھی۔ دوپٹے ہی سے پکڑ کر دیگچی اتاری۔ سٹیل کی دیگچی خوب تپی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں تپش کھا گئیں۔

دیگچی دوسرے چولہے پر رکھ اس نے دونوں ہاتھ کی انگلیاں منہ میں ڈال لیں— جلن ہو رہی تھی۔ وہ جلدی سے اپنے کمرے میں گئی۔ اور انگلیوں پر کریم لگانے لگی۔

اسے اپنی حالت پر رونا سا آرہا تھا۔ مہینہ بھر سے وہ روزانہ یہی کام کر رہی تھی۔ کبھی ہاتھ جلا لیتی۔ کبھی کلائی— کہیں چھری کی نوک لگ جاتی۔ کہیں خراش آجاتی۔

کریم لگا کر وہ کتنی دیر بیڈ پر پڑی رہی۔ کسی کام کو ہاتھ لگانے کو مطلقاً جی نہیں چاہ رہا تھا۔

لیکن—

وہ ایک دم اٹھ کر کچن کی طرف دوڑی۔ گوشت‘ قیمہ‘ مرغی سب وہیں پڑے تھے اور ان دنوں چیونٹیاں دور ہی سے جیسے بُو سونگھ لیتی تھیں۔

واقعی گوشت پر چیونٹیوں نے ہلّہ بول دیا تھا۔ قیمہ پلاسٹک کے لفافے میں تھا۔ اس نے جلدی سے لفافہ اٹھالیا۔ اگر قیمے کو چیونٹیاں چڑھ جاتیں تو صاف کرنا مشکل ہو جاتا۔

گھنٹہ بھر میں اس نے گوشت سے چمٹی چیونٹیاں چن چن کر اتار دیں۔ اسے دھویا۔ روزانہ کے حساب سے حصے بنائے‘ لفافوں میں ڈالا۔ اور فریج میں رکھ دیا۔ قیمے اور مرغی کے بھی پیکٹ بنائے۔ سبزی دھوئی کاٹی۔ یہ سارا کام وہ انتہائی بیزاری سے کر رہی تھی۔ اس کا جی کسی چیز کو ہاتھ لگانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔

لیکن مجبوری تھی— کیا کرتی—

کام کرنے کی اسے عادت نہ تھی۔ شادی سے پہلے تو کبھی کام کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ امی شور مچاتی رہتیں۔ وہ ایک کان سے سنتی دوسرے سے نکال دیتی۔ گھر میں نوکر ہمیشہ سے رہا اس لیے امی بھی زیادہ زور نہ دیتیں۔

شادی کے بعد اماں کرمو اور شارا دونوں پاس رہے۔ ناصر صاحب حیثیت والا آدمی تھا۔ نازوں پلی شازی کو بیاہ کر لایا تھا۔ اس لیے نوکر اور نوکرانی کا بندوبست پکا تھا۔

اماں کرمو نے سارے گھر کا کام سنبھال رکھا تھا۔ جمعدارنی سے صفائی تک وہی کرواتی۔ کچن کا کام کرتی۔ کپڑے دھلواتی۔ استری کرواتی۔ شارے کے ذمہ باہر کا کام تھا۔ چیزیں اٹھانا رکھنا بھی اسی کے ذمے تھا۔ شادی کو سات سال ہوگئے تھے۔ دو بچے بھی تھے۔ لیکن اسے بچوں کو بھی سنبھالنا نہیں پڑتا تھا۔ اور اب تو بچے سکول جانے لگے تھے۔ شارا ہی ان کو تیار کرتا اور سکول چھوڑنے جاتا تھا۔ چھٹی پر وہی واپس لاتا‘ کپڑے بدلواتا اور کھانا کھلاتا تھا۔

شازی بڑی پُرسکون اور مطمئن تھی۔ سہیلیوں سے ملنا‘ ہمسایوں سے گپ شپ لڑانا اور شام کو ناصر کے کسی نہ کسی دوست کے گھر جانا یا ان کو گھر پہ بلانا ہی کام تھا۔

شازی بیکار بھی نہیں بیٹھی تھی۔ گھریلو کاموں خاص کر کچن کے کاموں سے اسے دلچسپی و رغبت نہ تھی۔ لیکن فالتو وقت میں وہ پینٹنگ کیا کرتی۔ افسانے لکھنے کا شوق تھا‘ کئی رسالوں میں چھپتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے دلچسپ اور منفرد قسم کے افسانے لکھا کرتی تھی۔

لیکن

ایک ماہ سے اماں کرمو بیٹی کے پاس گئی تھی۔ گئی چند دنوں کے لیے تھی لیکن مہینہ ہو چلا تھا۔ وہ واپس نہیں آئی تھی۔ رودھو کے نثارے کی مدد سے شازی کام نبھاہ ہی لیتی تھی کہ نثارے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ وہ بھی گھر چلا گیا۔ شازی نے ہر ملنے والے سے نوکر کے لیے کہا۔ ناصر نے دفتر کے چپڑاسی سے لے کر آفیسروں تک نوکر کے لیے کہا۔

لیکن

کوئی نہ ملا۔

شازی نے صرف برتن دھونے والی ہی کے لیے منتیں کیں لیکن کسی نے حامی نہ بھری' کوئی ہاتھ نہ آیا۔

اسے مصیبت پڑی ہوئی تھی۔ بازار سے سودا بھی خود ہی لانا پڑتا تھا اور صبح سے رات گئے تک کام بھی خود ہی کرنا پڑتا تھا۔ ناصر آفس سے آ کر اس کی مدد کرتا تھا' دلجوئی کرتا تھا۔

لیکن شازی اپنا غصہ اور بیزاری اکثر اسی پر نکالا کرتی تھی۔

اس نے سارا سودا سمیٹ کر جگہ جگہ پر رکھا۔ پلیٹ کی ٹوٹی کرچیاں ڈبے میں ڈالیں۔ ککر میں گوشت ڈالا اور دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔

وہ نمک مرچ ڈال ہی رہی تھی کہ بیل ہوئی۔

جھلا کر اس نے کچن کے دروازے سے سر نکال کر گیٹ کی طرف دیکھا۔ شاہدہ اور مسز محمود کھڑی تھیں۔

شاہدہ اس کی ہمسائی تھی۔ اور مسز محمود سامنے والے بنگلے میں رہتی تھی۔ دونوں ملنے آئی تھیں۔

ان سے ملنا جلنا رہتا ہی تھا۔ گھنٹوں گپ شپ ہوتی۔ کافی اور چائے کے دور کبھی ان کے ہاں اور کبھی اس کے ہاں چلتے۔ لیکن آج وہ جھلا گئی۔ اس کا جی بالکل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ آئیں۔

لیکن

وہ آ چکی تھیں۔

شازی نے جھلاہٹ ہی جھلاہٹ محسوس کی۔ اب ان کے لیے چائے بنانا پڑے

گی' ساتھ کباب تلنا پڑیں گے۔ چائے نہیں تو ٹھنڈا پلانا پڑے گا—— ہونہہ!

تولیے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے وہ لابی کی طرف آئی۔ موڈ درست کیا اور دروازہ کھولتے ہوئے انہیں خیر مقدم کہا۔ مصنوعی سی مسکراہٹ اس نے چہرے پر سجائی۔

سلام دُعا کے ساتھ ہی وہ لابی میں پڑے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ احوال پرسی ہوئی۔

"اپنا حال تو بہت خراب ہے۔" شازی نے کہا۔

"کیوں۔" شاہدہ نے پوچھا۔

"دیکھ لو سارے ہاتھ زخمی ہو رہے ہیں۔ سارا دن فرصت ہی نہیں ملتی۔"

"میں تو آئی تھی کہ کوئی تازہ چیز لکھی ہو گی۔ رسالے میں جانے سے پہلے ہی پڑھوں گی۔"

"لکھنا لکھانا دور کی بات ہے شاہدہ' سر کھجانے کی فرصت نہیں' خدا کے لیے کہیں سے نوکر نوکرانی کا بندوبست کر دو۔"

"میں نے تو کئی لوگوں سے کہہ رکھا ہے۔ ملے نا جب——"

"آپ مسز محمود——"

"آں—— ایک عورت ہے۔"

"ہائے اللہ کہاں ہے؟ پلیز جلدی سے اس کا اتہ پتا بتایئے۔ خدا آپ کا بھلا کرے گا۔"

مسز محمود اور شاہدہ ہنس پڑیں۔

"خدا قسم میں تو کام کر کر کے پاگل ہو گئی ہوں۔ اب تو ہمت جواب دے رہی ہے۔ بالکل نہیں ہو سکتا کام مجھ سے۔ ایک ختم کرتی ہوں تو دوسرا نکل آتا ہے یقین مانیں صبح سے لگی ہوئی ہوں ابھی دوپہر کا کھانا بنانا ہے۔ اور کپڑوں کا ڈھیر دھونے کو پڑا ہے۔"

مسز محمود بولیں۔ "کل میں اپنی بھابی کے ہاں گئی تھی۔ ان کے ہاں ایک عورت کپڑے دھو رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کوئی اچھا سا گھر ہو تو مجھے وہاں کام دلوا دیں۔"

"آپ کو میں یاد نہیں تھی۔"

"خدا قسم بالکل ذہن سے نکل گیا تھا۔"

"یہ بات ٹھیک تو نہیں نا مسز محمود۔" شاہدہ ہنس کر بولی۔ "مجھے تو واقعی اب شازی پر ترس آتا ہے۔"

"چلو میں آج ہی اس عورت کا پتہ کرواتی ہوں۔"

"مجھے بتادیں۔ آپ کی بھابی اے بلاک میں رہتی ہیں نا!"

"ہاں۔"

"کچھ دور تو نہیں۔ آجایا کرے گی۔"

"بالکل۔"

"تو پلیز آج ہی پتہ کروا دیجیے۔"

"ضرور مسز محمود۔" شاہدہ نے کہا۔ "میں بھی سفارش کروں گی — شازی کے پاس جب سے نوکر نہیں اس نے کچھ لکھا ہی نہیں۔"

"ضرور پتہ کرا دوں گی۔ بلکہ اسے بلا بھی دوں گی۔"

"دیکھو شازی — " شاہدہ نے کہا۔ "نوکرانی مل گئی تو اسی دن سے لکھنا شروع کرنا ہو گا۔"

شازی ہنس کر بولی۔ "فرصت ملے تو لکھوں گی۔ اللہ قسم اتنے غضب کے پلاٹ آتے رہتے ہیں ذہن میں۔ چاہتی ہوں لکھوں لیکن برتن مانجھنے' آٹا گوندھنے' روٹی پکانے' کپڑے دھونے—"

"بس بس تم نے تو کام ہی گنوانا شروع کر دیئے۔"

"کرنا پڑتے ہیں نا یہ سب کام۔"

"ہے تو مشکل۔"

"پھر لکھوں کب اور کیسے؟"

"خدا کرے مسز محمود تمہاری مشکل حل کر دیں۔"

"میں تمام عمر ان کا احسان نہیں بھولوں گی۔"

"اللہ—" مسز محمود نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "یہ بات ہے تو میں ابھی جاکر نوکر کو بھیجتی ہوں کہ اس عورت کو بلا لائے۔"

وہ اٹھنے لگی تو شازی جلدی سے بولی۔ "بیٹھیے ابھی۔ چائے وائے پانی وانی تو ہو جائے۔"

وہ بیٹھ گئی۔

شازی سکوئش بنالائی۔

پھر تھوڑی دیر باتیں ہوئیں۔ مسز محمود اٹھیں۔

"میں چائے بنا رہی ہوں۔" شازی نے کہا۔

"تمہاری نوکرانی کا بندوبست کرلوں پہلے — چائے پھر سہی۔"

"بہت بہت شکریہ۔"

"خدا کرے مل جائے۔"

"آمین۔"

شاہدہ نے کہا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ شازی نے صورت ہی ایسی بنا رکھی تھی۔

مسز محمود نے جاتے ہی نوکر کو بھابی کے گھر بھیج دیا۔ لیکن وہ عورت نہ ملی۔ وہ کپڑے دھو کر جاچکی تھی۔ اب تیسرے دن آنا تھا۔

شازی کو مایوسی تو ہوئی لیکن تیسرے دن کے انتظار میں دو دن بُرا بھلا کام کر کے وقت گزار ہی لیا۔

تیسرے دن دس ساڑھے دس بجے کے قریب مسز محمود اسے ساتھ لے کر آگئی۔ شازی کے اندر تو خوشی سے پھلجھڑیاں سی چھوٹ گئیں۔ نوکرانی خود چل کر آگئی تھی۔ وہ اسے اپنی خوش بختی تصور کرنے لگی۔

"آئیں مسز محمود—" اس نے دروازہ کھولا۔

"نہیں بھئی گھر اکیلا ہے۔ یہ عورت بھابی نے بھجوائی ہے۔ تم کام وام طے کرلو۔ میں چلی۔"

"تھینک یو۔"

مسز محمود چلی گئی۔ شازی نے اپنا شوق اور خوشی چھپاتے ہوئے کہا۔ "اندر آجاؤ۔"

وہ اندر آگئی۔ لابی میں اس نے ایک سرسری سی نگاہ اپنے گرد و پیش ڈالی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" شازی انٹرویو لینا نہیں چاہتی تھی۔ خدا خدا کر کے تو کام والی ملی تھی۔ اس نے تو تنخواہ کا بھی نہیں پوچھنا تھا — صرف تعارف مقصود تھا۔

"شیداں۔"

"نام رشیدہ ہو گا۔"

"جی۔ پر شروع سے شیداں ہی سُنا اپنا نام۔"

"کہاں کی رہنے والی ہو؟"

"گاؤں ہے۔ متراں والی۔"

شازی ہنس پڑی۔ بولی ”متر دوست کو کہتے ہیں۔ اچھا نام ہے گاؤں کا۔“

”ہاں۔“ وہ اداسی سے بولی۔ ”متراں والی گاؤں نام ہی کا ہے۔ دشمن ہی دشمن ہیں وہاں۔“

شازی نے پہلے دن ہی بے تکلف ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ بولی ”کون کون سا کام کر لیتی ہو۔“

وہ تلخی سے مسکراتے ہوئے بولی۔ ”بی بی —— عورت ہوں گھر کے سارے کام کر لیتی ہوں۔“

”کھانا بنا لیتی ہو —— میرا مطلب ہے روٹی بھی پکا لیتی ہو۔“

”جی۔“

”میرے میاں پھلکے کھاتے ہیں۔“

”پراٹھے پھلکے سب بنانے آتے ہیں بی بی۔“

شازی پر تو جیسے شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ روٹی پکانا ہی تو سب سے مشکل کام تھا —— پھر ناصر —— گرم گرم پھولے پھولے پھلکے کھانے کو مانگتا تھا —— بڑی مصیبت سے وہ پکا پاتی تھی۔

”سنو شیداں۔“

”جی —— !“

”اچھا کام کرو گی تو مجھ سے اچھا کوئی نہ ہو گا۔ کپڑا لتا بھی دوں گی، روٹی بھی، تنخواہ بھی —— ہوں۔ ایک بات تو یہ دوسری یہ کہ آدمی ایمان دار چاہیے مجھے۔ میرا گھر کھلا رہتا ہے کسی چیز کو کبھی تالا نہیں لگایا۔ سمجھ گئی ہو نا۔“

شیداں کے چہرے پر عجب سی محرومی اور مایوسی پھیلی تھی —— اس نے سر ہولے سے ہلایا۔ پھر بولی ”کیا کام کرنا ہے؟“

”ابھی برتن وغیرہ تو میں نے دھو لیے ہیں۔ تم کپڑے دھو ڈالو ——“

”اچھا ——“

شازی اٹھی اسے پچھلے برآمدے میں لے گئی جہاں واشنگ مشین اور کپڑوں کا چھوٹا سا ڈھیر پڑا تھا۔

”مشین میں کپڑے دھونا آتے ہیں۔“ شازی نے پوچھا۔

”اس بی بی نے سکھا دیئے ہیں۔“ وہ بولی۔

”تو دھو ڈالو یہ کپڑے۔ ہاں بچوں کے کپڑے کہیں کہیں سے ہاتھ سے ملنا پڑیں گے۔“

”آپ فکر نہ کریں بی بی۔“

”یہ نل ہے۔ یہ پائپ۔ اس سے مشین میں پانی بھر لو۔ اور یہ سرف کا ڈبہ ہے۔ پانی بھرو سرف میں خود ڈال دوں گی۔“

شیداں نے پائپ نل سے لگا کر دوسرا سرا مشین میں رکھ دیا۔ اور خود سفید اور رنگ دار کپڑے الگ الگ کرنے لگی۔

وہ یقیناً کم گو تھی۔ شازی پاس ہی کھڑی تھی لیکن اس نے کوئی بات نہیں کی۔

شازی کرسی گھسیٹ کر وہیں بیٹھ گئی۔ پنکھا چل رہا تھا۔ آج موسم بھی قدرے کم گرم تھا۔ برآمدے میں اس وقت خوشگوار فضا تھی۔

شیداں کام میں مصروف ہو گئی۔ شازی اسے دیکھنے لگی۔ کچھ زیادہ ہدایات دینے کی ضرورت نہ پڑی۔ وہ مشین میں کپڑے دھونا جانتی تھی۔

شیداں کی عمر بیس اکیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن محنت اور غربت نے عمر پر دس سال آگے کی چھاپ لگا دی تھی۔ شازی اسے دیکھتے ہوئے یہی سوچ رہی تھی۔ اس کے نقش و نگار بھدے تھے۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ جسم شاید کبھی متوازن ہو لیکن اب ڈھلکا ڈھلکا لگ رہا تھا۔ وہ کام تیزی سے کر رہی تھی۔ ہمت اور طاقت والی لگتی تھی۔

وہ کپڑے دھو دھو کر تار پر ڈال رہی تھی۔ شازی کبھی کوئی بات کرتی تو اس کا مختصر سا جواب دے دیتی۔

کپڑوں کے بعد شازی اسے کچن میں لے آئی۔ دوپہر کا کھانا بنانا تھا۔ اس نے گوشت، سبزی اسے فریج سے نکال کر دی۔ نمک مرچ خود ڈالی، پکانے کا طریقہ بتایا۔ آٹا گوندھنے کے لیے اور سلاد بنانے کے لیے بھی کہہ دیا۔

اور

خود لابی میں آ گئی —— آج اسے فراغت ملی تھی، وقت بھی تھا۔ وہ کاغذ قلم لے بیٹھی۔ اتنے دنوں سے ذہن میں پلاٹ گھوم رہے تھے۔ اور ذہن ہی میں وہ ان کی نوک پلک سنوار رہی تھی۔ اس لیے لکھنے کا موڈ بن گیا ——

وہ لکھتی چلی گئی۔

"ہانڈی پک گئی ہے بی بی۔ اب کیا کرنا ہے؟"

شازی جلدی سے اٹھی۔ کاغذ قلم میز پر رکھا اور کچن میں آ گئی۔

کچن کا رنگ ہی اور تھا۔ صاف ستھرا اور ہر چیز ٹھکانے پر تھی۔ شازی نے ککر کھول کر دیکھا۔ سالن کی رنگت بتا رہی تھی کہ اچھا پکا ہے۔ اس نے چمچ سے نمک چکھا۔ سب ٹھیک تھا۔

"آٹا گوندھ لیا ہے۔"

"جی ——"

"سلاد؟"

"جی ——"

شازی نے پلیٹ دیکھی۔ پیاز موٹا موٹا کٹا ہوا تھا۔ سبز مرچیں بھی موٹی کٹی تھیں۔

"پیاز بہت باریک کاٹا کرو سلاد کے لیے —— اور یہ مرچیں بھی —— ٹماٹر کی گول گول ٹکڑیاں ہوں۔ سمجھیں۔ کل میں تمہیں بنا کر دکھاؤں گی۔"

"اچھا جی۔"

"بس اب تھوڑی دیر بیٹھو۔ صاحب اور بچے آنے والے ہی ہیں۔ ان کے آنے پر پھلکے اتارنا۔"

"کوئی اور کام ہو تو کرلوں اتنی دیر میں۔"

"آں —— کام —— ہاں ڈسٹنگ نہیں کی تھی آج۔ آؤ میں جھاڑن دیتی ہوں تم جھاڑ پونچھ کرلو۔"

وہ اسے سب کمروں میں لے گئی اور ڈسٹنگ کرنے کو کہا۔ "ایک ایک چیز سے گرد صاف کرنا۔"

"اچھا جی۔"

شازی پھر لابی میں آگئی اور اپنا نامکمل افسانہ مکمل کرنے لگی۔

دوپہر کے کھانے کی میز بھی شازی نے شیداں سے لگوائی —— پلیٹیں، کوارٹر پلیٹیں، نیپکن وغیرہ رکھنے کا طریقہ سکھایا۔ شیداں نے بڑے مہین مہین پھلکے بنائے۔ گرم

گرم پھلکے اور مزے دار سالن، کئی دنوں بعد سب نے کھانا پیٹ بھر کر کھایا۔

شیداں کھانا لے کر چلی گئی۔ شازی نے اپنا وائل کا جوڑا بھی اسے دیا۔ اور صبح جلدی آنے کا کہا۔

آدھا دن کام بھی غنیمت تھا۔ شازی نے سوچ لیا کہ آہستہ آہستہ وہ اسے پورے دن کے لیے اپنے ہاں کام پر رکھ لے گی۔

وہ باقاعدگی سے آنے لگی۔ دوپہر دو اڑھائی بجے کھانا لے کر چلی جاتی۔ تقریباً سارا ہی کام اس نے اپنے ذمہ لے لیا تھا اور بڑے سلیقے اور صفائی سے کام کرتی تھی۔

ایک دن اس نے خود ہی شازی سے کہا۔ "بی بی اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی بچی کو ساتھ لے آیا کروں۔"

"کتنے بچے ہیں؟"

"صرف ایک بچی ہے۔"

"کتنی عمر ہے اس کی؟"

"کوئی چار سال کی ہو گی۔"

"اسے کس کے پاس چھوڑ آتی ہو؟"

"جن کے پاس رہتی ہوں۔"

"کون ہیں وہ؟"

"دور پار کے رشتہ دار ہیں۔ سر چھپانے کو جگہ دے دی لیکن بچی کی دیکھ بھال کوئی نہیں کرتا۔ میں یہاں ہوتی ہوں وہ ادھر ادھر پھرتی رہتی ہے۔"

"تو لے آیا کرو اسے بھی۔"

"اسے ساتھ لے آیا کروں گی تو شام تک یہاں رہا کروں گی۔"

شازی کے من کی مراد جیسے بھر آئی۔ جلدی سے بولی۔ "ٹھیک ہے لے آیا کرو۔"

"اللہ آپ کو راضی رکھے میں اس کے لیے بڑی پریشان تھی۔"

"خاوند کیا کرتا ہے تمہارا۔"

شیداں کو دھچکا سا لگا جسے شازی نے محسوس کیا۔

"ہوں۔"

"مر گیا ہے۔"

"اوہ۔۔۔ تو تم ماں بیٹی ہو۔"

"جی۔۔۔"

"پھر تو تم دن رات یہیں رہ سکتی ہو۔"

شیداں نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ یوں لگا جو بات سنی ہے وہ نہیں سُنی۔

"ہاں پیچھے کوارٹر ہے۔ میری پہلی مائی اس میں رہتی تھی۔ اس کا صندوقچہ ہی پڑا ہے یا گھر کا کچھ فالتو سامان ہے۔ تم صاف کرلو کوٹھڑی اور یہیں اُٹھ آؤ۔"

"آپ نے میری مشکل آسان کردی بی بی۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ رشتہ دار کب کسی کے بنتے ہیں۔"

دوسرے دن صبح سویرے وہ اپنی بچی کو ساتھ لے آئی۔ وہ اس کی انگلی پکڑے کچن میں آئی۔ اسے ایک سٹول پر بٹھا کر شازی اور ناصر کے لیے چائے بنانے لگی۔

وہ ابھی اپنے بیڈروم میں تھے۔ کئی دنوں سے شیداں ہی بیڈ ٹی بنا کر انہیں دے رہی تھی۔

شازی نے لیٹے لیٹے پوچھا۔ "لے آئی ہو بیٹی کو۔"

"جی۔"

ناصر نے پیالی ہاتھ میں لیتے ہوئے شیداں کی طرف دیکھا۔ "بیٹی بھی ہے تمہاری۔"

"ہاں۔۔۔" شازی بولی۔ "اب یہ یہیں رہا کرے گی۔ اماں کرمو والا کوارٹر اپنے لیے ٹھیک کرلے گی۔"

"اماں کرمو آ گئی تو۔۔۔"

"مت آئی وہ۔۔۔ اس کا داماد دوبئی میں ہے اب کام نہیں کرنے دے گا اسے۔"

دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر وہ کچن میں آ گئی۔ رات کے جھوٹے برتن پڑے تھے وہ انہیں دھونے لگی۔

بچے اٹھ گئے۔ شازی انہیں تیار کرنے لگی۔ ناصر بھی شیو کرنے لگا۔ بچوں نے سکول اور ناصر نے دفتر جانا تھا۔

شیداں نے معمول کے مطابق ناشتہ میز پر لگا دیا اور خود بچی کے پاس کچن میں آ بیٹھی۔

شازی بچوں کا ٹفن باکس دھونے کے لیے شیداں کو دینے کچن میں آئی تو سٹول

پر بیٹھی بچی کو دیکھ کر دنگ سی رہ گئی۔

چند لمحے تو وہ ششدر سی اسے دیکھتی رہی۔

"سلام کر بی بی جی کو سوہنئے۔۔۔"

بچی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے دھلے ہوئے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔

"یہ۔۔۔ یہ تمہاری بچی ہے۔" شازی نے حیرانگی سے شیداں کو دیکھا۔

وہ بڑے تفاخر سے بولی۔ "جی۔"

شازی کو یقین نہیں آیا اور پل بھر میں اس کے ذہن میں کئی مفروضے رینگ گئے۔

یہ اس کی بچی نہیں ہو سکتی۔

اغوا نہ کی ہو۔

جائز نہ ہو' گناہ حسین ہوتا ہے۔

اس کا باپ خوبصورت ہوگا لیکن شیداں سے شادی کیسے کی ہوگی اس نے۔ شیداں تو قبول صورت بھی نہیں۔

"میری ہی بچی ہے بی بی۔۔۔" اس کی ذہنی کیفیت شاید شیداں بھانپ گئی۔ ٹھنڈی اور گہری آہ بھر کر بولی۔

شازی نے پھر بچی کو دیکھا۔ سرخ و سپید چمکتا دمکتا چہرہ' بڑی بڑی سیاہ آنکھیں' پیازی بھرے بھرے ہونٹ' چمکتے سیاہ بال' جسم پھولا پھولا۔ وہ صرف خوبصورت بچی ہی نہ تھی اس کے چہرے پر تمکنت اور وقار بھی محسوس ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔

ناصر کی آواز پر شازی چونکی اور کھانے کے کمرے میں آ گئی۔ اس کا ذہن ابھی تک یہ بات قبول نہیں کر رہا تھا کہ یہ بچی شیداں کی ہے۔

ناصر اور بچے چلے گئے تو شازی لابی میں آ گئی۔ شیداں اور بچی کو اس نے ناشتہ دینا تھا۔ میز پر اپنے کاغذ سمیٹ کر رکھے اور پھر کچن میں آ گئی۔

"ناشتہ کر لو تم بھی۔" شازی نے کہا۔

"اچھا جی۔" شیداں بولی۔ بچی ٹکر ٹکر شازی کو تکے جا رہی تھی۔ شازی نے پراٹھا' دو توسٹ اور تھوڑا سا سالن سٹین لیس سٹیل کی تھالی میں ڈال کر شیداں کی طرف بڑھایا۔ یہ برتن اس نے نوکروں کے لیے رکھے تھے۔ پھر دیسی مگ میں چائے بنائی اور شیداں کو دی۔

"بچی بھی چائے پیئے گی۔" شازی نے پوچھا۔

"پی لے گی۔"

شازی نے دوسرا دیسی مگ اٹھایا اور چائے بنا کر اسے دے دی۔ اس نے دیکھا بچی ان چیزوں کو دیکھ کر منہ بنا رہی تھی۔

شازی کچن سے جانے لگی تو شیداں قدرے خفت سے بولی:

"بی بی جی——"

"ہوں۔"

"کوئی پرانی پلیٹ دے دیں اور پیالی بھی۔"

"کیوں؟"

"یہ چینی کے برتنوں کے سوا کھانا نہیں کھاتی۔"

شازی نے حیرانگی سے شیداں اور بچی کو دیکھا۔ پھر دل ہی دل میں غصے سے بڑبڑائی۔ عجیب ہی نخرے ہیں۔

"اس مگ میں چائے دودھ بھی نہیں پیے گی۔" شیداں نے بیچارگی سے کہا۔

شازی کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ ڈر تھا کہیں اسی بات پر شیداں کام ہی نہ چھوڑ دے اور شیداں کو تو اب وہ کسی صورت جانے دے ہی نہ سکتی تھی۔ سارا جنجال' سارے کام اس نے سنبھال لیے تھے۔ اب تو دن رات اس نے یہیں رہنا تھا۔ اس لیے معمولی بات تھی کہ ایک چینی کی پلیٹ' پیالی اور شیشے کا گلاس اسے بچی کے لیے دے دے۔

کئی برتن فالتو پڑے تھے۔ اس نے یہ برتن نکالے اور چپ چاپ شیداں کو دے دیے۔ پھر وہ ایسے ہی کچن میں کھڑی چیزیں اٹھاتی دھرتی رہی۔ اس نے دیکھا کہ شیداں نے چھوٹی ٹیبل سٹول کے آگے رکھی' لڑکی کو بٹھایا اور پلیٹ میں صاف ستھرا ناشتہ لگایا۔ پیالی میں چائے انڈیلی۔

"کھالو—— جیہ——"

شازی نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ بچی بڑی نفاست سے ناشتہ کرنے لگی۔ شیداں نے جیب سے رومال نکال کر نیپکن کے طور پر بچی کے گھٹنوں پر ڈال دیا تھا۔

شازی نے منہ بنایا اور کچن سے باہر آ گئی۔ اسے بچی کے انداز نہیں بھائے۔ نہ ہی شیداں کے ناز نخرے اٹھانا اچھا لگا۔ شیداں کو غربت میں یہ باتیں زیب نہ دیتی تھیں۔

دوپہر کا کھانا بھی بچی نے اسی طرح کھایا۔

بچے سکول سے آ گئے۔ اس بچی کو دیکھ کر دونوں بہت خوش ہوئے۔ شازی نے دیکھا جیہ ان بچوں کے التفات سے زیادہ خوش نہ ہوئی۔ نہ ہی وہ ان کی طرف خود بڑھی۔ بچوں نے ہی اس سے بے تکلفی پیدا کی اور اپنے ساتھ کھلانے کے لیے لے گئے۔

بچی کی عادتیں بڑی ٹھہری اور سلجھی ہوئی تھیں۔ اس کی عمر صرف چار سال تھی۔ لیکن اس کا رکھ رکھاؤ' تمکنت اور وقار چھپائے نہ چھپتا تھا۔ غریب ماں کی بیٹی کی عادتیں بھی انوکھی تھیں۔ خاص کر چینی کے برتنوں میں کھانا پینا' نیپکن استعمال کرنا' کسی کو لفٹ نہ دینا' اِک انداز بے نیازی تھا اس میں۔

شازی نہ رہ سکی۔ شیداں فارغ ہو کر چند لمحوں کو قریب آ بیٹھی تو وہ بولی "شیداں۔"

"جی——"

"یہ تیری بچی کس پر گئی ہے؟"

"اپنے باپ پر۔"

"اس کا باپ بہت خوبصورت تھا۔"

اس نے ایک گہری ٹھنڈی آہ بھری—— اور دکھ سے کراہتی آواز میں بولی "جی۔"

"لیکن——تم——" شازی بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو گئی۔

شیداں پھر دکھ سے کراہی اور بولی۔ "یہ اک کہانی ہے بی بی۔ دکھ بھری کہانی۔"

شازی اک دم چونکی۔ اس کی طرف غور سے تکتے ہوئے بولی۔

"کہانی۔"

"ہاں بی بی۔ کہانی ہی کہوں گی۔"

وہ بڑی دکھی نظر آ رہی تھی۔

شازی کی دلچسپی چھپی نہ رہ سکی۔ اس نے شیداں سے کہا۔ "لگتا ہے کوئی حادثہ ہے تمہاری زندگی کا۔"

شیداں مضطرب و بے چین نظر آنے لگی۔ آہستگی سے بولی۔ "کبھی سناؤں گی آپ کو۔"

"ابھی سناؤ نا۔"

"کام کرنا ہے بی بی۔ جب فارغ ہوؤں گی تو سن لینا۔"

"کام ہوتا رہے گا۔ میں اس وقت فارغ ہوں—— تو بھی—— سچی بات کہوں

شیداں تمہاری بچی کو دیکھ کر مجھے تجسس ہو رہا ہے۔"

اس نے سر ہولے سے ہلایا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

"یقین نہیں آرہا کہ اتنی خوبصورت بچی تمہاری ہو سکتی ہے۔"

وہ بڑے تلخ انداز میں مسکرائی اور بولی۔ "کسی کو بھی یقین نہیں آتا لیکن اس کی شکل وصورت اپنے باپ پر گئی ہے۔ صرف شکل وصورت ہی نہیں۔ اس کی عادتیں بھی باپ پر گئی ہیں۔ چوہدری بڑے رکھ رکھاؤ والا نفاست پسند آدمی تھا۔" شازی ایک بار پھر چونکی۔ کیا یہ کسی بڑے چوہدری کے ظلم کا نشان ہے؟ اس نے سوچا۔ وہ افسانہ نگار تھی اس لیے اس کے ذہن میں جھٹ سے پلاٹ آجاتے تھے۔ اس نے لمحوں میں شیداں، بچی اور چوہدری کے متعلق بہت کچھ سوچ ڈالا۔

شیداں سوچوں کے بھنور میں ڈوب کر اُبھر رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ گردوپیش سے غافل ہو رہی ہے۔

وہ خود ہی بولی۔ "متراں والی میں میرا باپ موچی تھا۔ وہاں ایک جھونپڑا تھا ساتھ ہی تھوڑی زمین تھی۔ جس میں سبزیاں اُگا لیتے تھے ہم۔ میری ماں مر گئی تھی۔ میں اور بابا ہی تھے۔ گزر بسرا اچھی ہو جاتی تھی۔ گاؤں میں زیادہ پیسے کی ضرورت بھی تو نہ تھی۔ پھر گاؤں کے چوہدری کی حویلی میں بھی آنا جانا تھا۔ چمڑے کے سینے کا یا مرمت کا کوئی کام ہوتا تو بابا ہی کرتا تھا۔ جوتوں کی مرمت بھی بابا کے ذمے تھی۔ ہماری کفالت بہت حد تک حویلی والے ہی کرتے تھے۔ میں بچپن ہی سے حویلی جایا کرتی تھی۔ اپنے جھونپڑا نما مکان کے مقابلے میں یہ محل نما حویلی اور اس کی آرائش وزیبائش بہت اچھی لگتی تھی۔ حویلی میں بہت لوگ رہتے تھے۔ بڑے چوہدری، ان کے بھائی، ان کی بہنیں، ان کی آل اولاد۔ چوہدری صاحب کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ یہ سب عمر میں مجھ سے بڑے تھے۔ چوہدرانی بڑی نیک عورت تھی۔ وہ اپنی بیٹیوں کے کپڑے مجھے دے دیا کرتی تھی۔ جنہیں میں ٹھیک کرائے بنا ہی پہن لیا کرتی اور سارے گاؤں میں ان کے ریشمی کپڑے پہن کر اتراتی پھرتی تھی۔ چوہدرانی کی اس شفقت وعنایت کے بدلے میں ان کے چھوٹے موٹے کام کر کے خوشی محسوس کرتی۔ حالانکہ حویلی میں نوکروں کی کمی نہ تھی۔ غریب غریب مزارعے اور ان کی بیویاں اور بیٹیاں بھی ہر وقت خدمت کے لیے کمربستہ رہتی تھیں۔ پھر بھی چوہدرانی اپنے کام مجھ ہی سے کرواتی تھی۔ اسے پاؤں دبوانے کی عادت

تھی۔ اور میں گھنٹوں اس کے رنگین پلنگ کے صاف ستھرے بستر پر بیٹھی اس کے پاؤں دبایا کرتی۔ میرا جی چاہتا کہ میں سارا دن ساری رات اس کے پاؤں دباتی رہوں۔ ایسا پلنگ اور ایسا بستر میرے پاس کہاں ہوتا تھا۔ میں تو صاف ستھرے نرم نرم بستر اور رنگین پلنگ پر بیٹھنے کی خوشی میں اس کے پاؤں دبایا کرتی تھی۔

شیداں اپنی رو میں کہے جا رہی تھی۔ اس نے دیوار کے ساتھ کمر ٹکا رکھی تھی۔ اور اس کے چہرے پر جذبات کے دھارے بہہ رہے تھے۔ کبھی خوشی کا تاثر ہوتا، کبھی اداسی کا۔

وہ اپنے بچپن اور غریبی کی باتیں تفصیل سے بتا رہی تھی۔ اور حویلی کے جلال و شکوہ کے حوالے سے اپنی خواہشات کا بھی ذکر کر رہی تھی۔

"ہوں۔" شازی نے کہا۔ وہ بھی اس کی کہانی سننے میں محو تھی۔

"میں کوئی بارہ تیرہ برس کی تھی بی بی جی۔ جب چوہدرانی بیمار پڑ گئی۔ وہ بیمار پڑی اور میں اس کی خدمت کے لیے مستقلاً حویلی میں آ گئی۔

چوہدری نے میرے باپ کو حویلی میں بلا کر کہا۔ شیداں کو چوہدرانی کے پاس چھوڑ دے۔ وہ اس سے بہت مانوس ہے۔"

"آپ ہی کی بیٹی ہے چوہدری جی۔" بابا نے کہا۔

"چوہدرانی کہتی ہے شیداں ہی میرے پاؤں دبایا کرے۔ بچپن سے یہی اس کے پاؤں دباتی آئی ہے۔ گھر میں نوکر ہیں، رشتہ دار ہیں۔ لیکن اس کو تو شیداں کے ہاتھوں کا ہی مزہ پڑ گیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں چوہدری صاحب۔"

بابا نے مجھے چوہدرانی کی خدمت کے لیے بھیج دیا۔ میں دن میں ایک آدھ چکر بابا کے پاس بھی لگا جاتی۔ چوہدرانی مجھ سے بیٹیوں کی طرح پیار کرتی۔ اس کی اپنی بیٹیاں تو بیاہی جا چکی تھیں، بیٹے بھی تعلیم کے لیے باہر گئے ہوئے تھے۔ میں اس کی تن من سے خدمت کرنے لگی۔ صرف پاؤں دبانا ہی میرا کام نہیں تھا، اسے نہلانا دھلانا، کپڑے بدلوانا، کنگھی کرنا، سر میں گھی ڈالنا، بدن پر مالش کرنا، سب میرے ذمے تھا۔ پھر بھی میں خوش تھی۔ میرا سارا دن چوہدرانی کے سجے سجائے کمرے میں گزرتا۔ میں صاف ستھرے کپڑے پہنتی، روز بالوں میں کنگھی کرتی۔ دنوں ہی میں مجھے اپنا جھونپڑا اور غربت بھول سی گئی۔

"چوہدری بڑا اونچا لمبا اور خوبصورت آدمی تھا۔ شاید میرے بابا سے بھی بڑا ہو

لیکن خوب صحت منداور گورا چٹا تھا۔ رنگ تو گلابی چائے کی طرح تھا۔ میری جیبہ دیکھی ہے نا۔ اس کا نقشہ باپ پر ہی ہے۔"

"پھر تو چوہدری واقعی خوبصورت آدمی ہوگا۔" شازی بولی۔ وہ اپنے من میں بے تابی پا رہی تھی۔ شیداں کا قصہ سننے میں اسے لطف آ رہا تھا اور ذہن میں کردار و واقعات کہانی کا تانا بانا بُن رہے تھے۔

چوہدری' چوہدرانی کے کمرے میں دن میں کئی دفعہ آیا کرتا تھا۔ چوہدرانی کا علاج معالجہ بھی ہو رہا تھا لیکن وہ اچھی ہونے کے بجائے گھلتی جا رہی تھی۔ چھ ماہ میں وہ چارپائی سے لگ گئی۔ اس کے تینوں بیٹے باہر کے ملک سے ماں کو دیکھنے آئے۔ چھوٹی بیٹی بھی مہینہ بھر رہ کر گئی۔ بڑی بیٹی بھی کبھی کبھی آجاتی۔

چوہدری چوہدرانی کو بڑی تسلی دیا کرتا۔ اس کی بیماری سے متفکر بھی رہتا تھا اور مجھے اس کی خدمت کرنے کی تلقین کرتا تھا۔

"پھر۔۔۔" وہ چند لمحے رُکی تو شازی بے تابی سے بولی۔

شیداں چوہدرانی کی بیماری کا لمبا چوڑا قصہ سنانے لگی۔

"ہوں۔" شازی بولی۔

"پھر بی بی۔۔۔ کیا کہوں۔ کیا بتاؤں؟"

"بتاؤ نا۔"

"چوہدرانی تو بیمار پڑ گئی تھی۔ چوہدری ہٹا کٹا تھا۔"

"ہوں۔"

"جانے کیوں اس کی نظریں بدل گئیں۔ وہ مجھ میں دلچسپی لینے لگا۔"

"تجھے کیسے پتہ چلا تھا شیداں۔" شازی نے کہا۔ تو شیداں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ سر جھکائے ہوئے بولی۔ "ایک دن چوہدرانی سو رہی تھی کہ وہ کمرے میں آگیا۔"

"ہوں۔۔۔" شازی کا دل دھڑکنے لگا۔ جلدی سے بولی۔ "پھر۔۔۔ پھر کیا ہوا؟"

"ہوا تو کچھ نہیں۔۔۔" وہ اطمینان سے بولی۔ "اس نے چوہدرانی کو آواز دی۔ وہ نہ بولی۔ تو مجھے پکارا۔ میں اُٹھ بیٹھی۔ وہ بولا "میرے کمرے میں آؤ۔"

"تو چلی گئی۔" شازی گھبراہٹ میں بولی۔

"ہاں۔"

"پھر۔"

"پھر۔ پھر اس نے مجھ سے زبردستی کرنا چاہی لیکن میں۔۔۔"

"تو نے کیا کیا۔۔" شازی کی آنکھیں پھیلی تھیں اور وہ دل تھامے قصہ سن رہی تھی۔

شیداں ہولے سے مسکرائی اور بولی۔ "میں کھڑکی سے کود کر بھاگی اور حواس باختہ سی چوہدرانی سے آکر لپٹ گئی۔"

"پھر۔۔۔"

"چوہدرانی کو میں نے ساری بات بتادی۔ میں نے رو رو کر بُرا حال کرلیا۔" وہ چپ ہوگئی۔

شازی نے چند لمحے انتظار کے بعد پوچھا۔

"پھر کیا ہوا؟"

پھر جو کچھ ہوا شیداں نے تفصیل سے بتایا۔ چوہدرانی کی چوہدری سے لڑائی' چوہدرانی کی بے بسی'۔۔۔ کئی دن کی بحث و تکرار۔۔۔ اس نے سب کچھ بتایا۔

"بالآخر۔۔۔" وہ بولی۔ "چوہدرانی نے چوہدری سے کہا کہ وہ مجھ سے نکاح کرلے۔ ساری عمر گناہ نہیں کیا اب کیوں گناہ پر آمادہ ہے۔ لیکن چوہدری شاید اک موچن لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یا یہ خیال تھا کہ میں اس کی چھوٹی بیٹی سے بھی چھوٹی ہوں۔"

"پھر۔۔۔" شازی کا لہجہ بے تاب تھا۔

"چوہدرانی اور چوہدری میں مصالحت ہو ہی گئی۔ چوہدرانی سدا کی روگی بن گئی تھی۔ چوہدری بیوی کے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ اس لیے مجھ سے نکاح کرنے پر آمادہ ہوگیا لیکن ایک شرط ضرور رکھی۔"

"کیا۔۔۔ ؟"

"کہ اس نکاح کا گاؤں تو کیا حویلی میں بھی کسی کو پتہ نہ چلے۔"

"تیرا ابا باراضی ہوگیا؟"

"ہاں وہ کیا کرتا۔۔۔ اور پھر میں خود بھی تو راضی تھی' خوش تھی۔ بی بی اتنی خوبصورت اور شاندار حویلی تھی۔ چوہدری خود بڑا خوبرو تھا۔ اس کا کمرہ بی بی۔۔۔ بس میں تو ان ہی چیزوں پر ریجھ گئی۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"تین چار بندے چوہدری کے کمرے میں آئے۔ میں نے لال جوڑا اور زیور پہنا۔ پتہ نہیں کس نے نکاح پڑھا اور میں چوہدری کی بیوی بن گئی۔"

"ہوں۔"

"میں تو خوشی سے پاگل ہو گئی بی بی۔"

"تیری شادی کا حویلی والوں کو پتہ نہ چلا؟"

"خیر چھپتی کیسے بات — لیکن سب نے یہی سمجھا کہ چوہدری نے بے نکاحی شیداں اپنے پاس رکھی ہوئی ہے۔"

"ہوں —"

ان کی کُھسر پُھسر سے میں بھی شک میں پڑ گئی۔ میں نے چوہدری سے کہا کہ مجھے نکاح نامہ دکھائے۔ یہی سُنا تھا کہ نکاح پڑھوایا جاتا ہے اور پھر کاغذوں پر لکھا جاتا ہے۔

چوہدری ہنس پڑا۔ کہنے لگا "شک کرتی ہے نکاح پر۔" میں نے جواب دیا۔ "میں شک نہیں کرتی حویلی والے شک کرتے ہیں اس لیے بہتر ہے کہ مجھے نکاح نامہ دے دو۔"

"کچہری سے لا دوں گا۔" اس نے کہا۔ "میں مطمئن ہو گئی۔ اسی مہینے میرے بابا فوت ہو گئے لیکن مجھے ان سے بچھڑنے کا زیادہ دکھ نہیں ہوا کہ میں چوہدری کے بازوؤں میں محفوظ تھی۔"

"چوہدرانی کا رویہ تجھ سے کیسا تھا۔"

"بس ظاہر تو کچھ نہیں کرتی تھی۔ ویسا ہی پیار ظاہر کرتی تھی لیکن بہت پریشان اور دکھی ہو گئی تھی۔"

"تو اس کی ویسے ہی خدمت کرتی تھی۔"

"میں — میں تو اب چوہدری کی محبوبہ تھی بی بی۔ وقت ملتا تو چوہدرانی کے پاس جاتی، نہیں تو چوہدری کی خواب گاہ ہی میں کھلی آنکھوں سے حسین خواب تکا کرتی۔"

"یہ قدرتی امر تھا۔" شازی بولی۔

"ہاں۔"

"پھر —"

"پھر میرے پیٹ میں جیہ پلنے لگی۔ اب مجھے واقعی نکاح نامے کی ضرورت تھی۔ میں نے چوہدری پر زور دیا تو ایک دن وہ سرکاری کاغذات لے آیا۔ دو تین جگہ میرے انگوٹھے لگوائے۔ میں پڑھی لکھی نہ تھی۔ چوہدری نے جو کچھ کہا میں نے یقین کر لیا۔ اس نے تسلی دی۔ "تو میری قانونی بیوی ہے۔ اور تیرا بچہ میرے دوسرے بچوں کی طرح میری زمین اور جائیداد کا وارث ہو گا۔"

شازی ٹھوڑی مٹھی پر رکھے صوفے پر بیٹھی شیداں کو تکے جا رہی تھی۔

"میں نے وہ کاغذ چوہدری سے لینا چاہا تو وہ بولا ابھی چند دن ٹھہرو سرکاری مہریں لگ جائیں تو لے لینا۔ پھر کئی دنوں بعد وہ کاغذ اس نے مجھے دکھا کر اپنی سیف میں رکھ لیے۔ اب میں بے فکر تھی۔ حویلی میں کسی کی دبے لفظوں میں بھی ایسی ویسی بات سنی تو پنجے جھاڑ کر ان کے پیچھے پڑ جاتی۔ جیہ پیدا ہوئی تو خوب باتیں بنیں۔ لیکن مجھے پروا کب تھی۔ وقت گزرتا گیا۔"

"ہوں۔" شازی سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"چوہدرانی فوت ہو گئی۔ بچے ماں کی فوتیدگی پر اکٹھے ہوئے۔ حویلی والوں نے ان کے کان بھرے۔ وہ باپ کے کمرے میں جمع ہو گئے۔ دروازے بند کر کے جانے کیا کیا باتیں ہوئیں مجھے کچھ پتہ نہ چلا۔ پھر سب چلے گئے۔ جیہ چوہدری کے زیر سایہ پلنے لگی۔ چوہدری بڑا نفاست پسند تھا۔ کبھی میلا لباس میں نے اس کے جسم پر دیکھا نہیں تھا۔ صاف ستھرے چینی کے برتنوں میں کھانا کھاتا تھا۔ گلاس پر ذرا بھی نشان پڑ جاتا تو گلاس توڑ دیتا تھا — جیہ کی یہ عادتیں باپ پر ہی گئی ہیں — ورثے میں اس نے یہی پایا ہے۔"

"لیکن تو اس حال کو کیسے پہنچی شیداں۔" شازی غیر متعلقہ باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

"پچھلے سال چوہدری مر گیا۔"

"مر گیا؟"

"ہاں بی بی — ایک دم ہی مر گیا — دل کا دورہ پڑا اور اسی میں بیت گیا۔"

"او ہو۔"

"وہ کیا مرا میرے لیے سب ہی مر گئے۔ اس کے بیٹے بیٹیوں کو اطلاع ملی۔ سب آن پہنچے۔" وہ رک گئی۔

"پھر—— شازی نے جلدی سے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

وہی جو ہونا تھا کسی نے بھی مجھے چوہدری کی بیوی تسلیم نہ کیا۔ مجھے دھتکار ااور حویلی سے نکل جانے کا حکم دیا۔ میں اڑ گئی—— میں شیر تھی کہ میرا نکاح نامہ سیف میں پڑا ہے۔ اس لیے میں بھی مقابلے کے لیے ڈٹ گئی۔ چوہدری کے بڑے بیٹے نے جب مجھے طعنہ دیا اور بتایا کہ اس کے باپ نے کوئی نکاح وکاح نہیں کیا تو میں چیخ کر بولی۔ "سیف کھولو اور دیکھ لو نکاح نامہ——" سب پر کچھ اوس سی پڑ گئی۔ سیف کھولی گئی۔ کئی کاغذات نکلے۔ وہ لفافہ بھی نکلا جس میں میرے انگوٹھوں کے نشانوں والا کاغذ تھا۔

وہ چپ ہو گئی۔ اس کے چہرے پر درد اور اذیت کے سائے لہرا رہے تھے۔

شازی بے تابی سے بولی۔ "تب انہوں نے تمہیں چوہدری کی بیوی تسلیم کر لیا؟"

"کہاں بی بی۔"

"کیوں؟"

"وہ کاغذ نکاح نامہ نہیں تھا۔"

"تو کیا تھا؟"

وہ تلخی سے ہنسی اور آنسوؤں سے رندھی آواز میں بولی۔ "وہ نکاح نامہ نہیں مختار نامہ تھا۔ میرے باپ کے مکان اور ملحقہ زمین کا۔ مجھ سے چوہدری نے مختار نامہ لے کر دونوں چیزیں اپنے نام کروا لی تھیں۔"

"اوہ خدایا——" شازی کا دماغ جیسے چکرا گیا۔ "دنیا میں یوں بھی ہوتا ہے؟"

"ہوتا ہے بی بی دیکھ لو مجھے۔"

شیداں حویلی سے نکلنے اور در در کی ٹھوکریں کھانے کی داستان بیان کرنے لگی۔ شازی جیسے سن ہی رہی تھی۔

شیداں کہہ رہی تھی۔ "اور تو جیہ کو باپ کا کچھ نہیں ورثے میں ملا، یہ عادتیں پائی ہیں۔ میں ان سے پریشان رہتی ہوں بی بی—— میں تو غریب موچی کی بیٹی تھی لیکن جیہ—— اس کی یہی عادتیں رہیں تو کیا ہو گا؟

شازی بھی یہی سوچ رہی تھی۔

شیداں ٹھنڈی آہیں بھرتی اور آنچل سے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پونچھتی کچن میں چلی گئی۔

شیداں کی کہانی من گھڑت تھی یا سچی، اس کا نکاح چوہدری سے ہوا بھی تھا یا نہیں۔ شازی یہ بات نہیں سوچ رہی تھی۔ اس کی سوچوں کا مرکز تو جیہ تھی۔

وہ بچی——

جسے چوہدری کی نفاست ورثے میں ملی تھی۔ عادتیں ورثے میں ملی تھیں۔ جو صاف ستھری رہتی تھی۔ کانچ کے صاف ستھرے گلاس میں پانی پیتی تھی۔ چینی کی پلیٹ میں کھانا کھاتی تھی۔ اور گھٹنوں پر نیپکن پھیلانا نہ بھولتی تھی۔ جو خوبصورت بھی تھی بے انتہا خوبصورت۔

اس لڑکی کا کیا بنے گا؟

کیا یہ حالات سے سمجھوتہ کر لے گی؟

ماں کی غربت کا ساتھ دے گی؟

بڑی ہو کر کسی موچی نائی قصائی سے شادی کر لے گی؟

شازی نفی میں ہولے ہولے سر ہلا رہی تھی۔ جیہ کا کردار اس کے ذہن میں گڑ گیا تھا اور کئی پلاٹوں کے تانے بانے وہ اس کے گرد بن رہی تھی۔

یہ لڑکی احساس کمتری کا شکار ہو کر غلط فیصلہ کر لے گی۔

یہ غربت سے تنگ آ کر کسی امیر زادے کے ساتھ بھاگ جائے گی۔

اس کا بے پناہ حُسن اسے منڈی لے جائے گا۔ وہ کل کو طوائف ہو گی۔

اس کے عشق میں مبتلا ہو کر کوئی فراخ دل اسے اپنا لے گا۔

کوئی——

کوئی——

اس نے کئی باتیں سوچ ڈالیں۔ جیہ اسے کسی عظیم افسانے کا خوبصورت کردار معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ ابھی بیٹھ کر اس پر کئی کہانیاں لکھ ڈالے لیکن اسے سمجھ نہ آ رہا تھا کون سا پلاٹ اس کے لیے موزوں ہو گا۔

وہ صوفے میں پھیل گئی۔ گردن صوفے کی پشت پر ڈالتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں اور سوچا۔ "ابھی مغز کھپائی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ پندرہ سولہ سال بعد یہ کردار کسی نہ کسی پلاٹ میں تو فٹ ہو ہی جائے گا۔"

▲▲▲▲▲▲▲

ان کہی

جیپ پہاڑی راستوں پر چلی جارہی تھی۔ کہیں یہ راستے چھوٹے ہو جاتے' کہیں ابھری چٹانوں کی اوٹ میں آجاتے اور کبھی کسی خوفناک کھائی کے سر سے گزرتے۔

فہیم گل ان راستوں سے آشنا تھا۔ اس لیے بڑی بے باکی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے پہلو میں بیٹھا نوید کبھی کبھی خوفناک موڑوں سے خائف ہو جاتا۔

"آہستہ بھئی آہستہ۔" وہ فہیم گل سے کہتا۔

"فکر نہ کریں صاحب۔ یہ راستے میرے جانے پہچانے ہیں۔ اور پھر شام سے پہلے ہمیں چپالی بھی تو پہنچنا ہے۔" پٹھان ڈرائیور مسکرا کر کہتا۔

"ٹھیک ہے لیکن راستہ ٹھیک نہیں۔ کہیں کہیں تو سڑک بالکل کھائی کے کنارے سے جا رہی ہے۔"

"جی صاحب ہم جانتا ہے۔"

"میں تو پہلی دفعہ ادھر آیا ہوں۔"

"آپ باہر کا نظارہ کریں۔ گاڑی بالکل ٹھیک جا رہی ہے۔" پٹھان ڈرائیور نے صاحب کو مشورہ دیا۔

"بہت خوبصورت علاقہ ہے۔"

"جدھر ہم جائے گا وہ حسین ترین علاقہ ہے۔ ڈاک بنگلہ آپ دیکھیے گا تو جی چاہے گا ہمیشہ ادھر ہی رہے۔"

"نہ بھئی یہ ہمیشہ والی بات غلط ہے۔"

"صاحب بہت خوبصورت جگہ ہے۔ ڈاک بنگلہ پہاڑی کے سرے پر بنا ہے۔ ایک طرف ڈھلانیں ہیں۔ پچھلی طرف ندی ہے۔"

"جگہ تو ظاہر ہے ٹھیک ٹھاک ہو گی۔ یہ بتاؤ وہاں کھانے پینے کا بھی بندوست ہے کہ نہیں؟ چائے کافی تو میں ساتھ لے آیا ہوں—— بنانے——"

"اوہ صاحب بے فکر رہیں۔ سب کچھ ملے گا اور خالص ملے گا۔ چپالی گاؤں میں کھانے پینے کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ چائے پیئے گا نا آپ تو خالص دودھ کا دیکھیے گا مزہ ہی اور ہے۔"

"ہوں!"

"ادھر کتنے دن لگے گا صاحب؟"

"پندرہ دن رہنا ہے۔ شاید زیادہ دن بھی لگ جائیں۔ پُل ویسے تو اب مکمل ہو جانا چاہیے۔"

"کتنا بڑا پُل ہے صاحب؟"

"کچھ زیادہ لمبا نہیں۔ میرے خیال میں تین سو فٹ سے کچھ اوپر نیچے ہے۔ اس پُل کی اہمیت بہت ہے۔"

"ہاں صاحب۔ چپالی گاؤں کا رابطہ دوسرے علاقے سے بھی ہو جائے گا۔"

"تین میل کا فرق پڑے گا۔ لوگوں کو قریبی شہر آنے جانے میں سہولت ہو جائے گی۔"

"قریب تو کوئی شہر نہیں۔ سوات بھی۔"

"سوات پہلے سے تو قریب ہو جائے گا نا؟"

"ہاں یہ بات ہے صاحب!"

نوید اپنے پٹھان ڈرائیور سے خطاب کر رہا تھا۔ ڈرائیور اس علاقے سے بخوبی واقف تھا۔ راستے جانے پہچانے تھے۔ اس کا گاؤں سیدو شریف کے نواح میں تھا۔ اس کی معلومات کافی وسیع تھیں۔ نوید اس کی باتوں میں خاصی دلچسپی لے رہا تھا۔ راستے کی تکان اور اجنبی علاقے کی بوریت اسے قطعاً محسوس نہ ہو رہی تھی۔

نوید انجینئر تھا۔ چپالی قریب جو پہاڑی نالے پر پُل بن رہا تھا اس کی انسپکشن کے

لیے ڈیوٹی کے لیے یہ چھپالی جا رہا تھا۔ اس سے آگے بھی دو پُل بننا تھے۔ سروے ہو چکا تھا۔ اس نے ان دو جگہوں کا بھی جائزہ لینا تھا۔ تقریباً دو ہفتے اسے اس علاقے میں رہنا تھا۔ پٹھان ڈرائیور کا ساتھ اچھا تھا۔ خصوصاً اس حالت میں کہ وہ اس علاقے سے بخوبی واقف تھا۔

اب جیپ سات سوا سات ہزار فٹ کی بلندی پر جا رہی تھی۔ آخری گھماؤں پر اترائی شروع ہونا تھی۔ چھپالی اور سوات تقریباً ایک سی بلندی رکھتے تھے۔

"صاحب سامنے دیکھیے کتنے خوبصورت مناظر ہیں۔" فہیم گل نے چند لمحے کی خاموشی سے شاید اکتا کر کہا۔

نوید نے دیکھا واقعی بیحد خوبصورت مناظر تھے۔ نیلے اور سلیٹی پہاڑوں پر دھند کا غبار اتر رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی کرنوں کا انعکاس تھا۔ دھند کے سرمئی کنارے اورنج ہو رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی حسینہ کی چُنری ہو۔ گرے رنگ پر اورنج گوٹ لگی ہو۔ دھند گھنے سبزے پر ہولے ہولے اُتر رہی تھی۔ درختوں کے جھنڈ' خود رو پودے' جنگلی پھولوں سے لدی جھاڑیاں اس کی لپیٹ میں بڑی والہانہ انداز سپردگی سے چلی آ رہی تھیں۔

"بہت خوبصورت!" نوید نے دوربین سے ان نظاروں کو دیکھا۔

"چھپالی اس سے بھی حسین ہے سر۔"

"واقعی؟"

"ہاں—— ادھر پہاڑی ندی بھی ہے۔ وہی جس پر پُل بن رہا ہے۔ ڈاک بنگلے کی پشت سے لگ کر بہتی ہے۔"

"واہ وا——"

فہیم گل اسے چھپالی کے گرد و نواح' اس کے حسن اور وہاں کے لوگوں کے متعلق بتانے لگا—— "وہاں غربت بہت ہے صاحب!"

"پُل بننے سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔"

"کیا پڑے گا۔"

فہیم گل اپنی سمجھ اور استعداد کے مطابق باتیں کرنے لگا۔ نوید اس کی باتوں سے متاثر و مرعوب ہو رہا تھا۔ ان علاقوں کی پسماندگی اور غربت کا تجزیہ وہ بڑے سلیقے سے کر رہا تھا۔

"خان بابا"

"او زرکشے"

"کیا بات ہے۔ بہت مصروف ہے آج؟"

"ہاں!"

"کیوں؟"

"آج ڈاک بنگلہ میں پشاور سے صاحب آ رہے ہیں۔"

"اچھا۔ اسی لیے یہ سودا سلف لایا ہے۔"

"ہاں!"

"خان بابا!"

"ہاں"

"یہاں صاحب لوگ کبھی کبھی آتا ہے!"

"ہاں۔ سرکاری کام ہو تو کوئی افسر آ نکلتا ہے۔ ورنہ ڈاک بنگلہ تو خالی ہی پڑا رہتا ہے۔ ہاں اب یہ جو پُل بن رہا ہے نا۔ اس سے کچھ فرق پڑے گا۔ سیر و تفریح کے لیے یہاں لوگ آیا کریں گے۔"

"کوئی اچھی بات تھوڑا ہی ہو گی۔"

"کیوں؟"

"تمہیں زیادہ کام کرنا پڑے گا۔"

"او بھیا۔ کام کون سا میں کرتا ہوں۔ سارے کام تو تُو نپٹا دیتی ہے میرے' جیتی رہ۔"

"بابا۔ میں نے برتن مانجھ دیئے تھے۔"

"اچھا کیا۔ کافی عرصے سے استعمال میں نہیں آئے تھے نا' صاحب لوگ گندے برتن پسند نہیں کرتے نا۔ پیالیاں اچھی طرح چمکانی تھیں۔"

"خان بابا میں نے ندی کنارے جا کر ریت سے رگڑ رگڑ کر سارے برتن صاف کیئے ہیں۔"

"کمرہ بھی ٹھیک ٹھاک کر دیا ہے میں نے۔ دیواریں جھاڑی ہیں۔ پلنگ صاف کیے ہیں۔ میزیں اور کرسیاں——"

"خان بابا۔ مجھے کہہ دیا ہوتا۔ میں منٹوں میں سب کچھ صاف کر دیتی۔"

"تجھے برتن دھونے اور باورچی خانہ ٹھیک ٹھاک کرنے میں جو لگا دیا تھا۔"

"پہلے بتا دیتے نا کہ افسر آرہا ہے میں سب کچھ چٹاپٹ کر دیتی۔"

"بس ٹھیک ہے بچی"

زرکیشے خان بابا کی نواسی تھی۔ چند ماہ پہلے وہ بابا کے پاس آئی تھی۔ خان بابا تنہائی سے اکتایا ہوا تھا۔ بچی کے آجانے سے رونق ہو گئی تھی۔ زرکیشے بابا کے سارے کام کر دیتی تھی۔ باتونی بھی بہت تھی۔ بابا کو اپنی پیاری پیاری باتوں سے لبھاتی بھی خوب تھی۔ یہاں اس کا بھی دل خوب لگ گیا تھا۔ چپالی کی کئی ہم عمر لڑکیوں سے دوستی کر لی تھی۔ جنگلی ہرنی کی طرح اس حسین و خوبصورت علاقے میں چوکڑیاں بھرتی پھرتی تھی۔ وہ خود بھی صناعیٔ قدرت کی بہترین تخلیق تھی۔ قدرت نے حسن سے جس قدر نوازا تھا' مالی حالات اتنے ہی بُرے تھے۔ کچھ سوتیلی ماں کی وجہ تھی۔ بے چاری کے پاس ڈھنگ کا کوئی کپڑا نہ تھا۔ گھیر دار چھینٹ کے کرتے میں اتنے پیوند تھے کہ اصلی کپڑا نظر نہ آتا تھا۔ بابا کے پاس بھی کون سی دولت تھی۔ پھر بھی اس نے زرکیشے کو نئے کپڑے لا دیے تھے۔ لال چھینٹ کا گھیر دار کرتا جس کے کنارے نیلی چھینٹ کے تھے اور کالی چھینٹ کی چادر گوشتی پھولدار شلوار اور طلّے والے چپل جو زرکیشے نے کبھی نہ پہنے تھے۔

ہاں وہ اس لباس میں اتراتی پھرتی تھی۔ معمولی سے کپڑوں میں اس کا حُسن بے مثل ہو گیا تھا۔ جب وہ ڈاک بنگلے کی ڈھلانوں سے پھسلتی اترتی تو یوں لگتا کوئی آسمانی مخلوق سبز ڈھلانوں پر ہولے ہولے نیچے اُترتی آرہی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں سکے اور تانبے ملی چاندی کے کنگن چھن چھن کرتے تو فضا گنگنا اٹھتی۔

اسے اردو بالکل نہیں آتی تھی۔ اس کی تو پشتو بھی ثقیل سی تھی۔ چترال کے نواحی گاؤں میں بسنے والوں کی پشتو چپالی کے باسیوں سے مختلف تھی اسی لیے کبھی کبھی زرکیشے کی سہیلیاں اس کی بات سمجھ نہ پاتیں تو اسے خوب چھیڑتیں۔ اسے اپنی زبان سکھانے کی کوشش کرتیں لیکن زرکیشے وہی بولی بولتی جو اس کی اپنی تھی بلکہ وہ تو ان سکھیوں کے لہجے اور تلفظ کا الٹا مذاق اڑاتی۔

بڑی پاکیزہ اور نورانی صبح بیدار ہوئی تھی۔ شہروں کی ریاکاری' فریب اور تصنّع کا شاید فضا پر بھی اثر ہوتا ہے۔ اتنی حسین' معصوم اور رسیلی صبح نوید نے شہر میں کبھی نہ دیکھی

تھی۔ وہ کمرے سے نکلا اور چھوٹے سے برآمدے سے ہوتا صحن میں آگیا۔ پہاڑی کو کاٹ کر یہ صحن ہموار کیا گیا تھا۔ اس کے تینوں طرف پھسلتی ڈھلانیں تھیں جن پر سبزہ' پودے اور جھاڑیاں لدے ہوئے تھے۔ صحن کے اطراف لوہے کی تاروں کا جنگلہ تھا جس پر پائپ کی ریلنگ تھی۔ نوید ریلنگ کو تھام کر قدرت کے نظاروں میں محو ہو گیا۔ مشرقی سرمئی پہاڑوں کی اوٹ سے سونا بکھیرتا سورج آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا تھا۔ دھند اور بادلوں کے غبار چھپٹ رہے تھے۔ دھواں دھواں سی فضا روشن ہو رہی تھی۔ پرندے گھونسلوں سے پھڑپھڑا کر نکل رہے تھے۔ خاموشی میں ان کی چہکار ندی کے پانی کے دھیمے دھیمے شور میں مل کر کسی مؤثر نغمے کا روپ دھار رہی تھی۔ نوید اپنے ساتھ ٹرانسسٹر لے کر آیا تھا۔ لیکن اس نغموں سے بھرپور فضا میں اس کی قطعاً ضرورت محسوس نہ ہو رہی تھی۔

وہ ان رنگینیوں میں ڈوبا ریلنگ پر جھکا ہوا تھا کہ اس کی نگاہ ڈھلان پر روانی سے پھسلتی زرکیشے پر پڑی۔

بے ساختہ اس نے چیخ کر لڑکی کو درخت کی شاخ پکڑ لینے کو کہنا چاہا۔ وہ سمجھا شاید وہ ڈھلان سے لڑھک گئی ہے۔

لیکن

لڑکی تو جیسے ہواؤں کے دوش پر اڑتی چلی جا رہی تھی۔ جب وہ نچلے ہموار رستے پر پہنچ کر قدم قدم چلنے لگی تو نوید کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ پہاڑی لوگ تو عادی ہوتے ہیں' اونچائیاں پھلانگنے اور پستیاں ماپنے میں۔ چٹیل میدانوں کے رہنے والے اس مہارت کو کیا جانیں۔

اس جگہ آنے کا نوید کا پہلا اتفاق تھا۔ لاہور کا رہنے والا تھا۔ ایک آدھ دفعہ مری تک پہنچا تھا۔ حُسن کے ان خزینوں کا اسے پہلے پتہ کہاں چلا تھا۔

لڑکی گھماؤ پر مڑ گئی۔ نوید پھر انہی فرحت بخش نظاروں میں ڈوب گیا۔

"صاحب!" خان بابا نے نوید کی پشت پر آکر پکارا۔

"ہوں!" وہ چونکا۔ پھر سیدھا ہو کر مڑا۔

"چائے صاحب!"

"او خان بابا۔ چائے بنالی؟"

"ہاں صاحب!"

"اوں ہوں۔"

"کیوں صاحب؟"

"بھئی رات چائے کا بالکل مزہ نہیں آیا۔ صبح ناشتے پر بھی چائے میری مرضی کی نہ تھی۔"

"اوہو۔ صاحب معافی چاہتا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ تم نے دودھ بہت ڈالا تھا۔ ویسے بھی ذائقہ کچھ —— "

"وہ۔ وہ صاحب! پانی تو ہمارا بہت اچھا ہے پر لکڑی کا کوئلہ جلاتا ہے نا۔ دھواں لگ جاتا ہے۔"

"یہی بات ہوگی۔ بہرحال یوں کرو۔ پانی کھول جائے تو مجھے بتانا۔ میں خود چائے بناؤں گا اپنے لیے۔"

"آپ تکلیف کرے گا صاحب؟ ہم کس لیے ہے۔"

"تکلیف کی بات نہیں۔ ایک پیالی تو چائے پیتا ہوں۔ وہ بھی ذوق کی نہ ہو تو۔"

"اچھا صاحب اچھا۔ ہم ابھی پانی جوش دے گا۔"

"ٹھیک ہے میں تیار ہو جاؤں' مجھے پُل دیکھنے جانا ہے۔"

"کیسے جائے گا صاحب؟"

"جیپ پر۔ فہیم گل ابھی آئے گا۔"

خان بابا نے سر ہلایا۔

نوید کمرے میں آگیا۔ اس نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا۔ دس بجے کے قریب فہیم گل نے اسے لینے آنا تھا' یہ معمر ساڈرائیور اس کا انٹرپریٹر بھی تھا۔ نوید کو پشتو کا ایک لفظ بھی سمجھ نہ آتا تھا۔ فہیم گل ترجمانی کر سکتا تھا۔

"صاحب پانی جوش کرتا ہے۔" خان بابا نے دروازے میں کھڑے کھڑے کہا:

"اوہ۔ اچھا۔ میں ابھی آیا۔"

"آیئے۔"

وہ خان بابا کے ساتھ پچھلی طرف گیا۔ جہاں ڈاک بنگلے کا باورچی خانہ اور بابا کا کمرہ تھا۔ باورچی خانہ دھوئیں سے سیاہ ہو رہا تھا۔ بڑے بڑے مٹی کے چولہے تھے۔ المونیم

کی دیگچیاں کالی کالی تھیں۔ لگتا تھا انہیں چمکانے کی کوشش تو کی گئی ہے لیکن سیاہی جم چکی ہے اور جب سیاہی جم جائے تو اسے اتارنا آسان تو نہیں ہوتا نا۔

چولہے کے اوپر سلور کا کالا چائے جوش رکھا تھا' سوکھی گیلی لکڑیاں سلگ رہی تھیں۔ انگارے اور راکھ چولہے سے باہر آ رہی تھی۔

نوید نے برا سا منہ بنایا۔

لیکن

کیا کر سکتا تھا۔ بابا نے چائے دانی لا کر چولہے کے قریب رکھ دی اور چائے کا ڈبہ ڈھونڈنے لگا۔

"پتہ نہیں کہاں رکھ دیا ہے لڑکی نے؟" خان بڑبڑایا۔

"کیا چیز بابا؟"

"چائے کا ڈبہ!"

"چائے کب سے لا کر رکھی ہوئی ہے —— جاؤ میرے کمرے میں ٹیبل پر ڈبہ رکھا ہے۔ تازہ ڈبہ۔ لے آؤ۔"

خان بابا ڈبہ لینے گیا۔ نوید بڑے سے باورچی خانے کا جائزہ لینے لگا۔ پرانے پرانے زنگ آلود ڈبے۔ چینی کے ٹوٹے پھوٹے برتن۔ سلور کے کالے کالے پتیلے۔ ایک کونے میں تازہ کٹی ہوئی درختوں کی گیلی گیلی شاخیں۔ پانی کا مٹکا۔

"خان بابا۔"

نوید ابھی پورا جائزہ لے بھی نہ پایا تھا کہ سریلی سی آواز نے چونکا دیا۔ وہ ایک دم پلٹا۔

دروازے سے زرکیشے اندر آ رہی تھی۔ نوید کو دیکھ کر اس کے قدم رک گئے۔

ایک لمحہ کو وہ پتھرا سی گئی۔

کچھ ایسی ہی کیفیت نوید کی بھی تھی۔ وہ اس لڑکی کو ششدر سا تکتا رہ گیا۔ لڑکی نے چھینٹ کا نیا مگر میلا سا لباس پہنا ہوا تھا۔ بھاری چوڑی چادر سر پر ہوتے ہوئے شانوں کے پیچھے پشت پر پڑی تھی۔ فراک نما گھیر دار کرتے کی چنٹیں کمر سے شروع ہوتی تھیں۔ چھاتی پر چاندی کے روپے ٹکے تھے۔ اس کے کانوں میں بڑے بڑے بالے ہلکورے لے رہے تھے۔ ہاتھوں میں چھن چھن کرتے کنگن تھے۔ وہ پاؤں سے ننگی تھی۔ پاؤں مٹی سے اٹے تھے۔

”کون ہو تم؟“ نوید نے اس کے حسین چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
اس نے کچھ اپنی زبان میں کہا۔ لیکن نوید کے سوائے خان بابا کے کوئی لفظ سمجھ نہ آیا۔
وہ کچھ اور کہنے ہی کو تھا کہ خان بابا آ گیا۔ نوید اور لڑکی دونوں کی طلسماتی کیفیت ٹوٹ گئی۔
”زرکیشے!“ اس نے لڑکی کو مخاطب کیا۔ پھر پشتو میں کچھ کہا۔ لڑکی نے بھی جواب دیا۔
نوید کے پلے کچھ نہ پڑا۔ زرکیشے آگے بڑھی اور پانی کا خالی گھڑا اٹھا کر باہر نکل گئی۔
”یہ لو صاحب چائے۔“ خان بابا آگے بڑھا۔
”یہ کون ہے؟“ نوید نے بابا سے پوچھا۔
”زرکیشے ہے۔ میری نواسی۔“
”زرکیشے—“ نوید نے زیر لب کہا۔ پھر بولا۔ ”زرکیشے اس کا نام ہے؟“
”ہاں صاحب!“
اس کا جی چاہا زور سے کہے ’واہ بابا‘ جیسی اچھوتی اور منفرد سی لڑکی ہے ’ویسا ہی اس کا نام ہے۔
لیکن وہ کچھ نہیں بولا۔ پتی ڈبے سے نکالی اور ایک کپ چائے اپنے لیے بنائی۔
جانے کیوں اب اسے باورچی خانہ دھواں دھواں اور گندہ نہیں لگ رہا تھا۔ اک خوبصورت سی مہک دھوئیں میں بھی محسوس ہو رہی تھی۔ حسن کا سحر و طلسم شاید اسی کو کہتے ہیں۔
خان بابا نے زرکیشے کے متعلق نوید کو بتایا۔ اک گونا خوشی نوید کو اس لیے ہوئی کہ اس حسن جہاں سوز کا ناطہ اس ڈاک بنگلے سے تھا۔

زرکیشے ندی کے کنارے گول گول پتھروں پر بیٹھی سلور کے کالے دیگچے کو مٹی اور ریت سے مانجھ مانجھ کر چمکا رہی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں ٹکڑیاں گہری سرمئی تھیں۔ کہیں سفید اور کہیں کہیں نیلا نیلا جھانکتا آسمان دکھائی دے رہا تھا۔ ندی کے دونوں کناروں پر گھنا سبزہ تھا۔ پتھروں کی بہتات تھی اور درختوں کی شاخیں جھک جھک کر پتھروں سے ٹکراتی پانی کے شفاف آئینے میں اپنا عکس دیکھنے کو بیتاب تھیں۔

زرکیشے موج میں تھی۔ اپنی زبان کا کوئی گیت بڑے مسرور انداز میں گنگنا رہی تھی۔
اس کی چادر قریبی بڑے سے پتھر پر پڑی تھی اور اس کی لمبی لمبی چوٹیاں جو جانے کے مہینے پہلے گندھی تھیں چپکی ہوئی تھیں۔ اس کے ہلنے پر وہ ناگنوں کی طرح بشت پر بل کھا رہی تھیں۔
برتن مانجھ کر رکھ دیئے تو پانی میں مل مل کر اپنے ہاتھ پاؤں دھونے لگی۔ وہ سخت سے پتھر سے اپنے پاؤں کی ایڑیاں رگڑ رہی تھی کہ اس کی نگاہ چند فٹ کے فاصلے پر کھڑے نوید پر پڑی۔ جو ایک درخت کی جھولتی شاخ پکڑے کھڑا محویت کے عالم میں اسے تک رہا تھا۔
زرکیشے نے اپنی چوڑی چوڑی آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھا پھر جلدی سے پاؤں پانی سے نکالے اور پرے پتھر پر پڑی اپنی چادر اٹھا لی۔
”زرکیشے۔“ نوید چند قدم چل کر اس کے قریب آ گیا۔
اس نے جانے کیا کہا۔ نوید سمجھ نہ سکا۔ وہ جلدی جلدی برتن سمیٹ رہی تھی۔
اس کی آنکھوں میں حیا کے سائے لہرا رہے تھے۔ چہرے پر شہابی رنگ دوڑنے لگا تھا۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔
”زرکیشے۔“ نوید نے پھر کہا۔ ”کیا کر رہی ہو؟ ٹھہرو کہاں جا رہی ہو؟“
زرکیشے اس کی بات نہ سمجھی۔ برتن اٹھا کر سر پر رکھے اور ڈھلان کی طرف بڑھی۔ اسے اوپر ریسٹ ہاؤس میں جانا تھا۔
نوید اس کے پیچھے آیا۔
زرکیشے نے مڑ کر اسے دیکھا۔ پھر ریسٹ ہاؤس کی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ بولی۔
نوید کو بات تو سمجھ نہ آئی۔ لیکن اشارے سے سمجھ گیا کہ وہ اسے کہہ رہی ہے۔
”ادھر سے مت آؤ۔ ادھر سے اوپر آؤ۔“
نوید نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ اثبات میں سر ہلایا اور ہموار راستے پر ہو لیا جو سیڑھیوں کی طرف جاتا تھا۔
زرکیشے بڑے سہل انداز میں سیدھی چڑھائی چڑھتی چلی جا رہی تھی۔ دو ایک بار اس نے بھی مڑ کر نوید کو دیکھا۔
دوسرے اور پھر تیسرے دن بھی زرکیشے اور نوید کا میل اسی ندی کے کنارے ہوا۔

زر کیشے اپنی تمام تر رعنائیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ نوید کے دل و دماغ پر چھا گئی۔ ایسا بے مثال اور بے داغ حسن اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ بہت سی لڑکیاں اس کی نگاہوں میں سمائی تھیں۔ سمارٹ' خوبصورت' لپے پُتے چہرے پرفیومز میں ڈوبی' لیکن زر کیشے کا اپنا ہی رنگ تھا۔ نہ تو اس کے پاس اچھا لباس تھا نہ ہی میک اپ کی کوئی چیز' پرفیوم نامی چیز سے تو وہ آشنا ہی نہ تھی۔

لیکن وہ پہاڑوں پر اترنے والی سورج کی پہلی کرن کی طرح نرم و نازک' دھیمی دھیمی تپش اور شرمیلی سی روشنی لیے تھی۔ نوید جوان مرد تھا۔ اس عمر میں دل کا ایک خانہ تو ہمیشہ ہی حسن و جوانی کو جگہ دینے کو خالی رہتا ہے۔ یہ لڑکی منفرد تھی اس خالی خانے میں ایک دم ہی سما گئی۔

نوید اسی کے متعلق سوچتا رہتا۔ کام پر ہوتا یا ریسٹ ہاؤس میں' زر کیشے اس کے حواس پر چھائی رہتی۔

لیکن

اسے جھنجھلاہٹ ہوتی۔ وہ اس کی بولی نہیں جانتا تھا۔ صرف اور صرف اس کا نام بلا سکتا تھا۔

زر کیشے نے بھی شاید اپنی زندگی میں نوید ایسا خوبرو نوجوان پہلی بار اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ دو تین دن تو وہ اس سے ڈری ڈری' سہمی سہمی رہی تھی۔ لیکن جب وہ اس کی نگاہوں میں' دل کی دھڑکنوں میں چوری چوری بس گیا تو زر کیشے اس سے خوفزدہ نہ رہی۔

اس رات خوب سردی تھی۔ سارا دن آسمان پر بادل منڈلا رہے تھے۔ ہوائیں بھی تند تھیں۔ ٹھنڈا موسم تو پہلے بھی تھا۔ بادلوں اور ہواؤں نے ایک دم یخ بستہ سا کر دیا۔

خان بابا نوید کو کھانا پہنچا کر اپنی کوٹھڑی میں آ گیا تھا۔ لحاف میں گھسنے کے باوجود سردی لگ رہی تھی۔

"زر کیشے!" اس نے اسے پکارا۔

"جی خان بابا۔"

"تھوڑی سی آگ اس کوٹھڑی میں بھی لے آؤ۔ میری چارپائی کے قریب رکھ دو۔"

"انگیٹھی لے آؤں۔"

"ہاں۔"

"اچھا خان بابا۔" "کیا سردی زیادہ لگ رہی ہے؟"

"ہاں' باورچی خانہ بھی بند کر دینا۔ صاحب کھانا کھا چکے ہوں گے۔"

"ہاں کھا چکے ہیں۔ برتن اٹھا لائی ہوں۔ اب دھوؤں گی۔"

"پہلے مجھے آگ لا دو۔"

"چائے پیو گے؟"

"بنا کر لا دوں؟"

زر کیشے جلدی سے لوٹی۔ انگیٹھی میں راکھ اور کوئلے ڈالے۔ انگارے بھرے اور بابا کی چارپائی کے قریب رکھ کر چائے بنانے گئی۔

چائے بنا کر لائی تو بابا گہری نیند میں تھا۔ خراٹے لے رہا تھا۔ زر کیشے نے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ پیالہ وہیں رکھ کر باورچی خانے میں آ گئی۔

سردی اسے بھی لگ رہی تھی۔ وہ چادر اپنے اردگرد اچھی طرح لپیٹ کر چولہے کے پاس جا بیٹھی۔ چولہے پر چائے جوش میں پانی ابل رہا تھا۔ زر کیشے نے برتن دھونے کے لیے پانی گرم کر رکھا تھا۔

لیکن برتن جوں کے توں پڑے تھے۔ اور وہ راکھ پر نظریں جمائے سمٹی سمٹائی سوچوں میں کھوئی بیٹھی تھی۔

"خان بابا۔" نوید نے باورچی خانے کے دروازے میں سے اندر آتے ہوئے آواز دی۔ زر کیشے نے چونک کر گردن اٹھائی۔ پلٹ کر دیکھا۔ نوید اندر آ گیا۔

"کافی کے لیے پانی چاہیے۔" اس نے کہا۔ زر کیشے کچھ سمجھے بغیر ٹکر ٹکر اس کا منہ تکنے لگی۔"

نوید مسکرایا۔ "پانی۔ پانی۔ ابلا ہوا پانی چاہیے۔"

زر کیشے نے پشتو میں کچھ کہا۔

"اوہ خدایا۔ کون سمجھے تمہاری زبان۔"

شاید یہی الفاظ زر کیشے نے بھی کہے۔

دونوں مسکرا دیئے۔

پھر نوید کو اشاروں سے بات کرنے کا خیال آیا۔ اس نے ایک مگ اٹھایا۔ اشارے سے بتایا کہ اس میں کافی ڈالنی ہے' ابلتا ہوا پانی چاہیے۔

چائے جوش میں پانی اُبل رہا تھا۔ اس نے اشارے سے پوچھا۔ "پانی ٹھیک ہے؟"

زرکیشے نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

نوید نے مگ میں کافی ڈالی' پانی انڈیلا' پھر دودھ ملایا۔

"پیو گی؟"

زرکیشے نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

نوید نے دوسرے مگ میں آدھی کافی ڈال کر اس کی طرف بڑھائی۔ اس نے ہاتھوں اور سر کے اشارے سے انکار کیا۔

"لے لو۔ پیو۔" نوید ایک سٹول پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

زرکیشے نے اصرار کرنے پر مگ پکڑ لیا۔

نوید نے مگ سے گھونٹ لے کر اسے بھی اشارے سے پینے کو کہا۔

زرکیشے نے ایک گھونٹ لیا۔ کسیلی سی کافی کا مزہ اچھا نہیں لگا۔ منہ بنایا۔

نوید ہنس پڑا۔

زرکیشے نے مگ زمین پر اپنے قریب رکھ دیا۔

نوید گھونٹ گھونٹ کافی حلق سے اتارتے ہوئے اسے بھی پینے کا کہتا رہا لیکن زرکیشے نے سر ہلا ہلا کر انکار کر دیا۔ اپنی زبان میں وہ اس کافی پر جو تبصرہ کر رہی تھی نوید سمجھ نہیں پایا۔

ہاں اس کی آواز اور لہجے سے اس نے محسوس کیا کہ کافی اسے اچھی نہیں لگی۔

"زرکیشے!" نوید نے کافی ختم کرنے کے بعد اس کی آنکھوں میں اپنی آنکھوں کا سارا فسوں' سارا سحر' سارا نشہ انڈیلتے ہوئے کہا۔

"ہوں!"

"میرا نام لو۔"

"ہوں۔"

"میرا نام نوید ہے۔"

وہ کچھ سمجھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

نوید نے پیار بھری نظروں سے اسے گھورا۔ پھر اپنی بے وقوفی پر ہنسی آ گئی۔ بھلا وہ اس کی بات کیسے سمجھ سکتی تھی۔

نوید نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "تُو زرکیشے!"

پھر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "نوید!"

اس نے دو تین دفعہ یہی عمل دُہرا لیا۔

زرکیشے ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔ لیکن اس کو نوید کی بات سمجھ آ گئی۔ ہنستے ہوئے بولی — "نویدے!"

"نوید —" نوید نے زور دے کر صحیح تلفظ کیا۔

"نوید —" وہ لہراتے ہوئے بولی۔

دونوں ہنس پڑے۔

نوید کا جی زرکیشے سے باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا۔ لیکن زبان کا مسئلہ تھا۔ اشاروں میں گونگوں کی طرح کب تک باتیں کیے جاتے وہ تھوڑی دیر بعد اٹھا۔

"خان بابا؟" اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے پوچھا۔

زرکیشے نے گال کے نیچے ہاتھ رکھا۔ سر ایک طرف جھکایا۔ آنکھیں بند کیں۔

نوید کو سمجھا دیا کہ وہ سو رہا ہے۔

نوید اس کی اس ادا پر لٹ پٹ گیا۔

نوید اپنے کمرے میں چلا آیا۔ زرکیشے برتن دھونے لگی۔ اس کے من میں بڑی انوکھی بڑی پیاری ہلچل مچی تھی۔

"فہیم گل۔"

"جی صاحب۔"

"دو چار جملے ہمیں بھی پشتو کے سکھا دو۔"

وہ ہنس کر بولا۔ "صاحب ہم جو ترجمانی کے لیے موجود ہے۔ آپ کیا کرے گا سیکھ کر —؟"

"اچھا ہوتا ہے نا!"

"ہاں صاحب۔"

نوید نے فہیم گل سے دو تین جملے سیکھے۔

"ادھر آؤ۔ کیا حال ہے؟"

"کیا کر رہے ہو؟"

"بیٹھو مجھ سے باتیں کرو۔"

نوید پشتو کا لہجہ نہ اپنا سکا۔ فہیم گل اس کے جملے رٹنے پر ہنسنے لگا۔ نوید نے تینوں جملے ازبر کر لیے۔

اسی شام جب خان بابا چائے کی ٹرے لیے کمرے میں آیا تو نوید نے مسکرا کر کہا۔

"خان بابا!"

"او جی۔" خان بابا نے ٹرے میز پر رکھ دی۔

نوید نے تینوں رٹے ہوئے جملے بابا کے سامنے دہرا دیے۔

خان بابا حیران ہوا۔ "آپ کو پشتو آتا ہے جی؟"

"دیکھ لو۔" نوید مسکرایا۔

بابا نے پشتو میں جواب دیا۔ نوید ہنس پڑا۔ جلدی سے بولا۔ "مجھے پشتو نہیں آتی خان بابا۔ چند جملے سیکھے ہیں کیا ٹھیک بولے تھے؟"

خان بابا سر ادھر اُدھر مارتے ہوئے ہنسنے لگا۔

چائے کے خالی برتن اٹھانے زرکیشے آ گئی۔

"زرکیشے!"

"ہوں۔"

"ادھر آؤ۔ کیا حال ہے؟" نوید نے پشتو میں کہا۔ زرکیشے حیران ہو کر اسے تکنے لگی۔ نوید نے دوسرا جملہ بولا۔ "کیا کر رہے ہو؟"

زرکیشے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ شاید نوید نے مذکر مؤنث کی غلطی کی تھی۔

نوید پروا کیے بغیر بولا۔

"بیٹھو مجھ سے باتیں کرو۔"

زرکیشے پھر حیرانگی سے اسے تکنے لگی۔ نوید نے سٹول کی طرف اشارہ کر کے پھر وہی جملہ دہرایا۔

زرکیشے بیٹھ گئی۔ چادر کا کنارہ انگلیوں میں مسلتے ہوئے باتیں کرنے لگی۔ وہ کیا کہہ رہی تھی، نوید کے پلے خاک بھی نہیں پڑا۔ اس وقت اس کے دل میں کس شدت سے زرکیشے سے باتیں کرنے کی خواہش ابھر رہی تھی۔

"میں کیسے سمجھوں تمہاری باتیں زرکیشے۔ کاش مجھے تمہاری بولی آتی۔" اس نے بے بسی سے کہا۔

زرکیشے ہنس پڑی۔ جانے کیا کچھ کہہ گئی۔ اس کو سوائے "نویدے" کے اور کچھ سمجھ نہیں آیا۔

پھر وہ روز ہی ملنے لگے۔ کبھی شام کے اترتے دھندلکوں میں۔ کبھی صبح کی ضوپاشیوں میں اور کبھی رات کے دبیز اندھیروں میں۔ دونوں ملتے، باتیں سمجھے بنا باتیں کرتے اور خوش ہوتے رہتے۔

چاندنی کا فسوں خیز غبار پھیلا تھا۔ پہاڑوں پر رات اتر آئی تھی۔ خاموشی کا طلسم صرف ندی کا شور مچاتا پانی ہی توڑ رہا تھا۔ کبھی کبھی دور کہیں سے کسی جانور کے غرانے اور کتوں کے بھونکنے کی آواز آ جاتی۔

سردی اور رات کی خاموشی سے بے نیاز نوید اور زرکیشے ریلنگ پر جھکے کھڑے تھے۔ دونوں خاموش تھے۔ باتیں بھی کرتے۔ نوید زرکیشے کی بات نہیں سمجھ سکتا تھا۔ زرکیشے کے پلّے نوید کی کوئی بات نہ پڑتی تھی۔

پھر بھی

دونوں ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔

نوید کا ریلنگ پر رکھا ہاتھ آہستہ آہستہ کھسکا اور زرکیشے کے ہاتھ پر آ گیا۔

زرکیشے نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

لیکن

ڈھلی ہوئی چاندنی میں اس کا نکھرا ہوا چہرہ بتا رہا تھا کہ نوید کی یہ حرکت اسے بری نہیں لگی۔

وہ مسکرائی اور جانے کیا کہا۔

نوید نے جذبات سے بوجھل ہوتی آواز میں کہا۔ "زرکیشے تم نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ تمہاری قربت میرے لیے صدہا خوشیوں کا باعث ہے۔"

زرکیشے سمجھے بنا مسکرائے گئی۔

نوید اس پر اپنے دل کی حالت عیاں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا بے اختیارانہ

اسے اپنے بازوؤں میں دبوچ لے۔
لیکن
جس نے ہاتھ چھونے نہیں دیا تھا کیا اس کی ایسی حرکت برداشت کر سکتی تھی۔
وہ اس کی زبان جانتا ہوتا تو بے دھڑک پوچھ لیتا۔
تھوڑی دیر بعد زرکیشے مڑی۔ کچھ کہا۔
غالباً وہ جاننا چاہتی تھی۔
"بیٹھو۔ مجھ سے باتیں کرو۔" پشتو کا یہی جملہ نوید کو آتا تھا۔ اس نے ریلنگ سے لگ کر کھڑی زرکیشے سے کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ نوید کھسیانا سا ہو گیا۔
لیکن بھرپور خوشیوں کا احساس دونوں کو سرشار کر گیا۔

نوید نے ایک ہفتے کی ڈیوٹی بڑھالی۔ وہ حسن کے سحر میں گرفتار تھا۔ گونگا بہرہ رابطہ تھا لیکن تھا تو ضرور۔ زرکیشے بھی تو مقناطیسی کشش سے اس کی طرف کھنچی آئی تھی۔ برتن اٹھانے کے بہانے آجاتی تو کتنی کتنی دیر کھڑی رہتی۔ اپنی بولی میں نہ جانے کیا کچھ کہے جاتی۔ نوید سمجھ نہ پاتا۔ لیکن بعض باتوں کو سمجھنے کی ضرورت بھی تو نہیں ہوتی۔ جذبوں کی بھی تو زبان ہوتی ہے۔ آنکھیں بھی تو بولتی ہیں۔ دل کی دھڑکنیں بھی تو بہت کچھ کہہ دیتی ہیں۔ نوید اور زرکیشے آنکھوں، جذبوں اور دھڑکنوں ہی کی زبان سمجھنے لگے تھے۔

سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ سنہری دھوپ کے سائے لانبے ہو گئے تھے۔ ندی کے پانی پر جیسے سونے کی تہ چڑھ گئی تھی۔ کناروں کے گول گول چھوٹے بڑے پتھر چمک رہے تھے۔ درختوں کی گھنی شاخوں پر بھی نکھار تھا۔ زرکیشے آج اپنی سہیلیوں کے ساتھ ندی کنارے دور دور تک گئی تھی۔ وہاں جھاڑیوں میں ان دنوں سمبلو پکے تھے۔ فالسے کی طرح کا سنی رنگ کا یہ پھل کھٹا میٹھا تھا۔ اسے بہت من بھاتا تھا۔ اس نے پھل سے جھولی بھر لی۔ جینی اس کے ساتھ تھی۔ دونوں زمانے بھر کی باتیں کرتے ہوئے سمبلو کھا رہی تھیں۔ زرکیشے نے نوید کے متعلق اپنی اس پکی سہیلی کو بھی بتا دیا تھا۔
"سارے سمبلو کھا گئی ہو جینیٔ۔ تھوڑے سے رہنے دو۔"
"کس لیے؟"

"نوید کے لیے۔"
"اوہ۔"
"میں نے اتنی دور جا کر سمبلو اسی لیے توڑے ہیں۔"
جینیٔ ہنس پڑی۔ "جاؤ لے جاؤ۔ میں اپنے گھر جا رہی ہوں۔" جینیٔ چل دی۔
زرکیشے جھولی میں سمبلو ڈالے اپنے راستے پر ہولی۔
وہ ابھی ریسٹ ہاؤس سے کچھ دور ہی تھی کہ نوید سامنے سے اترائی اترتا نظر آیا۔
اس نے زرکیشے کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ وہ اس کے نیچے آنے کے انتظار میں بڑے سے درخت کی جھکی ہوئی شاخ پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔
"زرکیشے!"
"نویدے!"
"کدھر؟" نوید نے آنکھوں کے اشارے سے پوچھا۔
زرکیشے نے دُور نیچے کی طرف اشارہ کیا۔ پھر جھولی اس کے سامنے پھیلا کر سمبلو دکھائے۔
"یہ کیا ہے؟" نوید نے آنکھوں اور ہاتھوں سے اشارہ کیا۔
"سمبلو۔" وہ اشارہ سمجھ گئی۔ پھر جانے کیا کیا تفصیل بتانے لگی۔ نوید کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی مسکرایا۔
"کھاؤ۔" زرکیشے نے پشتو میں کہا۔ اس نے جھولی نوید کے سامنے کر دی۔
نوید نے نفی میں سر ہلایا۔
زرکیشے نے پھر جھولی اس کے آگے کی۔ ایک سمبلو اٹھایا اس کی ڈنڈی توڑی۔ منہ میں ڈالا۔ پھر اسی طرح کرنے کا اشارہ نوید کو کیا۔
نوید نے دیکھا۔ سمبلو کھانے سے زرکیشے کے ہونٹ اور دانت کاسنی ہو رہے تھے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے نہ کی۔
زرکیشے نے پھر اشارے ہی سے اصرار کیا۔ وہ بڑی چاہت سے اس کے لیے سمبلو توڑ کر لائی تھی۔
نوید نے کوئی سمبلو نہیں لیا۔ زرکیشے ناراض ہو گئی۔ اس نے سارے سمبلو جھولی سے زمین پر گرا دیئے۔

"اے اے۔" نوید جلدی سے اسے روکنے کو بولا۔ لیکن وہ سمبلو پھینک کر روٹھی نگاہ اس پر ڈال تیزی سے قدم اٹھاتی ریسٹ ہاؤس کی طرف بھاگ گئی۔

نوید کو اس کے روٹھنے کی یہ ادا بے حد بھائی۔ وہ گنگناتا لہراتا اس کے پیچھے پیچھے اوپر آیا۔ لیکن وہ اپنی کوٹھڑی میں جا گھسی۔ نوید کمرے میں آ گیا۔ زرکیشے روٹھ گئی تھی۔ نوید کو اس کے روٹھنے کی ادا بے طرح بھائی تھی۔

روٹھی ہوئی زرکیشے کو منائے بنا چارہ نہیں تھا لیکن منانے کی ترکیب تو کوئی سمجھ نہ آ رہی تھی۔ پورا دن زرکیشے نوید کے سامنے نہیں آئی۔ دو ایک بار سامنا ہوا بھی تو وہ منہ پھلائے رہی۔

دوسری رات جب خان بابا ہی کمرے میں نوید کے لیے کھانا لے کر آیا تو نوید بولا۔

"خان بابا۔۔۔ آدھ گھنٹہ بعد خوب تیز سی چائے بھجوا دینا۔"

"بہت اچھا صاحب۔"

"میرے سر میں شدید درد ہے۔"

"اوہو۔۔۔ ابھی چائے لائے گا صاحب!"

"نہیں آدھ گھنٹہ بعد۔ ابھی کھانا کھاؤں گا۔ پھر چائے کے ساتھ دوائی لوں گا۔"

"بہتر!"

"خوب تیز اور گرم چائے۔ بہت درد ہے۔ زرکیشے سے کہنا وہ اچھی چائے بناتی ہے۔"

"بہت اچھا صاحب!"

نوید نے جو پانسہ پھینکا تھا۔ اس میں کامیاب رہا۔ زرکیشے نے خان بابا سے جب سنا کہ نوید کے سر میں درد ہے تو بے چین ہو گئی۔ وہ خود چائے بنا کر لائی۔

نوید بستر میں کمبل اوڑھے منہ سر لپیٹے پڑا تھا۔

"نویدے۔" زرکیشے نے آواز دی۔

وہ کسمسایا۔ لیکن منہ نہیں کھولا۔

زرکیشے بے چین ہو گئی۔ کئی بار اسے پکارا۔ چائے کا کہا۔ احوال پرسی کی۔ اس کی بے تابی اس کی آواز سے عیاں تھی۔

زرکیشے سمجھی اسے کچھ زیادہ ہی تکلیف ہے۔ اس کی بے چینی بڑھ گئی۔ آگے بڑھ کر اس نے آہستگی سے کمبل نوید کے چہرے سے ہٹایا۔ ایک ہی سانس میں وہ جانے کیا کچھ کہہ گئی۔

نوید صرف اسے تکے جا رہا تھا۔

زرکیشے بیتاب تھی۔ اس نے پیالی نوید کو تھما دی۔ نوید نے پیالی سرہانے پڑی میز پر رکھ دی۔ خود آنکھیں بند کر کے چت پڑا رہا۔

زرکیشے کو سمجھ نہ آ رہا تھا کیا کرے۔

"نویدے۔" اس نے بیتابی سے پکارا۔

"ہوں!" نوید نے آنکھیں کھولیں۔ وہ اس پر جھکی ہوئی تھی۔

زرکیشے نے اپنے ماتھے کو انگلیوں سے دبایا پھر اس کے ماتھے کو انگلی سے چھوا کچھ پوچھا۔

نوید نے یونہی سر ہلا دیا۔ اس نے جان بوجھ کر پھر آنکھیں بند کر لیں۔ زرکیشے چند لمحے تذبذب میں رہی پھر پلنگ کے قریب دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔ اور اپنا ہاتھ نوید کے ماتھے پر رکھ دیا۔۔۔ وہ اس کا سر دبانا چاہتی تھی۔

لیکن نوید اس کے ٹھنڈے ہاتھ کے لمس سے تڑپ سا گیا۔ جلدی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

اس دفعہ زرکیشے نے اپنا ہاتھ نہیں چھڑایا۔

چند لمحے یونہی بیت گئے۔ خاموشی سے منزلیں طے ہوتی گئیں۔ محبت کی برقی رو دونوں کے جسم میں لہریں لیتی رہی۔

پھر بڑی آہستگی سے زرکیشے نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ نوید نے آنکھیں کھول دیں۔ زرکیشے کی بڑی بڑی حسین آنکھوں میں جھانک کر مسکرایا۔ زرکیشے نے اپنا سرخ ہوتا چہرہ جھکا لیا۔ وہ ہولے ہولے مسکرا رہی تھی۔

"اب تو ناراض نہیں ہونا۔" نوید نے سرگوشی کی۔ وہ کچھ نہ سمجھی لیکن جواب میں پھول کی طرح کھل اٹھی۔

ناراضگی دور ہو چکی تھی۔ الفاظ کے سہارے کی ضرورت نہ تھی۔

تین ہفتے پَر لگا کر گزر گئے۔ نوید کی واپسی کا وقت آن پہنچا۔ ڈیوٹی اس سے زیادہ نہ بڑھائی جا سکتی تھی۔

اس کا جی یہاں سے جانے کو نہ چاہ رہا تھا۔ لیکن مجبوری تھی۔ اس دن شام ڈھلے وہ کام سے واپس آیا تو اپنی بکھری چیزیں سمیٹنے لگا۔ صبح صبح اسے یہاں سے چلے جانا تھا۔ وہ کھونٹی سے اپنے کپڑے اتار کر تہہ کر کے بکس میں رکھ رہا تھا کہ زرکیشے چائے لے کر آ گئی۔

نوید کو سامان سمیٹتے دیکھا تو بے طرح گھبرا گئی۔

"کیوں — کہاں جا رہے ہو؟" اس نے چائے میز پر رکھ کر بے تابی سے پوچھا۔

نوید نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ زرکیشے کا سوال اس کے جانے کے متعلق ہی ہو گا۔

زرکیشے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ حسین آنکھوں میں سپنے ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئے۔ ملن کی گھڑیاں اتنی مدھر تھیں کہ بچھڑنے کا اسے خیال ہی نہ آیا تھا۔

وہ بیتاب ہو گئی' بے اختیار ہو گئی۔ آگے بڑھی اور سوٹ کیس پرے دھکیل کر طے شدہ کپڑے باہر نکال دیئے۔

وہ تیزی سے باتیں کرتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی۔

"زرکیشے۔" نوید اس کے والہانہ اظہار سے بے چین ہو گیا۔ اس نے زرکیشے کو بازو سے تھام لیا۔

زرکیشے سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے کچھ کہے جا رہی تھی۔ وہ نوید کے جانے کی خبر سن کر حواس باختہ سی ہو گئی تھی۔

نوید کا دل بھی بے طرح دکھ رہا تھا۔ اس وقت اسے زرکیشے کی بولی نہ جاننے کا بے حد دکھ ہوا۔ وہ اس کی زبان جانتا ہوتا یا زرکیشے اُردو سے آشنا ہوتی تو وہ اسے کتنی تسلی دے سکتا تھا۔ کیسی ڈھارس بندھا سکتا تھا۔

"زرکیشے۔" نوید نے بوجھل آواز میں کہا۔

زرکیشے کی آنکھوں میں پہاڑوں کی سرمئی دھند اتر رہی تھی۔

"نہ رو زرکیشے نہ رو۔" نوید نے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اس کا حسین چہرہ بھر لیا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے لڑھک ہی گئے۔

اپنا چہرہ چھڑا کر وہ بے بسی سے نوید کو تکنے لگی۔ اس وقت اسے بھی شاید یہی دکھ

تھا کہ وہ نوید کی بولی نہیں جانتی تھی۔

وہ آنسو چادر کے کنارے سے پونچھتی رہی اور وہ دل گرفتہ سا اپنا سامان باندھتا رہا۔

"پھر کب آؤ گے نویدے؟" زرکیشے نے رندھی آواز میں کہا۔

نوید اس کی بات کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ خود ہی بڑبڑایا۔ "تم میری زندگی کی اک حسین یاد رہو گی زرکیشے۔"

دونوں ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے تھے۔ سمجھ دونوں ہی نہ رہے تھے۔ لیکن دکھ اور کرب کے جذبوں سے دونوں ہی نپٹ رہے تھے۔

بچھڑنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ دونوں ہی یہ بات شدت سے محسوس کر رہے تھے — اس رات نوید اور زرکیشے کافی دیر تک اکٹھے رہے۔ کبھی وہ باہر چاندنی کے غبار میں ریلنگ پر جھک کر سیاہ پہاڑوں کو تکنے لگتے جو چاندنی میں کچھ اور سیاہ ہو کر ہیبت ناک لگتے تھے۔

کبھی صحن میں چاندنی کے نور میں ڈوبے ایک دوسرے کو تکنے لگتے۔ کبھی ایک دوسرے کی سمجھ میں نہ آنے والے اپنی اپنی زبان کے الفاظ بکھیرنے لگتے۔ رات کا دل تھم تھم جاتا تھا۔ اداسی چارسُو پھیلتی جا رہی تھی۔ نوید نے گھڑی دیکھی دو بج رہے تھے۔

"اب سو جاؤ جا کر۔" نوید نے اشارے سے زرکیشے سے کہا۔ اس نے اک تڑپتی نگاہ نوید پر ڈالی۔ آنکھیں دھندلائیں' آنسو چھپانے کے لیے وہ تیزی سے اپنی کوٹھڑی کی طرف بھاگ گئی۔

صبح فہیم گل جیپ لے کر آ گیا۔ دونوں نے مل کر سامان جیپ میں رکھا۔

"چائے پیو گے فہیم گل؟" خان بابا نے پوچھا۔

"صاحب نے ناشتہ کر لیا؟" وہ بولا۔

"ہاں!"

"تو پھر ایک پیالی چائے پلا ہی دو۔" فہیم گل بولا — پھر نوید کی طرف دیکھ کر بولا — "اجازت ہے صاحب؟"

نوید نے سر اثبات میں ہلا دیا۔ خان بابا فہیم گل کو لے کر باورچی خانے میں چلا گیا۔

نوید کمرے میں آ گیا۔ کہیں کوئی چیز نہ رہ گئی ہو۔ یہی دیکھنے آیا تھا۔ کمرے میں

زرکیشے کھڑی بڑی بے چارگی سے اور بے بسی سے اسے دیکھ رہی تھی۔
"زرکیشے۔" نوید نے اس پر اداس نگاہ ڈالی۔ پھر اپنا ہاتھ بڑھا کر پھیلا دیا۔
زرکیشے نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا—— پھر—— اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ نوید نے کمال احترام اور محبت سے اس کا ہاتھ تھاما۔ آہستہ آہستہ جھکا اور اس کے ہاتھ کی پشت پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ محبت کی یہی مہر وہ لگا سکتا تھا۔ یہی نشانی وہ دے سکتا تھا۔
زرکیشے نے مزاحمت نہ کی۔
نوید نے آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔
خداحافظ کہہ کر وہ مڑا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔
جب وہ جیپ میں بیٹھ گیا تو خان بابا نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ خان بابا کی پشت پر زرکیشے آن کھڑی ہوئی تھی۔ نوید کی نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔ اور جب گاڑی چل پڑی تو نوید نے بابا کے سلام کا جواب دیتے ہوئے زرکیشے کو دیکھا۔
زرکیشے نے اپنا وہی ہاتھ اٹھایا جس پر نوید نے لب رکھے تھے۔ اس کا سر جھکا اور اس نے اسی جگہ اپنے ہونٹ رکھ دیے جہاں نوید نے عقیدت واحترام سے بوسہ دیا تھا۔ دو آنسو بھی لڑھک کر ہتھیلی کی پشت پر آن گرے۔
نوید کے سینے میں درد کی لہر اٹھی۔ اس نے جلدی سے رُخ پھیر لیا۔
جیپ اپنے راستے پر تیزی سے جا رہی تھی۔ فہیم گل موسم اور یہاں کے حُسن کی باتیں کرتے ہوئے نوید سے پوچھ رہا تھا۔ "پسند آئی بھی جگہ صاحب؟"
لیکن
نوید تو اپنے آپ میں گم تھا
وہ
اس کہانی کے متعلق سوچ رہا تھا۔
جو—— اَن کہی تھی—— اور جس نے آنکھوں میں جنم لیا تھا۔ آنکھوں میں پھلی پھولی تھی اور آنکھوں ہی میں ڈوب گئی تھی——

◆◆◆◆◆◆◆◆